جنگِ آزادی کے اردو شعرا

(۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)

از

سید شاہ محمود الرحمٰن

زیر نگرانی

جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب
ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

یہ تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کیلئے شعبہ اردو، جامعہ سندھ میں
پیش کیا گیا۔
ستمبر ۱۹۷۹ء

ترتیب

حرفِ آغاز

شاعری کے متعلق محض یہ کہہ دینا کہ وہ انسان کی داخلی زندگی کی ترجمان ہوتی ہے، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ ضرور ہے کہ صنفِ سخن دلی جذبے، واردات قلبی اور کرب ذہنی کی آئینہ دار ہے اور رازہائے دروں کی کسی حال میں بھی پردہ پوشی نہیں کرتی ــــ بایں ہمہ اس کا دائرہ کار بہت وسیع و عریض ہوتا ہے۔ شاعری صحیح معنوں میں معاشرے اور ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ عام اور مروّجہ حالات و کوائف کو احاطۂ نور میں لے آنا اس کا اہم فریضہ ہے۔ خارجی اثرات و عوامل پر اس کی گرفت بے حد مضبوط ہوتی ہے۔ وقت کی دھڑکن، زمانے کی رفتار، سیاسی کیفیت اور معاشی و معاشرتی روایت شاعری کے سانچے میں ہمیشہ کے لئے ڈھل جاتی ہے۔ گویا دبستانِ شاعری ایک ایسے البم کی مانند ہے جس میں مختلف دور کی تصویریں لگی ہوتی ہیں جو زندگی کے پوشیدہ حالات و کیفیات پر سے پردے اٹھاتی چلی جاتی ہیں۔

اردو شاعری بھی برعظیم پاک و ہند کے ماحول اور معاشرے کی آئینہ دار رہی ہے۔ شاعروں نے اپنی آنکھوں سے جس تہذیبی، سماجی، ثقافتی، سیاسی اور تمدنی حالت و کیفیت کا مشاہدہ کیا، اسے بلا کم و کاست اشعار کے قالب میں ہمیشہ کے لئے سمو دیا۔ اردو ادب کی تاریخ اس حقیقت کو بخوبی واضح کر رہی ہے کہ ہر شاعر اپنے وقت کا ایک مورّخ ہے۔ اس نے خارجی اثرات و عوامل کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا کلام ملک کی تاریخی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ غرض ادبی اہمیت کی طرح اردو شاعری کی تاریخی و سیاسی عظمت بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب اور اس کے ہمہ گیر اثرات نہ صرف برعظیم کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں بلکہ شعر و ادب کا بھی خاص موضوع رہے ہیں۔ عام مورّخوں کی طرح شعرا کی نگاہوں نے بھی یہ منظر دیکھا کہ "سات سمندر پار" سے آئے ہوئے فرنگی تاجر اپنی حکمتِ عملی اور جوڑ توڑ کی بدولت اس ملک پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی فتح و کامرانی کے بعد مغلیہ سلطنت کی بساط اجڑ گئی۔ اسلامی جاہ و ثروت کا چراغ گل ہو گیا۔ قدیم تہذیب و روایات پر بیرونی کلچر اور تعلیم اثرانداز ہونے لگی۔ ملک کے عوام پا بجولاں کر دیے گئے اور غلامی کا طوق ان کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ انہیں ظلم و جور کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ ان کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ان کی خوشیوں کے سامان لوٹ لئے گئے۔ اپنے ہی وطن اور اپنے ہی گھروں میں وہ آزادی سے محروم کر دیے گئے۔

شاعروں نے اس جاں گسل اور پر آشوب وقت میں اپنے فکروفن کو گل وبلبل کے روایتی موضوع تک ہی محدود نہیں رکھا۔ ان کی چشم وا نے برعظیم پاک وہند کی تباہی وبربادی کا جو مشاہدہ کیا تھا، اسلامی سلطنت کے شیرازے کو جس طرح بکھرتے دیکھا تھا اور انگریزوں کے ظلم وستم کی جو یورش ویلغار دیکھی تھی ـــــ ان تمام تلخ حقائق سے وہ کبیدہ خاطر ہوئے تھے۔ ان کا قلب وذہن جھنجھنا اٹھا تھا۔ انہوں نے اہلِ وطن کی بے سروسامانی، بربادی وویرانی اور اضمحلال وافسردگی کا جیتا جاگتا مرقع پیش کرکے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ ماحول ومعاشرے سے الگ اپنا وجود نہیں رکھتے تھے۔

اور جب ملک کے طول وعرض میں سیاسی شعور بیدار ہوا، ملک کو آزاد کرانے کی جد وجہد شروع ہوئی اور انگریزوں سے براہ راست تصادم عمل میں آیا ـــــ تو حسن وعشق کے راگ الاپنے والے یہی شعرا آزادی کی جنگ میں شریک ہوگئے۔ یہ صاحبِ قلم اپنے اشعار سے وہ کام کرگئے جو صاحبِ سیف اپنی تیغ جوہردار سے میدانِ جنگ میں اور صاحب تدبّر اپنے قول وعمل کے ذریعے سیاسی لحاظ پر سرانجام دیتے رہے ہیں۔

اردو شاعری کی یہی وہ مخفی خصوصیات تھیں جنہیں ذہن میں رکھ کر میں نے زیر نظر مقالے کا خاکہ تیار کیا جو پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں برعظیم پاک وہند کا ایک سرسری جائزہ پیش

کیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے ضروری تھا کہ فن تاریخ کے نقطۂ نظر سے کسی بھی
جنگ کا تعلق کسی نہ کسی مقام سے ہونا لازمی ہے۔ چونکہ آزادی کی یہ
جنگ اسی خطے میں وقوع پذیر ہوئی تھی لہٰذا اس کا تعارف پیش
کرتے ہوئے یہاں کی ان عظمتوں اور سربلندیوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو
بیرونی اقوام کی کشش کا سبب بنیں۔

تاریخ کا فن یہ بھی باور کراتا ہے کہ جنگ کے لئے فریق ثانی
کا وجود ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر تصورِ جدال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ چونکہ
مذکورہ جنگ کا تمام تر تعلق فرنگیوں سے تھا لہٰذا دوسرے باب میں
ذرا تفصیل سے اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ برعظیم میں ان کی آمد
کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اور انہوں نے کس کس طرح اور کن ذرائع
کا سہارا لے کر یہاں اپنے قدم جمانے کی کوششیں کیں۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب کسی قوم کے قدم
دیارِ غیر میں جم گئے ہیں تو حکومت و اقتدار کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے
لگا ہے۔ ایسی ہی صورت انگریزوں کے ساتھ بھی پیش آئی۔ زیرِ سایۂ
مغل قائم ہونے والی ایسٹ انڈیا کمپنی جو سراسر ایک تجارتی کمپنی
تھی، کن کن منزلوں سے گزرتی ہوئی "کمپنی بہادر" کے عہدے پر فائز
ہوئی، ان سارے عوامل کا احاطہ تیسرے باب میں کیا گیا ہے۔ واضح
رہے کہ کمپنی بہادر کی اگلی منزل سلطنتِ برطانیہ کا کلی وحتمی قیام تھا۔
انگریزوں کے تعلق سے پاک وہند کی تاریخ کے اس جائزے

کے بعد چوتھے باب میں ان انقلابی رجحانات کو دائرۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد اردو شاعری میں اظہار کا ذریعہ بنے۔ ملکی زوال وانحطاط کے آثار درحقیقت ۱۷۰۷ء سے ہی نمایاں ہوگئے تھے۔ نظامِ سلطنت کے انتشار و پراگندگی کی تان اودھ کے زوال اور واحد علی شاہ کے عزل (۱۸۵۶ء) پر ہی ٹوٹی تھی۔ سیاسی وسماجی کرب و الم کے اس طویل دور میں اردو شاعری نے ایرانی روایات کے زیرِ اثر حسن و عشق کی مدح خوانی تو ضرور کی ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو ماحول اور معاشرے کی دبی دبی سی، چھپی چھپی سی جھلک بھی دکھاتی رہی ہے۔ انہی بکھری ہوئی جھلکیوں کو اس باب میں نور کا ہالہ بنا کر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ جواز پیدا ہوسکے کہ ایک ہی سال بعد ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے نتیجے میں صنفِ سخن میں جو تغیر رونما ہوا، وہ اتفاقی اور حادثاتی نہ تھا بلکہ اس نوع کی شاعری کی بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی اور اس انقلاب کے موقع پر یہ اچانک خلا میں نہیں ابھری تھی۔

اردو شاعری کے اس انقلابی رجحان کو مزید رنگ و آہنگ عطا کرنے میں سید احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد کو خاصا دخل رہا تھا۔ پورے برعظیم میں سید علیہ رحمتہ کی آواز نے جو جوش و خروش اور حوصلہ و عزم پیدا کردیا تھا، اس سے ہمارے شعرا بھی دامن نہیں رہے تھے انہوں نے بھی اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور ایسی نظمیں لکھی تھیں جن کی بدولت ملّتِ اسلامیہ میں جدّوجہد کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ تاریخ

شاہد ہے کہ یہی تحریکِ جہاد ستّاون کے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اردو شاعری کو عزم و عمل جیسے موضوعات سے قریب کرنے میں بے حد فعّال رہی۔ پانچویں باب میں اسی تحریک کے تحت لکھی جانے والی جہادیہ نظموں کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالے کا چھٹا باب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں نمایاں ہونے والی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ یہ دَور کھُل کر یہ وضاحت کر رہا ہے کہ اردو شاعری ماحول و معاشرے سے الگ کوئی جامد شئے نہیں رہی ہے جس پر خارجی اثرات کا عکس نہ پڑا ہو، بلکہ اس نے گرد و نواح میں وقوع پذیر ہونے والی شکست و ریخت کی دردناک داستان کو اپنا موضوع بنا کر تاریخ ساز کام کیا ہے۔ ایسا کام کہ اس دور کی جملہ تواریخ نایاب بھی ہو جائیں تو اردو شعرا کا کلام ہر واقعہ اور ہر سانحہ کی تفصیل دہراتا رہے گا۔

سن ستّاون کے ناکام انقلاب کے بعد برِ عظیم میں جہاں اہلِ برطانیہ کو کامل اقتدار و عروج حاصل ہو گیا تھا، وہاں عوام پر حزن و یاس کے احساسات غالب آ گئے تھے۔ انگریزوں کے جورِ مسلسل سے وہ اس درجہ گھائل ہو گئے تھے کہ از سرِ نو اٹھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ ان میں نہیں رہا تھا۔ یہی وہ وقت تھا کہ سر سید جیسی شخصیت رونما ہوئی۔ اس بطلِ جلیل نے تعلیمی تحریک سے جہاں ایک طرف ملّتِ اسلامیہ میں علم و عمل کی نئی روح پھونکی تھی، وہاں ادبی تحریک کے ذریعے دنیائے شاعری میں ایک انقلاب بھی رونما کر دیا تھا۔ اسی انقلاب نے شاعروں کو

اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ قومی وملّی شاعری کی طرف ہمہ تن مصروف ہوجائیں۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی اور بیسویں صدی میں ابھرنے والی سیاسی تحریک کے درمیان کی یہ عبوری دور کی شاعری بڑی قدر و اہمیت کی حامل ہے۔ اس نے مایوس و مضمحل قوم میں سعی وعمل کی جو لہر دوڑادی تھی وہ مستقبل میں جد وجہد آزادی کے لئے مہمیز ثابت ہوئی۔ لہٰذا اس نوع کی شاعری کا مطالعہ موضوع کتاب سے خارج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ساتویں باب میں اسی کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

سرسید کی تعلیمی تحریک کا ردِّ عمل بھی منطقی تھا۔ اور یہ اکبر الہ آبادی کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ وہ ساری عمر قوم کے غم میں سسکتے رہے۔ مغرب سے آئے ہوئے سیلابِ بلا کو دیکھ کر وہ پیچ وتاب کھاتے تھے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ کس طرح فرنگی قوم کے قدم سے سرزمینِ وطن کو پاک کریں۔ لیکن ایسا کرنا تنہا ان کے بس کا کام نہ تھا، اور اس لئے بھی غیر ممکن تھا کہ وہ سرکاری ملازم تھے۔ پھر بھی، اس فریضے کی انجام دہی کے لئے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا اور قوم کو ذہنی طور پر بیدار کرنا شروع کردیا۔ وہ ہمیشہ مغربی تہذیب وتمدن کے مذموم اثرات سے قوم کو محفوظ رکھنے کی جدّو جہد کرتے رہے۔ اکبر نے مغرب سے آئے ہوئے طوفان کے مدِّ مقابل جو مضبوط بند باندھا تھا، اس نے اہلِ وطن کو بیرونی رو میں بہہ جانے سے بروقت بچا لیا اور ان کے دل میں "خود اعتمادی" کا ایک ایسا احساس پیدا کیا جو راہِ آزادی میں سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارے موضوع کے طویل سفر میں

راستے کے اس سنگِ میل کو اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس سے سرسید تحریک پر زد پڑتی ہے۔ مورخ و محقق کا کام ہی تصویر کے ہر دو رخ کو واضح کرنا ہے۔ چنانچہ تعصّب و تنگ نظری کی عینک استعمال کئے بغیر ردّ عمل کی اس تحریک کو آٹھویں باب میں پیش کر دیا گیا ہے۔

فرنگی حکمراں ساکنانِ پاک و ہند کے جسم و جاں کو پابجولاں تو کر گئے، ان کی روح کو بیڑیاں نہ پہنا سکے۔ ان کے احساس کی شدت کو گرفت میں نہ لا سکے۔ ان کے شعور و ادراک کی قلمرو پر حکومت قائم نہ کر سکے ـــــ اور ایک دن برعظیم کے یہی عوام روح کی تڑپ، احساس کی شدّت اور شعور و ادراک کی وسعت کے سہارے آگے بڑھے اور اپنے وطن سے انگریزوں کو دلیس نکالا دینے کے لئے ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ غلامی کی آہنی زنجیر توڑنے کا عزم پیدا ہو گیا۔ اپنے گلستاں کو خونی پنجوں سے نجات دلانے کی جدّ و جہد شروع کر دی گئی۔ اپنے ہم وطنوں کی طرح شعرائے اردو بھی ملک و قوم کو آزاد کرانے کے لئے اسی لگن، اسی جذبے اور اسی عزم کے ساتھ آگے بڑھے۔ سیاسی شعور کے احیاء کے اس دور میں انہوں نے ایسی نظمیں لکھیں جن میں آزادی کی تڑپ بخوبی عیاں ہے۔ نویں باب میں اسی قسم کی منظومات زیر بحث آئی ہیں۔

جدّ و جہدِ آزادی کی تاریخ میں خلافت تحریک ایک زرّیں باب کا درجہ رکھتی ہے۔ گرچہ اس کا تعلق مملکتِ ترکیہ کی تاراجی و بربادی سے تھا، لیکن اس کی بدولت عوام کے سیاسی شعور کو فروغ حاصل ہوا۔

قوم میں برطانوی حکومت کے خلاف منظم طور پر صف آرا ہونے کا جذبہ بیدار ہوا۔ اس تحریک کے زیرِ اثر منظرِ عام پر آنے والی شاعری سے احساسِ حرّیت کے ان گنت چراغ روشن ہو گئے جن کی روشنی میں غلامی کی تاریکیاں تیزی سے چھٹتی نظر آنے لگیں اور آنے والے دور کے شاعروں کو خاص تاب و توانائی ملی۔ تاریخ کے اس انقلابی دور کو دسویں باب میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کے خلاف جو محاذ قائم کیا گیا تھا، اس پر برِعظیم کے عوام نہایت عزم و حوصلے کے ساتھ ڈٹے رہے۔ انہوں نے برطانوی حکام کے ہر جور و ستم کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور آزادی کے حصول کے لئے سدا سرگرمِ عمل رہے۔ تحریکِ آزادی کے اس ارتقائی دور (۱۹۲۵ء تا ۱۹۴۷ء) میں شعرائے اردو بھی قوم کے دوش بدوش دشمنوں سے معرکہ آرا ہوئے۔ انہوں نے اپنی جوشیلی اور ولولہ انگیز نظموں کے ذریعے سیاسی میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ رجز کا درجہ رکھتی ہیں۔ گیارہواں باب ایسی ہی رجزیہ شاعری کے مطالعہ کے لئے وقف ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اشتراکی نظریے پر مشتمل ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ گرچہ اس کا مطمحِ نظر ملک سے غربت و افلاس اور استبداد و آمریت کو ختم کرنا تھا، لیکن ان مقاصد کے حصول کے لئے یہ گروہ برطانوی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی

ضروری سمجھتا تھا۔ اس طرح یہ "سرخ جماعت" مجاہدینِ آزادی کے گروہ میں شامل ہوکر انگریزوں سے براہ راست مقابلے پر اتر آئی تھی۔ اس نظریے کے علمبردار شعرا نے اپنے پرجوش نغموں سے عوام کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی ہے۔ انہیں ظلم و استبداد کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ آفتابِ حریت کے طلوع ہونے کا مژدہ سنایا ہے۔ یہ ترقی پسند شعرا جنگِ آزادی میں سپاہی کی حیثیت سے شریک رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام سے انقلاب کی رفتار کو تیز تر کیا ہے۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان کے فکروفن سے ہمارے موضوع کو خاصی وسعت ملی ہے۔ یہ وسعت اس امر کی متقاضی تھی کہ ایسے ترقی پسند شاعروں کو بارہویں باب میں سب سے الگ جگہ دی جائے۔

تیرہواں باب تحریکِ پاکستان کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں پہلے تو مختصراً یہ بتایا گیا ہے کہ حصولِ پاکستان کا نظریہ کن وجوہ کی بنا پر عمل میں آیا۔ پھر اس سات سالہ دور (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء) میں پاکستان، مسلم لیگ اور قائدِاعظم جیسے تین اہم موضوعات پر شعرا اپنے دلی جذبات کا جس طرح اظہار کرتے رہے ہیں، اسے دائرہ نور میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کے مطالعے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ پاکستان کے نظریے کو فروغ دینے میں شعرائے اردو کا حصہ کسی سے کم نہیں۔ انہوں نے پاکستان کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کرکے، اسے حاصل کرنے کے عزم کو دہرا کر، مسلم لیگ کے ترانے

گا کر اور قائدِ اعظم کی قیادت پر کامل بھروسے کا اظہار کر کے پوری ملّت اسلامیہ کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کی ہے۔ بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اس نوع کی نظمیں لکھنے والے شعرا کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے، مگر میں نے چند ہی سخنوروں کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے کہ مقصد زیرِ بحث دور کی شاعری کا ایک نمونہ پیش کرنا تھا۔

آزادی کی طویل جدّوجہد عوام کا بےکراں جوش و خروش اور سیاسی قائدین کا عزمِ مسلسل رائگاں نہیں گیا۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں۔ زنداں کی دیواریں ترخ گئیں۔ حرّیت پسندوں کے فلک شگاف نعروں سے اجنبی حکمرانوں کے دل لرز اٹھے۔ اور بالآخر استبداد و بربریت کا بت سرنگوں ہو گیا۔ بیرونی آقاؤں کے تاج و تخت زمیں بوس ہو گئے۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کی صبحِ آزادی کا آفتاب نہایت آن بان کے ساتھ طلوع ہو گیا۔ یہ لمحۂ جاں فزا شاعروں کے لئے ایک نیا موضوع لے کر وارد ہوا۔ انہوں نے طربیہ نغمے لکھ کر اس صبحِ آزادی کا استقبال کیا جس کے حصول کے لئے وہ اہلِ وطن کے شانہ بشانہ ایک صدی سے معرکہ آرا رہے تھے۔ آخری باب میں انہی طرب خیز اور روح پرور نغموں کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ جب یہ موضوع منظور ہوا تھا، اس وقت وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تحقیق کے کن کن خارزاروں سے گزرنا پڑے گا۔ اوقات

ایسے دشوار گزار مقام آتے کہ ہمت جواب دے جاتی اور قلم ساتھ چھوڑ بیٹھتا۔ لیکن یہ اپنی خوش نصیبی تھی کہ قبلہ استاذی جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں مدظلہ جیسی مشفق و مہربان شخصیت قدم قدم پر اس طرح رہبری کرتی رہی کہ راہ کے کانٹوں سے دامن تار تار ہوئے بغیر منزلِ مقصود تک رسائی ممکن ہو گئی۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی بے محل نہ ہوگا کہ چند سال قبل جب قبلہ محترم کی نگرانی میں اسی جامعہ سے ایم اے کے لئے "اردو میں بچوں کا ادب" پر کام شروع کیا تھا تو سانس اسی طرح پھول گیا تھا اور ساری توانائی بجنسہٖ جواب دے گئی تھی۔ لیکن یہ اپنے محسن کی نظرِ کرم تھی کہ مقالہ نہ صرف مکمل ہوا' بلکہ شائع ہونے کے بعد برِ عظیم پاک و ہند میں اپنی نوعیت کا پہلا کام قرار پایا۔ اور جب زیرِ نظر مقالہ تحریر کرنے کے دوران فرینکفرٹ (جرمنی) سے یہ خبر آئی کہ درج بالا تصنیف جرمن انسائیکلوپیڈیا میں شائع کی گئی ہے تو ممنونیت کی نظر استاذی المحترم کے قدموں پر مرکوز ہو گئی۔

آج ڈاکٹریٹ کے اس مقالے کی تکمیل پر میری ممنونیت بھری نظر اپنے مشفق و محترم استاد کے کفشِ پا کو چوم رہی ہے اور زبان پر اقبال کا یہ شعر جاری ہے ؎

جو کو کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند

۱۵ر جون ۱۹۷۹ء

محمود الرحمٰن

پہلا باب

برِ عظیم پاک و ہند سرسری جائزہ

برعظیم پاک و ہند کا خطۂ حسین و جمیل ہزاروں سال پہلے سے بیرونی دنیا کے لئے باعثِ کشش رہا ہے۔ اس کا وسیع رقبہ اس کی زرخیز زمین، اس کے سر بفلک کوہسار، اس کی دلنشیں وادیاں، اس کی سبک خرام ندیاں، اس کے سرسبز و شاداب میدان، اس کے ہرے بھرے لہلہاتے کھیت، اس کے پرکیف و پرفضا باغات، اس کے معدنی وسائل، اس کے خیرہ کن زر و جواہر اور اس کے مرصع قلعے و محلات غیر ملکیوں کو مسلسل مدہوش کرتے رہے ہیں۔ اس جنت ارضی کے حصول کے لئے اقوام عالم ہمیشہ سے مشتاق و مضطرب رہی ہیں۔ کوہ ہمالہ و ہندوکش کی مضبوط و سربلند دیواروں اور بحور عرب و ہند کی سفاک موجوں کے حصار کو توڑ کر اس علاقے میں درآنے والوں کا سلسلہ خاصا دراز ہے۔ بقول فرانسیسی مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان:

> "اس ملک کی بے نظیر زرخیزی کی بدولت باوجود
> بہت سے موانع کے اقوام عالم نے کئی ہزار سال
> کے اندر اس پر بیس مرتبہ دھاوا کیا۔"[1]

اس وسیع و عریض خطۂ ارضی کا تذکرہ ساڑھے چار سو قبل مسیح کے نامور یونانی مورخ ہیروڈوٹس[2] نے کچھ اس طرح کیا تھا:

"یہ خطہ سلطنتِ فارس کے زیر اثر تھا۔ ہم جن

---

[1] بان، ڈاکٹر گستاؤلی: تمدن ہند، مترجم بلگرامی سید علی، ص ۲

[2] Herodotus

اقوام سے واقف ہیں ان سے کہیں زیادہ تعداد
میں لوگ یہاں آباد تھے جو دوسرے تمام علاقوں کی
نسبت سب سے زیادہ خراج فارس کو دیا کرتے
تھے۔ یہ تین سو ساٹھ طلائی ٹیلنٹ[1] پر مشتمل تھا۔[2]

ہیروڈوٹس جو "بابائے تاریخ کہلاتا ہے اور جس کے بیانات حقائق
پر مبنی ہوتے ہیں"[3] کے درج بالا قول سے سکندر اعظم یقیناً واقف رہا ہوگا
اور اس کا منشا سونے کے ان ذخائر کو اپنی دسترس میں لانا مقصود تھا
یا محض حملہ و یلغار پیش نظر تھی ـــــ مگر یہ حقیقت ہے کہ "سکندر کی
فتح مندیوں نے پہلی مرتبہ مشرق کی دولت کو مغرب کے قدموں میں ڈال
دیا۔"[4]

دولت و ثروت کی یہ سرزمین کوہ و بحر کے جھنڈ میں مخفی نہ رہ
سکی اور اس کی دلآویز مٹی کی خوشبو بوئے نافہ کی مانند سواد عالم میں
پھیلتی چلی گئی۔ کہیں یونانی سفیر مگاستھنیز نے "انڈکا" میں شاہی محلات
کا روپہلا منظر پیش کرکے اہل عالم کی نگاہوں کو یوں خیرہ کیا تھا:

"محل ایسے بے شمار سنہرے ستونوں سے آراستہ
ہیں جن پر سونے کے بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں۔"[5]

۱؎ Talent: ایک قدیم سکّہ
۲؎ قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین (جنرل ایڈیٹر): A Short History of Pakistan، جلد اول، ص ۸۵
۳؎ وینج ڈبلو این: History of the World، ص ۱۲۸
۴؎ ایضاً
۵؎ قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین: ایضاً، ص ۱۰۵

توکہیں اسی یونان کے ایک اور مورخ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب[۱] میں اس خطّے کے معدنی وسائل کا تذکرہ کرکے بیرونی اقوام کو اس طرح سیر و سفر کی دعوت دی :

> "یہاں کے ترقی یافتہ بحری مراکز سے موتی ' ہیرے ' نیلم ' زمرد اور دوسرے بیش قیمت پتھر ' سیاہ مرچ اور انواع و اقسام کے مسالے ' دوائیں اور مرہم اور شیشے کی طرح صاف شفاف پارچہ جات برآمد کیے جاتے ہیں"[۲]

حتّٰی کہ بودھ مذہب کے سادہ رو بھکشوؤں کے دیدہ و دل بھی اس جنت ارضی کے حسن و جمال ' جاہ و حشم اور مال و منال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے اس کی بے پایاں نعمتوں کے تذکرے اپنے سفرناموں میں جا بجا کیے ۔ ہیون سانگ نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ "طلائی ' نقرئی اور کانسی کے بنے ہوئے مختلف وضع کے لاتعداد سکّے حکومت کے فروغ و ارتقا کی شہادت دیتے ہیں"۔[۳] دوسرا چینی یاتری سنگ یون جب اس دیس کے آب شیریں ' رسیلے پھل ' چڑیوں کی چہکار اور دیگر فطری مناظر کا ذکر چھیڑتا ہے تو اس کا انداز بیان تمام تر

---

[۱] Periplus of the Erythream Sea

[۲] بحوالہ واٹسن ' فرانسس : A Concise History of India ' ص ۱۷

[۳] بحوالہ قریشی ' ڈاکٹر اشتیاق حسین : A Short History of Pakistan ' ص ۱۵۱

شاعرانہ ہوتا ہے[۱]۔ فاہیان جس کا مطمح نظر صرف مذہب رہا تھا، حسین و دلکش قصر والیاں کو دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ "کیا یہ انسانی ہاتھ کا کرشمہ ہے۔"[۲]

مورخوں کے بیانات اور سیاحوں کی حکایات اس خطۂ رامش و رنگ کو شہرتِ دوام عطا کرتی رہیں۔ اس گلشنِ سرسبز کی نکہتیں تحریر و قول کے سہارے دور دور پھیلتی چلی گئیں۔ اس مخزنِ زر و جواہر کی روشنی کاروان در کاروان خیبر و بولان سے پرے سفر کرتی رہی۔ نکہت و نور کے اس سیل بلا خیز نے حملہ آوروں کے دلوں کو برمایا، بادشاہوں کے ذوق و جستجو کو اکسایا اور کشور کشاؤں کی طلب و آرزو کو دہکایا۔ ہر چہار جانب سے اقوامِ عالم کے پرے کے پرے اس "پراسرار سرزمین"[۳] کی جانب گامزن ہوئے۔ ان قوموں میں یونانی بھی تھے اور ترک بھی، عرب بھی تھے اور افغان بھی، ایرانی بھی تھے اور تاتاری بھی، منگول بھی تھے اور مغل بھی!۔ غزنی کے فرماں روا سلطان محمود نے برعظیم پر حملہ آور ہونے سے قبل، اس کی تعریف و توصیف کچھ اس طرح کی تھی:

> "سارا ملکِ ہند سونے اور جواہرات سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں ایسے نباتات پائے جاتے ہیں جو

---

[۱] قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین (جنرل ایڈیٹر): A Short History of Pakistan، جلد اول، ص ۱۶۳

[۲] بحوالہ بورڈ، پاکستان ہسٹری: A Short History of Hind - Pakistan، ص ۷۰

[۳] بان، ڈاکٹر گستاؤلی: تمدنِ ہند، مترجم بلگرامی سید علی، ص ۲

ملبوسات بنانے کے لئے نہایت موزوں ہیں۔
خوشبودار پودے اور گنّے بھی ہوتے ہیں۔ ملک
کی ظاہری ہیئت بہت ہی عمدہ اور دلپذیر ہے۔"[1]

گلشنِ پاک و ہند کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے مغلیہ حکومت کے بانی ظہیر الدین بابر کو برسوں سے اسے اپنے قبضے میں کرنے کی ہوس تھی[2]۔ اور جب وہ دلّی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس ملک کے متعلق یوں رطب اللساں ہوتا ہے:

"ہندوستان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وسیع ملک
ہے۔ اس میں سونا چاندی بہت ہے"۔[3]

اسی مغلیہ خاندان کے پانچویں حکمران شہاب الدین محمد شاہ جہاں کے زمانے میں جب شان دار و خوبصورت عمارات کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا اور نقرئی چھتوں اور قیمتی پتھروں سے مرصع دیوان خاص بن کر تیار ہوا تو اس کی دیواروں پر سعد اللہ خان کا یہ شعر کندہ ہے جو جملہ بیرونی اقوام کے خیالات و محسوسات کی ترجمانی کر رہا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است[4]

---

[1] بحوالہ والٹن نرانس: A Concise History of India، ص ۸۸
[2] بابر ظہیر الدین: تزکِ بابری، ترجمہ: حیدر میرزا نصیر الدین، ص ۳۱۹
[3] ایضاً، ص ۳۴۳
[4] ہاشمی انوار: تاریخ پاک و ہند، ص: ۳۶۰

سرزمین پاک و ہند کو معدنِ لعل و گوہر اور خطۂ فردوس بریں
قرار دینے والے یہ نو وارد ایک فاتح قوم کی حیثیت سے یہاں آئے تھے۔ تیرو
تفنگ اور شمشیر و سناں سے لیس یہ لوگ دن کے اجالے میں طبلِ جنگ
بجاتے اور رجز پڑھتے ہوئے پہنچے تھے۔ ان کے لبوں پر للکار تھی اور ہاتھوں
میں منہ زور گھوڑوں کی لگامیں! اُس دور کے مروجہ اصول کو پیشِ نظر
رکھتے ہوئے ان ترک و تاتار، یونانی و عرب، ایرانی و افغان اور منگول و مغل
شہ سواروں نے اپنے اپنے وقت کے مقامی حکمرانوں کو باقاعدہ دعوتِ رزم
دی تھی۔ دریائے جہلم کا کنارا ہو کہ دیبل کی سرزمین، پشاور کا علاقہ ہو
کہ متھرا کا مقام، ترائن کی رزم گاہ ہو کہ پانی پت کا میدانِ کارزار! —
ہر جگہ حریفوں کا آمنا سامنا ہوا، باقاعدہ معرکہ آرائی ہوئی اور فنِ حرب کا
مظاہرہ عمل میں آیا۔ برِعظیم کے حکمرانوں نے حملہ آوروں کی ہر یورش کا مردانہ
وار مقابلہ کیا۔ انہیں میدانِ جنگ میں شکست دینے کی بھرپور کوششیں
کیں۔ کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی طور پر! — یہ اور بات تھی کہ یہ حملہ
آور بہ سعیٔ بسیار کامیاب و کامراں ہوئے اور اہلِ ملک کو شکست و
ریخت نصیب ہوئی۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ یہ بیرونی حملہ
آور فتح و کامرانی کے بعد محض حملہ آور نہ رہے — اسی سرزمین کے
پیوند ہو گئے۔ اسی خطے کو اپنا مرکز و مسکن بنا لیا۔ اسی مفتوحہ علاقے کو
وطنِ مالوف تصور کر لیا۔ اسی کی ہواؤں میں رچ بس گئے۔ اسی کے
ماحول میں اپنے مزاج و مذاق کو ڈھال لیا اور یہاں کے مفتوح باشندوں
کو وہی مقام و مرتبہ عطا کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ مسز اینی بیسنٹ

کے الفاظ میں:

"اس ملک پر بارہا یورشیں ہوئی ہیں۔ لیکن ہر بار ان بیرونی حملہ آوروں نے اسی خطّے کو اپنا حرزِ جاں بنا لیا۔ وہ اسی کے فرزند بن گئے۔ انھوں نے اس کے ساتھ رشتۂ اخوت قائم کر لیا اور مقامی باشندوں کے لئے حکومت کے سارے دروازے وا کر دیئے"۔[1]

لیکن اسی سرزمین پر ایک بیرونی قوم ایسی بھی آئی جس نے جنگ و جدال اور یورش و حملے کے مصدقہ قوانین کو یکلخت نظر انداز کر دیا اور "پُرفریب سازشوں"[2] کے جال پھیلا کر جس بہیمانہ انداز میں شبخون مارا ہے، تاریخِ عالم شاید اس کی نظیر نہ پیش کر سکے۔ یہ اہلِ فرنگ "جو حقیقت میں محض تجارت کی غرض سے ہندوستان گئے تھے"[3] بہتی گنگا میں اس طرح ہاتھ دھونے بیٹھ گئے کہ اس کا صاف شفّاف پانی خود اس کے وارثوں کے خون سے گل رنگ کر دیا۔

ان فرنگی نوواردوں نے تجارت کے روپ میں جو جو مظالم ڈھائے ہیں، امن و سکون کو جس طرح تباہ و برباد کیا ہے، دولت و ثروت جس انداز سے لوٹی ہے، آزادی جس دھاندلی اور فریب کاری سے سلب کی ہے ـــــ اس کا اظہار ان ہی کی ہم قوم مسز اینی بیسنٹ[4]

---

[1] بیسنٹ، اینی: India: A Nation، ص ۱۸

[2] عزیز، اے: Discovery of Pakistan، ص ۱۷۲

[3] اسپیئر، پرسیوال: India, Pakistan and the West، ص ۷۱

نے یوں کیا ہے:

"وہ جعلی معاہدہ جس سے کلائیو نے امی چند کو دھوکہ دیا، انگریز فوج کے ذریعے روہیلوں کو ہلاک کرنے کے لئے ہیسٹنگز کا وہ شرمناک اقدام بنگال کے کمسن نواب کا دھوکے سے وہ اغوا، نند کمار کا وہ قتل، بیگمات اودھ کی وہ فاقہ کشی اور ان کے ملازموں کو دی جانے والی وہ جسمانی اذیت، وہ بیکراں مظالم اور وہ استحصال ——— یہ سب باتیں جن سے ہندوستان پہلے کبھی آشنا نہ تھا، کیا اس دہشتناک صدی کی تاریخ میں درج ہیں؟ ہم نے ان حقیقتوں کے نتائج بھی دیکھے ہیں ——— دنیا کا سب سے امیر ترین ملک غریب تر ہو گیا۔" [1]

فرنگی تاجروں نے فرینکوئس برنیر کے بقول "پاک و ہند میں بہنے والی سیم و زر کی نالی" [2] سے اپنے جیب و داماں کی جس طرح تزئین کی، اپنے قصر و ایوان کو جس طرح نکھارا اور اپنی تجوریوں کو جس طرح لبریز کر دیا، وہ مکر و فریب، دغا و حرفت اور ظلم و ناانصافی

---

[1] بیسنٹ، اینی: *India: A Nation*، ص ۱۷

[2] بحوالہ ایضاً، ص ۱۴

کی داستانِ عظیم ہے۔ ان کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر خود ان ہی کا شاعر ٹھومس کیمبل طعنہ زن ہے:

"ہند کے زرنگار خطّے کے لعل و گوہر سے مالا مال تو ہیں
لیکن مالِ غنیمت کے یہ ڈھیر ان کی اپنی مملکت کے نہیں"۔[1]

اسی برطانوی قوم نے تجارت کو ایک ڈھال بنا کر برعظیم پاک و ہند پر اپنا تسلط قائم کیا اور ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس نے نہ صرف جسموں کو پابہ زنجیر کرنے کی کوشش کی بلکہ ذہنوں کو بھی پا بجولاں کر دینے کی مہم چلائی۔ اس بیرونی قوم کا تشدّد آمیز عمل ضربِ گراں بن کر اہلِ پاک و ہند کو مسخّر تو نہ کر سکا، البتہ ان کے دل میں نفرت کی چنگاریاں روشن کرتا رہا ــــ یہی شعلۂ مستعجل ۱۸۵۷ء میں برقِ جوّالہ بن کر یوں ابھرا کہ فرنگی قصر و ایواں کے در و بام لرز اٹھے۔ گرچہ دغا و فریب اور حکمتِ عملی کی بدولت برطانوی سامراج نے اس جذبۂ حرّیت کو کچل دیا، لیکن خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری لحظہ بہ لحظہ سلگتی رہی ــــ اور پھر غیظ و غضب کی آگ بن کر اس طرح نمایاں ہوئی کہ غلامی کے طوق و سلاسل پگھل کر رہ گئے۔

اگلے باب میں ذرا تفصیل سے اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ برعظیم میں انگریزوں کا ورود کس طرح ہوا، کیوں کر انھوں نے تجارت کے پروانے حاصل کیے اور پھر کیسے کیسے طریقے اپنا کر اس علاقے

---

[1] *Rich in the gems of India's gaudy zone,*
And plunders piled from kingdom not their own.

پر یونین جیک کا جھنڈا نصب کر دیا۔ جنگِ آزادی کے آغاز سے قبل
اس پس منظر کا دائرۂ تحریر میں لانا محض ایک منطقی جواز ہے۔

دوسرا باب

پاک و ہند میں انگریزوں کی آمد

از منۂ قدیم کے مورخوں اور سیاحوں کی بدولت اہلِ یورپ برِعظیم کے حالات و کوائف سے واقف تھے ہی، تیرہویں صدی عیسوی میں مارکو پولو کے سفرنامے[1] نے ان کے ذوق و تجسس کو اور بھی بیدار کر دیا۔ مشرق کی دولت و ثروت اور جاہ و حشم کے ان عینی شواہد نے مغربی دنیا کو اس خطۂ ارضی کا ایسا گرویدہ بنا دیا کہ اطالوی مہم جو کولمبس اس کی تلاش میں نکلا اور امریکہ جا پہنچا۔[2] لیکن مشرق کا شوق سفر سرد نہیں ہوا۔ پرتگالی سیاح اور مہم جو واسکوڈی گاما "۲۷ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔"[3] راس امید کے راستے برِعظیم تک اس کی یہ رسائی صرف سیاحت تک ہی محدود نہ تھی بلکہ بقول اس کے "مذہب و تجارت"[4] بھی مطمحِ نظر تھا۔ مقصد جو کچھ بھی پیش نظر رہا ہو، لیکن یہ حقیقت ہے[5] کہ اس بحری سفر کی کامیابی نے "بالآخر مشرق پر مغربی تسلط کا آغاز کر دیا۔"[6]

واسکوڈی گاما کی اس کامیاب مہم کے بعد برِعظیم میں یورپی تاجروں، سیاحوں اور عیسائی مبلغوں کا تانتا سا بندھ گیا۔ سیم و زر کے انبار نے ان کی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ عیش و عشرت کی فراوانی نے انہیں حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔ زر نگار بام و ستون دیکھ کر بہ انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ صنعت و حرفت کی روز افزوں ترقی نے انہیں مبہوت کر دیا۔ اس

۱۔ آکسفورڈ جونیئر انسائیکلوپیڈیا، جلد پنجم، ص ۲۹۱

۲۔ ایضاً، ص ۹۹

۳۔ برگیس، جیمس: The Chronology of Modern India ص ۴

۴۔ واٹسن، فرانسس: A Concise History of India ص ۱۰۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۵

ملک کی اپنی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مشہور مصنف ڈاکٹر پرسیوال اسپیر اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ

"یہی وہ بے حساب دولت تھی جس نے یورپی مشاہدین کو حد درجہ متاثر کر لیا"۔[1]

یورپی تاجروں، سیاحوں اور مبلغوں کے یہ تاثرات و مشاہدات پرتگال کی سرحدیں عبور کر کے نہ صرف فرانس، ڈنمارک اور ہالینڈ تک پہنچے تھے، بلکہ برطانیہ میں بھی یہ راہ پانے لگے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اہلِ زنگ کے دلوں میں بھی اس ملکِ سیم و زر کو دیکھنے کی خواہشیں جاگ اٹھیں اور سامانِ سفر مہیا ہونے لگا۔ لیکن اس آرزوئے دید کے پسِ پردہ ایک اہم ضرورت بھی انگڑائی لے رہی تھی۔

انگلستان میں[2] گرم مسالوں کی بڑی قدر و اہمیت تھی۔ اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ موسمِ خزاں میں چارے کی شدید قلت کے سبب مویشی ہلاک ہو جاتے اور جب سردی کے دن آتے تو ان کی کمیابی گوشت خوروں کے لئے سوہانِ روح بن جاتی۔ اس مسئلے کا واحد حل یہی تھا کہ دورانِ خزاں گرم مسالوں کے ذریعے گوشت محفوظ کر لیا جائے اور جب جاڑے کا زمانہ آئے، مویشیوں کی نایابی کے باوجود یہ پسندیدہ شئے زینتِ میز ہو۔[3] اگر محفوظ شدہ گوشت میں بدبو پیدا ہو جاتی، یا یہ گل سڑ جاتا تو اس کا مداوا بھی یہی گرم مسالہ تھا۔ صرف یہی نہیں، مویشیوں کے تازہ

---

[1] اسپیر پرسیوال: India, Pakistan and the West، ص ۶۸

[2] ایضاً، ص ۶۹

[3] ایضاً

گوشت کے پکانے میں بھی یہی چیز کام آتی۔ اس کی بدولت ہر قسم کا گوشت لذیذ اور خوش ذائقہ ہو جاتا ــــ غرض انگلستان میں گوشت خوری کا تصور گرم مسالے کے بغیر محال تھا۔ گویا یہ شئے معاشرتی زندگی کا ایک اہم جزو بن چکی تھی ــــ ــــ اور یہ جزو زندگی برعظیم پاک وہند سے ہی درآمد کیا جاتا تھا۔[1]

مگر قباحت یہ تھی کہ جملہ مسالہ جات اور یہی ذرائع سے یہاں پہنچتے تھے۔ ابتدا میں تو اہلِ روم عرب تاجروں کے توسط سے یہ ضروری شئے فراہم کر دیا کرتے۔ مگر جب پرتگالیوں نے براہ راست برعظیم تک رسائی حاصل کرلی تو اس کی تجارت بھی ان کے ہاتھوں میں آگئی اور وہ اس کام کی بدولت خوب نفع کمانے لگے۔ پھر ہالینڈ والے بھی اس تجارتی میدان میں اتر آئے اور مسالوں کے منہ مانگے دام وصول کرنے لگے۔[2] چونکہ مسالہ اہل انگلستان کے لئے ایک لازمی عنصر کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور اس کے حصول کے لئے انہیں اپنے ہی ہم قوم افراد پر تکیہ کرنا پڑتا اور ان کے نخرے بھی سہنے پڑتے۔ لہٰذا وہ نہایت سنجیدگی سے یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اس جزو زندگی کو براہ راست ساحل ہند سے ہی کیوں نہ حاصل کیا جائے[3] کہ جہاں سیاہ مرچ لونگ اور الائچی کے علاوہ دنیا کی ہزار نعمتیں بھی پوشیدہ ہیں۔

اسی ضرورت کے پیش نظر برطانوی جہاز راں برعظیم پاک وہند کی سمت روانہ ہوئے۔ ابتدا میں وہ راس امید کا راستہ اختیار کرنے سے گریزاں رہے کہ اس پر پرتگالیوں کا تسلط تھا۔ لہٰذا انہوں نے شمال مغرب کے

---

[1] ولسن، فرانسس: A Concise History of India، ص ۱۱۸

[2] ایضاً

[3] اسپیئر پرسیوال: India, Pakistan and the West، ص ۷

راستے اس خطے تک پہنچنے کی کوشش شروع کردی۔ اس کا آغاز ۱۵۲۷ء میں رابرٹ تھارن نامی ایک برطانوی تاجر نے کیا، لیکن شمال مغرب راستے سے پاک وہند تک پہنچنا اسے نصیب نہ ہوا۔[1] بعد ازاں ہور، ویلگبی، فروبشر اور ڈیوس نامی برطانوی جہاز رانوں نے اس مہم کو سر کرنے کی کوششیں کیں، مگر وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے۔[2] پہلا برطانوی شخص تھامس اسٹیفنز تھا جو ۲۴ اکتوبر ۱۵۷۹ء کو لسبن کے راستے گوا پہنچا۔[3] اور پھر ۱۵۸۰ء میں بحری کپتان سر فرانسس ڈریک شمال مغرب راستے کے ذریعے ساحلِ ہند پر لنگر انداز ہونے میں کامیاب ہو گیا۔[4]

برعظیم تک براہ راست پہنچنے کا یہ نیا راستہ اہلِ برطانیہ کے لئے نوید جاں فزا ثابت ہوا۔ چنانچہ دوسرے افراد نے بھی قسمت آزمائی شروع کردی۔ ۸ مارچ ۱۵۸۳ء کو ٹیگر نامی جہاز پر چند تاجر جن میں ریلف فچ، ولیم لیڈس اور جیمس اسٹوری شامل تھے، لندن سے روانہ ہوئے اور بحری ہوتے ہوئے گوا پہنچے۔[5] ان میں ریلف فچ ۲۸ ستمبر ۱۵۸۵ء کو اکبر اعظم کے نئے تعمیر شدہ شہر فتح پور سیکری تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔[6] اس شہر کی عظمت و وسعت اور شان و شکوہ دیکھ کر وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اسے کہنا پڑا:

---

[1] برگیس، جیمس: The Chronology of Modern India، ص ۲۱

[2] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر) A Short History of Pakistan۔ جلد چہارم، ص ۷

[3] برگیس، جیمس: ایضاً، ص ۴۹

[4] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر) ایضاً، ص ۱۶

[5] برگیس، جیمس: ایضاً، ص ۵۱

[6] ایضاً، ص ۵۲

"یہ شہر تو لندن سے بھی کہیں زیادہ وسیع و عریض ہے۔"[1]

ایک اور برطانوی تاجر جون ملڈن ہال تھا جو ایران و افغانستان ہوتا ہوا آگرہ پہنچا اور کئی سال یہاں مقیم رہا[2]۔ الغرض ان برطانوی نوواردوں نے نہ صرف اس خطے تک پہنچنے کے دیگر راستے دریافت کر لئے بلکہ اس ملک بے نظیر کے متعلق بہت سی معلومات بھی فراہم کر دیں جن سے "پرشکوہ مشرق پر آویزاں پردہ اٹھتا چلا گیا"[3] اور اہل انگلستان کے شوق و جستجو کے لئے یہ منظرِ شنیدہ تازیانہ بن گیا۔ بقول ڈاکٹر ایم اے رحیم:

"مغلیہ حکومت اور مشرق کی دولت کے متعلق ان تاجروں کے بیانات نے برطانوی بیوپاریوں کے ذہن میں اس امر کی شدید خواہش پیدا کر دی کہ وہ بھی یہاں کی نفع بخش تجارت میں شریک ہو جائیں۔"[4]

راس امید سے ہٹ کر کسی اور راستے سے برعظیم پاک و ہند تک پہنچنے کے لئے اہلِ برطانیہ کی یہ انفرادی کوششیں جاری تھیں کہ ۱۵۸۸ء میں ہسپانیہ کے عظیم الشان اور طاقتور بحری بیڑے "آرمیڈا" کی شکست

---

[1] واٹسن، فرانسس: A Concise History of India، ص ۱۱۴

[2] برگیس، جیمس: The Chronology of Modern India، ص ۶۱

[3] اسپیئر، پرسیوال: India, Pakistan and the West، ص ۷۰

[4] منقول قریشی، اشتیاق حسین: A Short History of Pakistan، جلد چہارم، ص ۱۸

نے ان کے حوصلے اور بھی فزوں کر دیئے اور اب سطح سمندر پر ان کے قدم
مضبوطی سے جم گئے۔[1]

فتح و کامرانی کے ان سلسلوں نے انگلستان کے تجارتی طبقے کو اس
امر پر آمادہ کیا کہ وہ ایک تنظیم کی بنیاد ڈالیں اور حکومت سے باقاعدہ اجازت
نامہ حاصل کر کے نفع بخش کاروبار کا آغاز کر دیں۔ چنانچہ مشہور زمانہ "ایسٹ
انڈیا کمپنی" کا قیام عمل میں آیا جسے ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ملکہ ایلزابتھ اول
نے ایک چارٹر کے ذریعے برعظیم پاک و ہند میں پندرہ سال تک کے لئے تجارت
کرنے کی اجازت دے دی۔[2]

یکے بعد دیگرے دو تجارتی جہاز روانہ کرنے کے بعد ۱۶۰۷ء میں کمپنی
نے تیسرا بحری بیڑا "ہیکٹر" کیپٹن ولیم ہاکنس کی سرکردگی میں روانہ کیا۔[3]
شہنشاہ جہانگیر کے نام برطانیہ کے بادشاہ جیمس اول کا تعارفی خط لے کر
ہاکنس کمپنی کے سفیر کی حیثیت سے اپریل ۱۶۰۹ء میں آگرہ پہنچا۔[4] غیر
منقسم ہندوستان کے مقابلے میں اس وقت انگلستان کی جو حیثیت تھی
اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہاکنس جہانگیر کے دربار میں
پہنچا تو "اس کے متعلق یہ خیال کیا گیا کہ وہ ایک بہت ہی چھوٹے جزیرے سے
آیا ہے۔"[5] باوجودیکہ یہ برطانوی سیاح ایک جہاز کا کپتان اور ایک بیرونی
ملک کا نمائندہ تھا، لیکن "جہانگیر نے اس کا خیر مقدم والہانہ تپاک کے برعکس

۱۔ رابرٹس، پی ای: History of British India، ص ۲۲-۲۴
۲۔ والبینک، ٹی والٹر: A Short History of India and Pakistan، ص ۵۶
۳۔ برجیس، جیمس: A Chronology of Modern India، ص ۶۶
۴۔ وڈرف، فلپ: The Man Who Ruled India، ص ۲۶-۲۷
۵۔ بان، ڈاکٹر گستاؤلی: تمدن ہند، ترجمہ سید علی بلگرامی، ص ۱۷۳

مایوسن کن سرد مہری سے کیا۔[۱] اپنے دوسالہ قیام کے بعد جب ہاکنس واپس انگلستان جانے لگا اور بادشاہ جیمس کے نام شاہی خط طلب کیا تو اس موقع پر جہانگیر کے وزیر اعظم نے اسے جو جواب دیا اسے فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤلی بان کی زبانی سنیے:

"انگلستان کے سے چھوٹے بادشاہ کو خط لکھنا
شہنشاہ ہند کی شان کے خلاف ہے۔"[۲]

کپتان ہاکنس نہ صرف شاہی مکتوب حاصل کرنے میں ناکام رہا بلکہ سورت میں فیکٹری قائم کرنے کا پروانہ بھی اسے نہ مل سکا۔[۳] اس کی ہر ہر درخواست یک قلم رد کر دی گئی۔ بہر حال جب وہ ۱۶۱۲ء میں بے نیل و مرام وطن واپس پہنچا تو برعظیم کے متعلق جو اہم رپورٹ شاہ برطانیہ کو پیش کی وہ یہ تھی:

"ہندوستان کے پاس چاندی ہی چاندی ہے۔ اس
لئے کہ بیرونی قومیں اپنے ہمراہ چاندی کے سکے لاتی
ہیں اور ان کے بدلے یہاں سے ضرورت کی اشیاء
لے جاتی ہیں۔ ان نقرئی سکوں کا اس ملک میں
ایک خزانہ دفن ہے جو یہاں سے بیرون ملک
منتقل نہیں ہوتا۔"[۴]

ہاکنس کی اس رپورٹ نے نقرئی سکوں سے لبریز پاک و ہند میں رسائی

۱؎ واٹسن، فرانسس: A Concise History of India، ص ۱۲۰
۲؎ بان، ڈاکٹر گستاؤلی: تمدن ہند، اردو ترجمہ سید علی بلگرامی، ص ۱۷۴
۳؎ مورلینڈ، ڈبلو۔ ایچ: India at the death of Akbar، ص ۲۲۶
۴؎ منقول اسپیئر، پرسیوال: India, Pakistan and the West ص ۹۳

حاصل کرنے کے جذبے کو اور بھی فزوں کر دیا۔ ایک کمپنی نے کیپٹن بیسٹ کو اس مہم پر روانہ کیا جس نے نومبر ۱۶۱۲ء میں سورت کے ساحلی علاقے پر پرتگالیوں کو عبرتناک شکست دے کر اپنی برتری قائم کر لی اور یہی بات جہانگیر سے گفت و شنید کے لئے ایک وسیلہ بن گئی[1]۔ بالآخر انگریزوں کو اس دفعہ دربار مغلیہ سے سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی باقاعدہ اجازت مل گئی[2]۔

۱۶۱۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایڈوارڈس کو اپنا نمائندہ بنا کر جہانگیر کے دربار میں بھیجا جس نے مغلیہ سلطنت کی جملہ حدود میں تجارت کرنے کا شاہی فرمان حاصل کر لیا[3]۔ اس طرح کمپنی کو نہ صرف سورت کے مقام پر اپنے قدم جمانے کا موقع ملا بلکہ پورے برعظیم میں وسیع پیمانے پر تجارت کرنے کی آزادی بھی حاصل ہو گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے منفعت بخش کاروبار میں سلطنت برطانیہ بھی دلچسپی لینے لگی اور جیمز اول نے ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو کو اپنا ایلچی بنا کر جہانگیر کے دربار میں بھیجا[4]۔ یہ شخص محض عالم ہی نہ تھا[5] بلکہ اعلیٰ درجے کا ڈپلومیٹ[6] بھی تھا۔ اور اس کے بھیجنے کی غرض و غایت

---

۱ برجیس، جیمس: The Chronology of Modern India، ص ۷۰
۲ سٹیفن، مالکم، سی سی: India Office، ص ۹
۳ برجیس، جیمس: ایضاً، ص ۷۲
۴ ایضاً:
۵ قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر): A Short History of Pakistan جلد چہارم ص ۱۹
۶ فرانسس واٹسن نے رو کے سفارتی کام کے لئے لفظ "Steer" استعمال کیا ہے جس کے معنی جہاز کو صحیح رخ پر رکھنا ہے۔ ڈپلومیٹ کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو A Concise History of India، ص ۱۲۰
نیز علی، کے: A new history of Indo-Pakistan، ص ۹۷

یہی تھی کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان تجارت و صنعت سے حاوراً دوستانہ
تعلقات قائم کرے۔ اس نے جہانگیر کی قربت حاصل کرنے اور دربار میں اپنا
اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لئے ہر ممکن اقدام کیا۔ رو نے امیر اعظم آصف خان کو
بیش قیمت تحائف[1] دے کر فی الحقیقت اپنے لئے راستہ ہموار کیا۔ جہانگیر کے
شوقِ مصوری کے پیش نظر اس نے اعلیٰ درجے کی تصاویر بھی نذر کیں[2]۔ حتیٰ
کہ بادشاہ کی کھلونوں سے غایت دلچسپی کو دیکھتے ہوئے یہ چیزیں بھی اس
کے حضور میں پیش کیں[3]۔

سر ٹامس رو کی یہ کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور شہنشاہ
جہانگیر سے اس کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے[4]۔ اور جب وہ تین سال تک
یہاں قیام کرنے کے بعد واپس لوٹا تو اپنے مقصد میں اس قدر کامیاب و بامراد
تھا کہ انگریزوں نے سورت کے علاوہ آگرہ، اجمیر، احمد آباد اور بھڑوچ میں بھی اپنی
فیکٹریاں قائم کر لی تھیں[5]۔ رو کے دوستانہ مراسم نے جہانگیر کو اس امر پر مجبور
کیا کہ وہ انگریزوں کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے[6]۔

انگلستان کے اس سفیر نے جاتے جاتے قائم شدہ فیکٹریوں میں کام
کرنے والے فرنگیوں کو جو سبق دیا، وہ دراصل حاصل کردہ شاہی فرمان پر ایک

---

[1] فوسٹر، ولیم: The Embassy of Sir Thomas Roe to India، ص ۳۷، لندن
[2] اکرام، ایس، ایم: Muslim Civilization in India، ص ۲۵۰
[3] ایڈوارڈس و گیریٹ: Mughal Rule in India، ص ۲۶۹
[4] علی، کے: A New History of Indo-Pakistan، ص ۹۷
[5] والبینک، ٹی، والٹر: A Short History of India and Pakistan، ص ۵۶
[6] ہاشمی، انوار: تاریخ پاک و ہند، ص ۳۹۲

نئے انداز اور نئے طریقے سے عمل درآمد کا پیغام تھا ــــ ایک ایسا پیغام جس کی تعمیل ہی دراصل برعظیم میں حکومت انگلشیہ کے قیام کا سنگ بنیاد بنی۔ اس نے کہا:

> "میری یہ تجویز ہے کہ آپ لوگ سمندروں پر اپنے آپ
> کو محفوظ رکھیں، جہاں سردست نقصان کا سامنا
> تو ہوگا، لیکن فوائد بھی حاصل ہوں گے ......
> ہندوستان میں بغیر کسی نزاع کے فوجی نقل و
> حرکت اور خانہ جنگی ایک غلطی ہوگی۔"[1]

اور انگریز تاجر ٹامس رو کی اس نصیحت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔[2] چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر قوت اس پر صرف کردی کہ وہ فی الوقت سمندروں پر ہی حاوی ہو جائیں اور ساحلی علاقوں پر اپنے قدم مضبوطی سے گاڑ دیں ــــ تاریخ شاہد ہے کہ آگے چل کر یہی "ساحلی محاصرہ" ان کی قوت و استحکام کا نمایاں سبب بنا۔

ٹامس رو کی مذکورہ بالا نصیحت کے پیش نظر کمپنی نے جنوب مشرقی ساحل پر قدم جمانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۶۳۲ء میں اس نے ریاست گولکنڈہ کے سلطان سے ایک فرمان حاصل کر لیا جسے "سنہرے فرمان" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، اور جس کی رو سے اس ریاست کے ساحلی علاقوں پر اسے ایسی تجارت کرنے کا پروانہ مل گیا جو جملہ محصول سے آزاد تھی۔[3] مزید براں

---

[1] منقول والٹس، فرانسس: A Concise History of India، ص ۱۲۰

[2] ایضاً

[3] عزیز، اے: Discovery of Pakistan، ص ۱۷۳

اس نے مسولی پٹم میں ایک فیکٹری بھی قائم کر لی[1] اسی عرصے میں انگریزوں نے مالکنڈی (اڑیسہ) کے نواب سے محصول معاف تجارت کا اجازت نامہ بھی حاصل کر لیا اور ہریہر پور میں فیکٹری بنانے کا کام شروع کر دیا۔[2] سنہ ۱۶۳۹ء میں ایک برطانوی شخص فرانسس ڈے نے چندری گری کے حکمران سے کورمنڈل کے ساحل پر کوم ندی کے متصل ایک قطعۂ زمین خرید کر اس پر ایک قلعہ تعمیر کرایا۔[3] آگے چل کر یہی قلعہ "سینٹ جارج" کے نام سے مشہور ہوا اور انگریزوں کا پہلا دفاعی مورچہ بنا۔ اور یہ علاقہ شہر مدراس کی صورت میں نمایاں ہوا۔[4]

سنہ ۱۶۴۴ء میں انگریزوں کو قسمت آزمائی کا ایک اور نادر موقع ملا جس سے انھوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اسی سال شاہ جہاں کی چہیتی بیٹی جہاں آرا بیگم آگ سے بری طرح جھلس گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سورت سے جبریل گبٹن نامی ایک سرجن کو علاج معالجے کی غرض سے ظل شہنشاہ کے پاس بھیجا۔ اس برطانوی ڈاکٹر کی کوششوں سے شاہزادی روبہ صحت ہو گئی۔ جب شاہجہاں نے انعام و اکرام سے نوازنا چاہا تو فرنگی معالج نے اس کے برعکس اس خواہش کا اظہار کیا کہ انگریزوں کو ایک ایسا فرمان عطا کیا جائے جس کی رو سے مغلیہ سلطنت کی حدود میں اپنی محصول ادا کئے بغیر تجارت کی اجازت عام ہو۔ اس طبیب کی درخواست خسروانہ انداز میں قبول کر لی گئی۔[5]

---

[1] برگیس، جیمس: The Chronology of Modern India، ص ۸۷

[2] ایضاً

[3] والبینک، ٹی والٹر: A Short History of India and Pakistan، ص ۵۷

[4] مائیکل ایڈوارڈز: The Necessary Hell، ص ۷

[5] برگیس، جیمس: ایضاً، ص ۹۵

اس واقعہ کے چند ہی سال بعد برطانوی سرجن بلنٹن کو خسروانہ بخشش کے حصول کا ایک اور موقع ملا۔ شاہزادہ شجاع کے حرم کی ایک خاتون سموت علیل ہو گئی۔ اسی غیر ملکی معالج کے ہاتھوں وہ بھی صحت یاب ہوئی۔ انعام میں طبیبِ خوش نصیب نے ہگلی میں فیکٹری قائم کرنے اور پٹنہ، قاسم بازار، ڈھاکہ اور بالاسور میں ایجنسی کھولنے کی اجازتِ خاص حاصل کر لی۔[1]

ادھر ۱۶۶۸ء میں شاہ برطانیہ چارلس دوئم نے بمبئی کو جو اس کی ملکہ کو پرتگال سے بطور جہیز ملا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا۔[2] یہ شہر چند ہی برسوں میں انگریزوں کا ایک اہم مرکز بن گیا اور کمپنی کا صدر دفتر سورت سے وہاں منتقل ہو گیا۔[3] اگلے برس انگریزوں نے بنگال کے صوبے دار شائستہ خاں سے اس امر کی اجازت حاصل کر لی کہ ان کے جہاز ہگلی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو سکیں۔ اور اس طرح بنگال پائلٹ سروس کا آغاز ہوا۔[4] اس صدی کے اختتام تک انگریزوں نے اس صوبے کے تین دیہی علاقوں — ستانوتی، گووند پور اور کالی کٹا — کی زمین داری بارہ ہزار روپے کے عوض حاصل کر لی۔[5] آخرالذکر گاؤں کالی کٹا سے کلکتہ بنا اور برطانوی استحکام و عروج کا ایک اہم مرکز قرار پایا۔[6]

---

[1] عزیز، اے: Discovery of Pakistan، ص ۱۷۴

[2] برگیس، جیمس: The Chronology of Modern India، ص ۱۱۲

[3] عزیز، اے: ایضاً، ص ۱۷۴

[4] برگیس، جیمس: ایضاً، ص ۱۱۳

[5] عزیز، اے: ایضاً، ص ۱۷۴

[6] اردو انسائیکلوپیڈیا فیروز سنز، ص 1150

انگریزوں نے اپنی حکمت عملی اور موقع شناسی کی بدولت مغلیہ حکومت سے جو مراعات، جو بخششیں اور جو فرامین حاصل کئے، ان سے نہ صرف تجارت میں انہیں فروغ حاصل ہوا، بلکہ یہی "عناصر ثلاثہ" ان کے قصر و ایواں کی بنیاد بھی بنے۔ آیئے اگلے باب میں اس برطانوی مستمر کی تعمیر کا منظر بھی دیکھیں جس نے برعظیم کی تاریخ کا دھارا یکسر بدل کر رکھ دیا۔

تیسرا باب

کمپنی سے کمپنی بہادر تک

سترہویں صدی کے آغاز میں برطانوی سفیر سرٹامس رو نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں کو سطح سمندر پر مضبوطی سے قدم جمانے کا جو مشورہ دیا تھا اس پر تیزی سے عمل درآمد ہوا۔ اور یہ اسی کوشش و کاوش کا نتیجہ تھا کہ اس صدی کے اختتام تک انگریزوں نے نہ صرف بحری برتری حاصل کر لی بلکہ اہم بندرگاہوں پر قلعے اور فیکٹری کی صورت میں اپنے مورچے باندھ لئے۔ سورت، بمبئی، مدراس اور ہگلی جیسے ساحلی علاقوں کو اپنے دسترس میں کر کے انہوں نے صحیح معنوں میں برعظیم کا گھراؤ کر لیا ــــ اور اب ان کی نظر میں حسب راست اقدام کا وقت آگیا تھا۔ اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس وقت کے صدر اور بمبئی کے گورنر جیرالڈ اینجیر نے ۱۶۸۳ء میں لندن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سامنے اپنے ایک مراسلے کے ذریعے یوں پیش کیا تھا:

"اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے ایک ہاتھ میں تجارتی سامان ہو اور دوسرے میں تلوار۔"[۱]

بورڈ نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے دسمبر ۱۶۸۷ء میں کمپنی کو ہدایت کی کہ وہ اسی نوع کی سول اور فوجی پالیسی وضع کرے اور ان دونوں مقاصد کے حصول کے لیے آمدنی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے تاکہ ہندوستان میں ایک وسیع مستحکم اور پائیدار برطانوی حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے۔[۲]

لندن سے موصول ہونے والے درج بالا احکام پر عمل کا آغاز اس طرح ہوا کہ کمپنی کے ایک سینیئر رکن سر جان چائلڈ کو کیپٹن جنرل اور امیر البحر کا نیا عہدہ

---

[۱] بحوالہ پاکستان ہسٹری بورڈ: A Short History of Pakistan، ص ۳۰۲
نیز ملاحظہ ہو عزیز احمد: Discovery of Pakistan، ص ۱۱۳

[۲] ٹنکر، ہیوگ: South Asia: A Short History، ص ۱۴۳ و بعدہ

تفویض کیا گیا۔[۱] عام سول ملازمین کے لئے فوجی تربیت لازمی قرار پائی۔[۲] بمبئی کے گورنر جیرالڈ اینجیر کو اس امر کی اجازت مل گئی کہ وہ دیسی حکمرانوں سے نمٹنے کے لئے فوج تعینات کرے۔ چنانچہ چھ سو دیسی افراد پر مشتمل ایک ملیشیا قائم کر دی گئی۔[۳] مدراس کی فیکٹری میں بارود تیار ہونے لگا۔[۴] بمبئی اور مدراس کی طرح بنگال میں بھی تحفظ کے لئے ایک مضبوط قلعے کی ضرورت سمجھی گئی۔ چنانچہ فورٹ ولیم کی تعمیر عمل میں آئی۔[۵] اسے دفاعی مورچہ بنانے کی خاطر وہاں لاتعداد بندوقیں رکھی گئیں اور سوا سو افراد کی ایک فوج بحال کی گئی جس میں نصف یورپین تھے۔[۶]

اس فوجی تیاری کے بعد کمپنی نے برعظیم میں مضبوط و مستحکم برطانوی حکومت قائم کرنے کے لئے تلوار نیام سے نکال لی اور چوب چرنوک کو ۱۶۸۸ء میں حکم دیا کہ وہ بزور شمشیر چاٹگام جیسی اہم بندرگاہ کو قبضے میں کر لے۔[۷] یہ انگریزوں کا پہلا جارحانہ قدم تھا۔ چاٹگام پر یورش کرنے کے علاوہ ہگلی کو بھی نشانہ بنایا گیا۔[۸]

ادھر بمبئی کے ساحل پر شاہی جہاز "گنج سوائی" کو انگریزوں نے لوٹ لیا اور اس میں سوار عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے ساتھ نہایت ہی ناروا

۱۔ برگیس، جیمس: *The Chronology of Modern India*، ص ۱۲۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۵۔ فلپس، سی، پی: *India*، ص ۳۹

۶۔ برگیس، جیمس: ایضاً، ص ۱۵۰

۷۔ فلپس، سی، پی: ص ۳۹

۸۔ رابرٹس، پی، ای: *History of British India*، ص ۴۳

سلوک کیا۔[1] اگلے سال انگلستان کے بادشاہ جیمس دوئم نے کمانڈر ولیم ہیتھ
کی نگرانی میں ایک جنگی جہاز بھی چاٹگام کی تسخیر کے لئے روانہ کردیا۔[2] انگریزوں
کو ایسا کرتے وقت یہ احساس نہ تھا کہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب ابھی بقیدِ حیات
ہے اور اس کا لائق صوبیدار شائستہ خاں بنگال میں موجود ہے۔ چنانچہ اہلِ
فرنگ کی سرکوبی کے لئے مغل شہنشاہ نے نہایت ہی سخت احکامات جاری کئے
اور انگریزی حکومت کے گماشتوں کو حراست میں لینے کے لئے خط لکھا۔[3] اورنگ
زیب کی یہ سرزنش ایسی شدید تھی کہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ یہ حقیقت ہے
کہ اگر اس وقت اورنگ زیب سریرآرائے سلطنت نہ ہوتا تو یہ مغلیہ حکومت
قبل از وقت ختم ہو چکی ہوتی۔[4] لیکن اس ضعیف مردِ غازی نے باوجودیکہ ریشہ
دوانیوں کے جال میں پھنسا تھا، فرنگیوں کے حوصلے پست کر دیے اور اپنی معافی
مانگنے پر مجبور کردیا۔[5]

تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انگریزوں کو شکست و ناکامی کا سامنا کرنا پڑا،
وہ اندازِ انکساری اور لہجۂ لجاجت کے ساتھ "معافی نامہ" پیشِ دربار کر دیتے اور
پھر جملہ مراعات کے طلبگار بن جاتے۔ مغل بادشاہوں کی اس وسیع القلبی سے فائدہ
اٹھانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے سلطنتِ ہند کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی غرض سے سازشوں
کا ایک سلسلۂ لامتناہی بھی قائم کردیا۔ اورنگ زیب کی حکومت میں انتشار و

---

[1] ایڈورڈز، ایس ایم: The Bombay City Police، ص ۱۳۳-۱۳۴
[2] عزیز، اے: Discovery of Pakistan، ص ۱۱۴
[3] ذکاء اللہ، مولوی: تاریخ ہندوستان، جلد ہشتم، ص ۴۱۱-۴۱۲
[4] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، ص ۲۱۷
[5] باری: کمپنی کی حکومت، ص ۷۲

بدنظمی پھیلانے کی خاطر انہوں نے بڑے بڑے مہاراجوں، نوابوں اور تاجروں کو آلۂ کار بنایا۔[1] نیز ان کی یہ کوشش بھی رہی کہ مرہٹوں کو بوڑھے مغل بادشاہ کے خلاف اکسا کر نظامِ سلطنت درہم برہم کیا جائے، اور جب مرکزی حکومت کمزور و مضمحل ہو جائے تو پھر مرہٹوں کو شکست دے کر اپنا اقتدار قائم کرنا آسان تر ہو گا۔[2]

انگریز قلعے کی صورت میں مورچہ بنانے اور اپنی دفاعی قوت کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی توڑ جوڑ میں بھی مصروف و منہمک تھے کہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہو گیا۔ وہ مغلیہ سلطنت ـــ جو اس کی زندگی میں سارے برِعظیم پر محیط تھی، جس نے برطانوی نو واردوں کی یلغار کو روکا، جس نے مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے زور کو توڑا[3]، جس نے دکن پر اپنا اثر قائم رکھا ـــ اب، اس کی آنکھ بند ہوتے ہی تیزی سے رو بہ زوال ہونے لگی۔[4] عالمگیر کے جانشینوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی طرح جفاکش، صاحبِ عزم و ہمت اور پیکرِ استقامت بن کر ہر آنے والے طوفان کا مقابلہ کرتا۔ اس کی وفات کے بعد نااہلیت، کوتاہ بینی اور غداری کی ایک داستانِ مسلسل دہرائی جاتی رہی۔[5]

بزمِ تیموریہ کے جاہ و جلال کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ پورے ملک کا سیاسی و معاشرتی نظام درہم برہم ہونے لگا۔ مرہٹوں نے لوٹ کھسوٹ کے ذریعے عوام کی زندگی اجیرن کر دی۔ ان کے پے بہ پے حملوں سے مرکزی حکومت کو مسلسل

---

[1] رچرڈ، آر: *India*، ص ۲۷۹

[2] میکالے لارڈ: *Critical and Historical Essays*، ص ۱۹۰

[3] قریشی، اشتیاق حسین: برِعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، ص ۲۱۹

[4] ایضاً، ص ۲۱۰

[5] ایضاً، ص ۲۲۳

زک پہنچتا رہا[1]۔ جاٹوں نے بھی عالمگیر کی رحلت کے بعد دوبارہ پرچم بغاوت بلند کیا اور دہلی کے گرد و نواح میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کردیا۔[2] ادھر پنجاب میں سکھوں نے اسلام دشمنی پر کمر باندھ لی اور لوٹ مار میں مصروف ہوگئے۔[3]

مرکزی حکومت کو سرے سے ختم کرنے کے لئے جہاں مرہٹے، جاٹ اور سکھ سرگرم عمل تھے، وہاں نادر شاہ برعظیم پر قہر و غضب کی برق ستم خیز بن کر نازل ہوا۔ اس نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور کشتوں کے پشتے لگادیئے۔[4] حملۂ نادری سے ملک کی سیاست و معیشت پر شدید ضرب لگی اور اس کے ضرر رساں اثرات و عوامل سے یہاں کی رہی سہی ساکھ اور بگڑ کر رہ گئی۔[5]

جہاں ایک طرف مرکزِ سلطنت پے بہ پے حملوں کا نشانہ بن رہا تھا، وہاں دوسری طرف خود مسلم امراء، صوبیدار اور دیگر عمّال حکومت سازشوں میں پڑ کر اس کی جڑیں کھود رہے تھے۔ یہ لوگ سلطنتِ دہلی سے بغاوت کرکے اپنی آزاد و خود مختار ریاستیں قائم کرنے لگے۔ اس طرح مرکزیت پارہ پارہ ہوگئی۔ دہلی کی آمدنی گھٹ کر رہ گئی۔ سرکاری خزانہ خالی ہوگیا۔ پورے ملک کا اقتصادی نظام ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ اقتدار کی جنگ اور ملک گیری کی ہوس نے پورے برعظیم میں طوائف الملوکی پھیلادی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر نائبِ سلطنتِ دہلی اپنی اپنی جگہ بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔ اس انتشار و ابتری، اس بدنظمی و لامرکزیت کا جو نتیجہ سامنے آیا، وہ

---

[1] رابرٹس، پی، ایف: History of British India، ص ۶۰-۶۱

[2] اسپیئر، پرسیوال: Twilight of the Mughals، ص ۱۶-۱۷

[3] ایضاً، ص ۲-۴

[4] واٹسن، فرانسس: A Concise History of Modern India، ص ۱۲۴

[5] طباطبائی، غلام حسین: سیر المتاخرین، جلد دوم، ص ۱۰۹-۱۱۰

یوں تھا:

"مسلم امراء کے ہلاکت آفریں باہمی جھگڑوں نے مسلمانوں
کے سیاسی ورثے کو تباہ و برباد کر دیا۔ جن لوگوں کو
سلطنت کی مدافعت میں اپنا خون بہانا چاہیے تھا،
اُن کی انتہائی خود غرضیوں کی آگ میں جل کر ایک
عظیم الشان مملکت راکھ کا ڈھیر ہو گئی"۔[1]

انتہائی خود غرضیوں کا یہ سلسلہ لامتناہی بنگال، اودھ، میسور، حیدر آباد اور دیگر ریاستوں کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ برعظیم کی متحد، منظم اور مستحکم حکومت کی یہ تقسیم و تفریق برطانوی حکومت کے مشن کو آگے بڑھانے میں حد درجہ ممد و معاون ثابت ہوئی۔

برطانوی جارحیت کا پہلا نشانہ بنگال تھا۔ اس صوبے کے خود مختار حکمران علی وردی خاں کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ فورٹ ولیم میں نشوونما پانے والی یہ طاقت بنگال کی آزادی کے لئے خطرے کا سبب بن رہی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی مملکت کا اس طرح دفاع کیا کہ کمپنی کو کسی پیش قدمی کی جرأت نہ ہو سکی۔ سفرِ آخرت کسی لمحے بھی شروع ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے نواسے سراج الدولہ کو پہلے ہی سے وصیت نامے کے ذریعے ہوشیار و چوکنا کر دیا:

"مغربی قوموں کی اس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا
جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہے۔ اگر میری عمر کا
پیمانہ لبریز نہ ہو گیا ہوتا تو تمہارے اس اندیشے کو بھی
ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا۔ اس کام کی تکمیل تمہارے ذمے

---

[1] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۲۲۵

ہے۔ ...... ایک ہی وقت میں تینوں قوتوں کو تباہ
کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے انگریزوں کی قوت
کو توڑنا۔ .... سنو بیٹا! انہیں سپاہی رکھنے
اور قلعے تعمیر کرنے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا
تو بنگال تمہارا نہیں۔"[1]

جب چوبیس سالہ سراج الدولہ تخت پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلے انگریزوں کی فیکٹری کے منیجر واٹس سے بازپرس کی کہ بغیر اجازت حاصل کئے قلعے کیوں کر تعمیر کئے گئے۔ اس نے سختی سے حکم دیا کہ انہیں فوراً مسمار کر دیا جائے[2]۔ لیکن کمپنی کے کارندوں نے سنی ان سنی کر دی۔ یہی نہیں اس جوشیلے اور وطن پرست نواب کے تیور کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سازشوں کا ایسا جال بچھایا[3] کہ اپنے بیگانے ہو گئے، مملکت کے نمک خوار دشمنی پر اتر آئے اور تخت و تاج کے محافظ خود ان ہی چیزوں کا سودا کرنے لگے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ کمسن مجاہد وطن کے ناموس و وقار کی حفاظت کرتا ہوا شہید ہو گیا۔

پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) صحیح معنوں میں سازشوں کی جنگ تھی[4]۔ اسے انگریزوں نے اپنی بہادری اور سپہ گری کا مظاہرہ کئے بغیر ہی جیت لی تھی[5]۔ بقول کرنل میلی سن:

"اگر دغا و حرفت کا یہ ڈرامہ نہ کھیلا گیا ہوتا تو انگریز
تباہ و برباد ہو گئے ہوتے۔"[6]

---

[1] منقول باری، کمپنی کی حکومت، ص ۱۰۳
[2] پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی: A Short History of Hind-Pakistan، ص ۲۲۱
[3] سپنی، آر جے: Clive of India، ص ۹۷ وبعدہ
[4] فلیپ، ووڈرف: The Man Who Ruled India، جلد اول، ص ۱۰
[5] واٹسن، فرانسس: A Concise History of India، ص ۱۲۶-۱۲۷
[6] میلی سن کرنل، جی، بی: The Decisive Battle of India، ص ۵۹

۱۷۵۷ء کا یہ سانحہ برعظیم کی تاریخ میں ایک سانحۂ عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے کمپنی کے سیاسی استحکام کا پہلا سال کہا جاتا ہے۔ یہی وہ سال ہے جب پلاسی کے مقام پر کمپنی نے فتح حاصل کر کے اپنے استحکام کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ اس کے بعد کا دور مقبوضات میں توسیع اور سیاسی مرکزیت کے حصول کا دور ہے۔[1]

برطانوی اقتدار کی توسیع و ترقی کا یہ دور بھی اسی سابقہ سازش و فریب پر محیط ہے۔ چھ ہی سال بعد بکسر کے مقام پر انگریزوں نے بنگال، اودھ اور سلطنت دہلی کی متحدہ طاقت کو بنارس کے راجہ بلونت سنگھ اور اودھ کے منصب دار بینی بہادر کی غداری کے بل بوتے پر شکست دے دی۔[2] مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی انگریزوں کا باج گزار بن گیا اور اودھ کا علاقہ کمپنی کے زیر اثر آ گیا۔[3]

ادھر جنوبی ہندوستان میں میسور کی ریاست ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ انگریز اچھی طرح جانتے تھے کہ جنوبی ہند کی ریاستیں بہت زیادہ طاقت ور ہیں اور ایک نہ ایک دن انہیں ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حیدر علی کی ابھرتی ہوئی طاقت سے وہ حد درجہ خائف تھے۔ مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے یہاں بھی اپنی سابقہ حکمت عملی اختیار کی اور دکن کے نظام، کرناٹک کے نواب اور مرہٹہ سرداروں سے ساز باز کر کے دکنی ریاستوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ لیکن حیدر علی ایسا کوہ گراں تھا کہ ان سے ٹکرائے نہ بنا۔

جب حیدر علی کی وفات کے بعد اس کا شیر دل بیٹا ٹیپو سلطان ان کے

---

[1] عبداللہ ملک: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، ص ۱۱

[2] عزیز اے: Discovery of Pakistan، ص ۱۹۲

[3] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر): A Short History of Pakistan، جلد چہارم، ص ۶۵

مقابلے میں صف آرا ہوا تو ہر فرنگی کا حوصلہ پست ہو گیا۔ فتح و نصرت کے خواب اب شرمندۂ تعبیر ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے میر جعفر جیسی طبع و طینت کے کئی بڑے بڑے عہدیداروں کو آلۂ کار[1] بنایا اور ان کی غداری کی آڑ میں اپنے سب سے بڑے دشمن کا صفایا کر دیا۔ اب جنوب کی دیگر ریاستوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تابع ہونے میں چنداں دشواری نہ تھی۔

مشرقی، جنوبی اور وسطی علاقوں کو زیرِ دام کرنے کے بعد انگریزوں نے سندھ اور پنجاب کی طرف کمند پھینکی۔ اول الذکر اورنگ زیب کی وفات کے چار سال بعد ایک خود مختار صوبہ بن گیا تھا اور یہاں میروں کی زیرِ نگرانی ایک ایسی حکومت قائم ہو گئی تھی جہاں بقول اوٹ رم "عوام کا ہر طبقہ اتنا ہی آسودہ حال تھا جتنا ایشیا کی کسی بھی سلطنت طبقہ خوش و خرم تھا۔"[2] لیکن برطانوی فوج کے جنرل چارلس نیپیئر نے یہ اعلان کر کے کہ "ہمیں سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، مگر ہم ایسا ضرور کریں گے"[3] ــــ جارحیت کی ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہاں بھی برطانوی فتح و نصرت کے پسِ پردہ سازشوں کا ایسا جال بچھا ہوا ہے، جس نے بھائی کو بھائی سے صف آرا کر دیا[4] اور جس کے نتیجے میں سندھ اگست ۱۸۴۳ء میں کمپنی کی ماتحتی میں آ گیا! اور اس خوشحال خطے کو غارت و برباد کرنے کے انعام میں چارلس نیپئر کو ستر ہزار پونڈ کی رقم ملی۔[5]

---

[1] کرمانی، میر حسین علی: نشانِ حیدری، اردو ترجمہ محمود فاروقی، ص ۳۸۲

[2] منقول قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر): A Short History of Pakistan، جلد چہارم، ص ۱۰۶

[3] فریزر، آر ڈبلیو: British India، ص ۲۳۸

[4] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر): ایضاً، ص ۱۰۴

[5] عزیز، کے کے: Discovery of Pakistan، ص ۲۲۲

پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد رفتہ رفتہ سارے پنجاب پر سکھوں کا تسلط قائم ہوگیا تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ فرماں روا بنا بیٹھا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ اس قوم کی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں مسلسل ہوتی رہیں تا اینکہ ۱۸۴۹ء میں گجرات کے مقام پر سکھوں کو زبردست شکست دے کر کمانڈر انچیف سر ہگ گف نے اس صوبے کو کمپنی کی حکومت میں مدغم کر لیا۔[1]

اودھ جو پہلے ہی سے باج گزار تھا[2]، اسے ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو مندرجہ ذیل اشتہار کے ذریعے برطانوی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا:

"اشتہار دیا جاتا ہے کہ آج کے دن سے ملک اودھ کا نظم و نسق بلا شرکتِ غیر ہمیشہ کے لئے کمپنی انگریز بہادر کے قبضۂ اختیار میں آگیا ہے۔ سب عامل و ناظم و چکلہ دار و جملہ نوکرانِ دربار اور سب اہلِ کارانِ مالی و ملکی دیوانی و فوجداری و سپاہیانِ دربار اور جملہ ساکنانِ اودھ کو لازم ہے کہ آئندہ کمپنی انگریز بہادر کے اہل کاروں کی اطاعت اور فرماں برداری کلی کرتے رہیں۔"[3]

اور دہلی — جو وسیع و عریض سلطنتِ مغلیہ کا مرکز و منبع تھا، جہاں شاہانِ کرّوفر کا رعب و دبدبہ رہتا تھا، جہاں شاہ برطانیہ کے سفیر لرزہ براندام نظر آتے تھے، جہاں کے منقش بام و در دیکھ کر بیرونی سیّاح حیرت زدہ ہو جاتے

---

[1] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر): A Short History of Pakistan، جلد چہارم، ص ۱۰۶

[2] ایضاً: برّعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ص ۲۲۵

[3] نجم الغنی، حکیم: تاریخ اودھ، ص ۲۷۰

تھے ــــ وہاں، "تخت شاہی پر چنگیز و تیمور کی اولاد کٹھ پتلی کی طرح بیٹھی تھی اور حکومت دراصل انگریزوں کی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے کا نعرہ ہی یہ ہو گیا تھا:"[1]

"ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا۔"[2]

---

[1] قادری، حامد حسن: داستانِ تاریخ اردو، ص ۶۵

[2] منقول ایضاً، ص ۶۵

چوتھا باب

اردو شاعری میں انقلابی رجحانات

(سنہ ۱۷۰۷ء — سنہ ۱۸۵۶ء)

گذشتہ باب میں ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ برعظیم پاک وہند کا زوال عملی طور پر ۱۷۰۷ء سے شروع ہوتا ہے جب عالمگیر نہایت بے سروسامانی کی حالت میں اپنی وسیع و عریض سلطنت چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اس کے بعد کوئی ایسا صاحب تدبر نظر نہیں آتا جو مغرب، مشرق اور جنوب کی سمت سے آنے والے سیلِ بلاخیز کا رخ موڑ دیتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی تاجروں نے پورے تشدد و جد سے اپنے پر پرزے نکالے اور پارہ پارہ ہو جانے والی سلطنتِ مغلیہ کو دسترس میں کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ ادھر مرہٹوں، جاٹوں اور افغانوں نے عوام کا شیرازۂ ہستی بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ جو رہی سہی کسر تھی، ایرانی حملہ آور نادر شاہ کی تیغ خوں آشام نے پوری کر دی۔

برعظیم کی تاریخ میں یہ بڑے کرب کا دور تھا۔[۱] پورے ڈیڑھ سو سال کا یہ عرصہ نہایت روح فرسا اور جاں گسل تھا۔ ہر شخص حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔ عقل کام نہیں کرتی تھی۔ دماغ شل ہو کر رہ گئے تھے۔ فکر و سوچ کے تمام سوتے خشک پڑے تھے۔ حال تاریک تر تھا اور مستقبل بے نام و نشان دکھائی دیتا تھا۔

اسلامی تہذیب و روایات پر ضربیں پڑ رہی تھیں۔ ملک کا معاشی نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ کسب زر کے ناجائز ذرائع اختیار کئے جانے لگے تھے۔ مال و منال اور عزت و آبرو سلامت نہیں رہی تھی۔ ظلم و تشدد کا دور دورہ تھا۔ امیر غریب کو، ظالم کمزور کو، آجر مزدور کو، صاحب زمین رعیت کو اور نواب رعایا کو مشق ستم بنا رہے تھے۔ ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور ہر شخص اپنے تئیں رستم زماں بنا ہوا تھا۔

شعرائے اردو اسی تیرہ و تار ماحول میں رچ بس رہے تھے۔ وہ شب و روز بدلتے ہوئے نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ سلطنتیں ان کے سامنے

---

[۱] ملک، عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، ص ۱۱

زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ ان کے روبرو تہذیب و روایات کے پرخچے اڑ رہے تھے۔ معاشی و معاشرتی زبوں حالی کا منظر ان کی نظر میں تھا۔ عوام کے ستم رسیدہ دلوں کی دھڑکنیں وہ سن رہے تھے۔ وہ ایک اکائی کی صورت میں جی رہے تھے اور قوم کی ڈوبتی ہوئی نبض ان کی انگلیوں کی گرفت میں تھی۔

ایسے پر آشوب وقت میں ہمارے شعرا نے روایتی انداز و بیان سے اجتہاد کیا۔ انھوں نے اپنے فکر و فن کو گل و بلبل کی مدح خوانی تک محدود نہیں رکھا۔ برعظیم کی تباہی و بربادی کا جو مشاہدہ و مطالعہ انہوں نے کیا تھا اس کا نقشہ بلا کم و کاست اپنے کلام میں پیش کر دیا ــــ غزل جسے محبوب سے باتیں کرنے کا نام دیا گیا ہے[1] جس کے اشعار میں عشق و محبت کی فضا چھائی ہوئی ہوتی ہے[2] اور جسے ان خصوصیات کی بنا پر "نیم وحشی صنف سخن"[3] قرار دیا گیا ہے ــــ وہی غزل اس دور کے روح فرسا ماحول اور کربناک لمحات کی آئینہ دار بنی۔ قصیدہ جس کے معنی "مدح و ذم"[4] کے لئے جاتے ہیں ــــ معاشی زبوں حالی، سیاسی ابتری اور ملکی شکست و ریخت کا ترجمان ہوا۔ مثنوی جو حسن و عشق اور قصہ کہانی کے لئے مخصوص رہی ہے[5] ــــ اس زمانے کے حالات و کوائف کے اظہار کا ذریعہ ٹھہری۔ اردو شاعری کے اس رخ سے واضح ہو جائے گا کہ شعرائے اردو اپنے ماحول سے کتنے قریب اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے کس قدر باخبر اور متاثر تھے۔[6]

۱؎ فتحپوری، نیاز: اردو غزل اور تغزلین، مطبوعہ نقوش، لاہور، غزل نمبر، ص ۵۸۳
۲؎ گورکھپوری، مجنوں: شعر اور غزل، مطبوعہ نگار، لکھنؤ، اصناف سخن نمبر، ص ۲۷
۳؎ احمد، کلیم الدین: اردو شاعری پر ایک نظر، ص ۹
۴؎ حالی، الطاف حسین: مقدمہ شعر و شاعری، ص ۲۶۰
۵؎ سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۱۴
۶؎ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین: اردو شاعری کا تہذیبی و سیاسی پس منظر، ص ۲۲۴

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اس دور کے تمام شعرا کا انداز قنوطی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات کا تذکرہ تو کرتے ہیں، سیاسی اور معاشی تغیرات کا جائزہ بھی لیتے ہیں، مگر حزن و یاس کی دبی دبی لہریں اشعار کے پس پردہ ضرور محسوس ہوتی ہیں۔ یہ شعرا نہایت کس مپرسی کے عالم میں حکومت وقت کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہیں، بیرونی حملہ آوروں کے مظالم کا سماں باندھتے ہیں اور انگریزوں کی مکاری و سفلہ پنی کے واقعات سناتے ہیں ــ لیکن ان کی یہ تمام تر پیش کش ڈیڑھ سو سالہ دور زبوں کا محض نوحہ نظر آتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے یہاں سرگرم آرا ہونے، قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور ملک کو بیرونی تسلط سے محفوظ رکھنے کا رجحان نظر نہیں آتا۔ پھر بھی ہم ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کی اردو شاعری کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ حسن و عشق کی روایات سے ہٹ کر انھوں نے ایسی شاعری کا ڈول ڈالا ہے، جس نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ابھرنے والے شعرا کے لئے اجتہاد و عمل کی راہ آسان بنادی ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ کچھ کہنا زبان کٹنے کے مترادف تھا، اور اس دور کے پہلے شاعر[1] کا حشر بھی یہی ہوا، انہوں نے کہیں ایہام کی صورت میں، کہیں استعارہ و کنایہ کے انداز میں اور کہیں صریح و واشگاف لہجے میں ڈیڑھ پونے دو صدی کی المناک داستان بیان کر دی ہے اور اس طرح اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔"[2]

آئیے، اب ہم ان شعرا کے کلام کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ انہوں نے اپنے

---

۱ بدنام زمانہ شاعر جعفر زٹلی جو فرخ سیر کا "سکہ" لکھنے کے جرم میں گردن زدنی قرار پایا۔ اگلے صفحے پر اس کے کلام کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۲ عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۱۴۹

فکر و فن کے ساتھ کہاں تک انصاف کیا ہے اور ماحول و معاشرے کی کس درجہ عکس بندی کی ہے۔ ہر چند اس طویل دور کی شاعری کا احاطہ ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتا، لیکن اس کے پس منظر کے طور پر قابل مطالعہ ضرور ہے۔

میر جعفر زٹلی (م: ۱۷۱۳ء) اس دور کے شعرا میں سب سے پہلے ہماری نظر "بدنام شاعر جعفر زٹلی"[1] پر پڑتی ہے جسے کسی نے "دریدہ دہن و شوخ مزاج"[2] کہا اور کسی نے "نادرۂ زمان و اعجوبۂ دوران"[3] کے خطاب سے نوازا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے ایک "فحش نگار یاوہ گو قرار دے کر تاریخوں میں جگہ نہیں دی گئی"۔[4] اہلِ ثقہ نے اسے ہمیشہ نظر انداز کیا، اس لئے کہ اس کا کلام پھکڑپن اور "غیر شریفانہ الفاظ"[5] پر مشتمل تھا، اور جس کے متعلق اعظم شاہ کا قول تھا کہ اگر جعفر میں زٹل نہ ہوتی تو ملک الشعرائی کے قابل تھا۔[6] بہر حال، اس کا کلام کسی درجے کا بھی ہو، "ہم اس سے اعراض نہیں کر سکتے"۔[7] جعفر کو سیاسی شاعری کا پہلا نمایندہ شاعر سمجھنا چاہیے جس نے اپنے دور کے سیاسی و معاشی حالات پر دل کھول کر طنز کیا ہے۔[8]

۱۔ چند، ڈاکٹر گیان: دلی کی مثنویاں، مطبوعہ نگار، لکھنؤ، اصناف سخن نمبر، ص ۷۷

۲۔ شفیق، لچھمی نرائن: چمنستانِ شعرا، ص ۶۷

۳۔ میر، میر تقی: نکات الشعرا، ص ۴۱

۴۔ حسین، پروفیسر سید احتشام: اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقا، مطبوعہ نگار، ایضاً، ص ۱۳۳

۵۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل: تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص ۶۴۵ ح

۶۔ شفیق، لچھمی نرائن: ایضاً، ص ۶۸

۷۔ شیرانی، حافظ محمود خان: پنجاب میں اردو، ص ۲۵۸

۸۔ حقی، شان الحق: نکتۂ راز، ص ۳۱۱

جس کی شاعری میں اس دور کی روح بولتی نظر آتی ہے۔[1] جس نے اپنے کلام میں ماحول کے گھناؤنے اور ناپسندیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس نے سرمدو منصور کی طرح حق گوئی کو اپنا وطیرہ بنایا اور اس کی پاداش میں صلیب و دار کا نشانہ بنا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرکزی حکومت کو تیزی سے زوال آیا۔ ہر سو افراتفری پھیل گئی۔ معاشرہ زبوں حال ہوگیا۔ زندگی سراپا بے چین و مضطرب بن گئی۔ اطمینان و سکون ناپید ہوگیا۔ لوگ توپ و تفنگ کے سائے میں میٹھی نیند کو ترس گئے۔۔۔ زٹلی نے ان حالات و کوائف کو دائرۂ تحریر میں لا کر شاعری سے وہی کام لیا ہے جو مورخ تاریخ سے لیتا ہے۔ مرثیۂ اورنگ زیب کے کچھ اشعار دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ یہ مخمس ذکار کیا اپنے وقت کی "ایک تیز اور جاندار آواز"[2] نہیں:

دریغا عدل و دیں بے او دو نیم است

عروس سلطنت بے او سقیم است

دریغا رونقِ باغِ جہاں رفت

دریغا آبروئے میر و خاں رفت

اکل بے کل ہوا سنسار سارا

بخوں تیار شد مریخ تارا

برکت کے آنسوؤں جگ رووتا ہے

نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے

---

[1] جالبی، ڈاکٹر جمیل: تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، ص ۶۴۳

[2] ایضاً، ص ۶۴۰

صدائے توپ و بندوق است ہر سو
بہ سر اسباب و صندوق است ہر سو
جھٹا جھٹ و پھٹا پھٹ است ہر سو
کٹا کٹ و لٹا لٹ است ہر سو
بہ ہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است
اوچھل[1] چال و تبر خنجر کٹار است

جب ملک میں انتشار و بدنظمی کا دور دورہ ہو، جب مرکزیت پارہ پارہ ہو گئی ہو، جب ہر طرف مطلق العنانی اور طوائف الملوکی کا سماں ہو، اس وقت مالیاتی و معاشی نظام کا بگڑنا لازمی ہے۔ جب ایسی صورت ہو کہ سرکاری خزانہ ہی خالی ہو گیا ہو اور "جود و سخا" کی فضا مسموم ہو کر رہ گئی ہو، تب عوام کے سامنے روزی کے سارے دروازے بند ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس خالص اقتصادی موضوع کو جس فنکارانہ انداز میں جعفر زٹلی نے پیش کیا ہے، یہ اس کی قادر الکلامی ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ وسعتِ نظری کی بھی دلیل ہے۔ اس نوع کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر صبح ڈھونڈیں نوکری، کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھوییں لاکڑی، یہ نوکری کا خطا ہے
صاحب عجب بیداد ہے، محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے، یہ نوکری کا خطا ہے

---

[1] بعض کتابوں میں یہاں لفظ اچپل استعمال ہوا ہے، لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے کہ جنہوں نے انڈیا آفس لائبریری کے نسخے کو بنیاد بنا کر "کلیاتِ جعفر زٹلی" مرتب کیا ہے، "تاریخ ادب اردو" جلد اول کے صفحہ نمبر ۶۴۳ پر یہی لفظ تحریر کیا ہے۔

ہم نام کوں اسوار ہیں، روزگار میں بے زار ہیں

یاروہمیشہ خوار ہیں، یہ نوکری کا خط ہے

یہ واضح حقیقت ہے کہ جب لوگ معاشی بدحالی کا شکار ہوں، تلاشِ روزگار میں حقیر و خوار ہوتے ہوں اور کوئی پرسانِ حال ہو نہ فریادرس تو اس وقت اخلاقی اقدار کا بگڑنا لازمی اور اخلاص و محبت کا عنقا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ ایک عمرانیاتی مسئلہ ہے جو ایسے پرآشوب وقت میں ہمیشہ سر اٹھاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے یاوہ گو شاعر زٹلی نے اس عمرانیاتی مسئلے کو بھی اپنے فکروفن کا موضوع بنایا ہے ؎

گیا اخلاص عالم سے، عجب یہ دور آیا ہے

ڈرے سب خلق ظالم سے، عجب یہ دور آیا ہے

بہت سے مکر جو جانے، اوسی کو سب کوئی مانے

کھرا کھوٹا نہ پہچانے، عجب یہ دور آیا ہے

چغل کرتے پھریں چغلے، بھکل کرتے پھریں بھکلے

دغل کرتے پھریں دغلے، عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری

محبت اٹھ گئی ساری، عجب یہ دور آیا ہے

یہی وہ جاں گسل دور ہے جب فرخ سیر اُس سلطنتِ دہلی کا فرماں روا بنتا ہے جہاں دولت و ثروت کے انبوہ کے متعلق تقریباً ستر سال قبل عیسائی راہب منیرق نے لکھا تھا کہ "تاجروں کے گھروں میں سکوں کا اس قدر ڈھیر ہے کہ اگر انہیں زمین پر بکھیر دیا جائے تو دیکھنے والوں کو غلے کا انبار گراں نظر آئے۔"[1]

---

[1] منقول قریشی، اشتیاق حسین: The Administration of the Mughal Empire، ص ۲۵۷

قدرت کی ستم ظریفی قابل دید تھی کہ جب فرّخ سیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو ساکھ بگڑی ہوئی تھی، خزانہ خالی تھا اور سکّوں کا انبوہِ گراں ناپید ہو چکا تھا۔ بادشاہ کی اس تنگ دستی و تنگ دامانی پر زٹلی نے طنز کے تیر چلانے اور تنک آمیز قہقہہ لگانے سے بھی گریز نہیں کیا ؎

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
پادشاہے تسمہ کش فرخ سیر

گندم و موٹھ و مٹر کا سکّہ لکھنے کے جرم میں یہ مجوبۂ روزگار شخص گردن زدنی قرار پایا اور اس کی آواز ہمیشہ کے لئے دبا دی گئی۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں:

"جعفر کی آواز ایک ایسے انسان کی آواز ہے جو اپنی آنکھوں سے معاشرے کی گرتی ہوئی دیوار کو دیکھ کر غم و غصّہ میں زور زور سے قہقہہ لگا رہا ہے وہ اس لئے ہنس رہا ہے کہ آپ کو رلائے۔ وہ اس لئے چیختا اور چنگھاڑتا ہے کہ معاشرے کے بہرے کانوں تک اس کی آواز پہنچ سکے"۔[1]

لیکن افسوس کہ یہ آواز سالہا سال تک معاشرے کے بہرے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔

ولی دکنی (م: ۱۷۲۰ء – ۱۷۲۵ء کا درمیانی عرصہ)[2] جیسا کہ ہم برِّعظیم میں انگریزوں کی آمد کے ضمن میں تفصیلی بحث باب دوئم میں کر آئے ہیں، وہ بہ حیثیت تاجر

---

[1] جالبی، ڈاکٹر جمیل: تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص ۶۴۲

[2] ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہی تحقیق ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو: ایضاً، ص ۵۳۵ و بعدہٗ

جہانگیر کے عہد حکومت میں ہی یہاں آچکے تھے اور سورت کے مقام پر انہیں اپنی فیکٹری قائم کرنے کا سرکاری اجازت نامہ بھی مل گیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے ابتدائی دور میں ان کا ذکر ولی دکنی کے کلام میں مختصراً ملتا ہے۔ واضح رہے کہ اس شاعر کا مقام اردو غزل گوئی میں اول درجے کا ہے۔ اس نے ہیئت اور موضوع' زبان اور بیان' ہر لحاظ سے اس صنف سخن کو تاب و توانائی بخشی ہے۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے وہ اردو شاعری کا باوا آدم[1] کہلاتا ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ ولی کو اپنے کلام میں فرنگیوں کا ذکر کرنے میں بھی اولیت حاصل رہی۔

ولی نے غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی تھی اور قطعات بھی لکھے تھے جن میں "تعریف شہر سورت" قابل ذکر ہے[2]۔ اسی قطعہ میں جہاں وہ اس شہر کی تعریف و توصیف بیان کرکے اپنے قلبی لگاؤ اور والہانہ شیفتگی کا اظہار کرتے ہیں' وہاں انگریزوں کے متعلق مندرجہ ذیل دو شعر کہہ کر ان کے کردار و گفتار اور اعمال و اقوال کا صحیح تجزیہ بھی پیش کردیتے ہیں۔ یہ ذہن نشیں رہے کہ ولی دکنی کا زمانہ برعظیم میں فرنگیوں کے قیام کا ابتدائی زمانہ تھا اور ان کی فطری جبلت سیاسی رنگ روپ میں ابھی نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ مگر جمال پرست ولی کی نگہ دوربین نے بیرونی تاجروں کے باطن کا مشاہدہ قبل از وقت کرلیا تھا ؎

فرنگی اس میں آتے ہیں کلہ پوش

عدد وہاں جن کی گنتی میں ہے بے ہوش

---

[1] آزاد' محمد حسین: آب حیات' ص ۸۸

[2] جالبی' ڈاکٹر جمیل: تاریخ ادب اردو' حصہ اول' ص ۵۵٦

دگراں میں فرنگی بے عدد ہیں
کہ قول و فعل میں مکروہ و بد ہیں

اردو کے صفِ اول کے شاعر نے انگریز تاجروں کے قول و فعل کے متعلق جو پیش گوئی کی تھی، وہ آگے چل کر حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

شاہ مبارک آبرو[2] (م: ۱۷۵۰ء[1]) اردو کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ وہ غزل گوئی میں استعارات و ایہام کی وجہ سے ایک امتیازی مقام کے حامل قرار دیے جاتے ہیں۔ سترہویں صدی کے اواخر میں بمقام گوالیار پیدا ہوئے۔ عنفوانِ شباب ہی میں دہلی آگئے اور زندگی کا بقیہ حصہ یہیں گزرا۔[3] گرچہ ایک مثنوی "آرائشِ معشوق"[4] کے نام سے لکھی تھی، مگر غزل ہی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور معشوق کے حسن و جمال کی یوں مدح سرائی کرتے رہے ؎

تمہارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے

بایں ہمہ اپنے ماحول اور معاشرے سے الگ تھلگ نہیں دکھائی دیتے۔ وہ ذوقِ جمال رکھنے کے باوجود کارکنانِ سلطنت پر طنز کے تیر برسانے سے نہیں چوکتے ؎

آدمی درکار نئیں سرکار میں حیواں ڈھونڈ
کون پوچھے یاں سپاہی کے نئیں گھوڑا نشی

جب شہنشاہ ہند کے تن و بازو میں قوت نہیں رہی، جب حکومتِ وقت کی دماغی

---

[1] رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے "مختصر تاریخ ادب اردو" میں یہی تاریخ درج کی ہے۔ لیکن شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اپنے مضمون "شعرائے متقدمین" (مطبوعہ نقوش لاہور، غزل نمبر ص ۶۵۰) میں ۱۷۴۳ء تحریر کیا ہے۔
[2] آزاد محمد حسین: آبِ حیات، ص ۹۷
[3] عبدالحیٔ، حکیم سید: گلِ رعنا، ص ۱۰۷
[4] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، اردو ترجمہ محمد عسکری، ص ۸۵

طاقت کمزور ہو کر رہ گئی اور جب سپاہیوں کو منظم و مستحکم کرنے کی تدبیریں اختیار کرنا چھوڑ دی گئیں، اسی لمحے بیرونی حملہ آور ظلم و استبداد کا بازار گرم کرنے در آئے۔ آبرو نے ایسے عمّال حکومت کی خوب خبر لی ہے جو عوام کی عزت و آبرو کا تحفّظ تک نہ کر سکے ۔

میرزائی سے ہوئے نامرد دلّی کے امیر

نازکے مارے پھری جاتی ہے نرگاں کی پناہ

زبانی ہے شجاعت ان سبھوں کی

امیر اس جگ کے ہیں سب شیر قالیں

معاشی حالت کے ابتر ہو جانے کی صورت میں کسب زر کے ذرائع باقی نہیں رہے تھے اور لوگ ناقہ مستی دور کرنے کی غرض سے کاسۂ گدائی اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ آبرو اس معاشی و معاشرتی پہلو کو اپنی غزل کے شعر میں بڑی خوبصورتی سے اجاگر کر رہے ہیں۔ آپ کو اس لب و لہجے اور رنگ و آہنگ کا خالص اقتصادی شعر کسی دوسرے غزل گو کے یہاں مشکل ہی سے ملے گا ۔

یہ جانیو ہر ایک سے لالچ نہیں ہے خوب

ہے بھیک مانگ کھانا بھلا اس کسب سیتی

معشوق کے ظلم و ستم کا رونا کس شاعر کے یہاں نہیں۔ مگر آبرو کا درج ذیل شعر ملاحظہ کیجئے اور پھر فیصلہ صادر فرمایئے کہ کیا عاجزوں کو بے گنہ آزار دینے والے پری وش کے پردے میں کوئی اور تو نہیں؟۔ کیا یہ استعارہ کسی تاریخی واقعہ کا غماز تو نہیں ۔

عاجزوں کو بے گنہ آزار دینا خوب نئیں

ڈر خدا سے آبرو کو مت ستارے اس قدر

مغلیہ دور کے زوال کی دلّی کیسی تھی، معاشرہ کس نوع کا تھا اور معیشت کس طرز کی تھی، کچھ اس کا اتہ پتہ آبرو کے کلام سے ہمیں ملتا ہے۔ ان کے یہ اشعار اٹھارہویں صدی کے درمیانی عرصے کی تخلیق ہیں، لیکن ذرا دیکھئے، ماحول کیسا جیتا جاگتا نظر آرہا ہے ؎

دلّی میں درد دل کوں کوئی پوچھتا نئیں
مجھ کو قسم ہے خواجہ قطب کے مزار کی

حسن ہے پر خوب رویوں میں وفا کی خو نئیں
پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نئیں

جب آبرو نوجوانی میں دلّی آئے تھے، وہ عہد عالمگیری تھا۔ سکھ اور چین کے لمحات میسّر تھے۔ مگر اب، خوشی اور شادمانی کا زمانہ بیت گیا ہے اور یہ غزل گو بڑے کرب، بڑے دکھ کے ساتھ یہ صدا لگا رہا ہے ؎

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وہ ہائے عاشقی کے زمانے کدھر گئے

شاکر ناجی (م: ١١٦٨ھ/ ١٧٥۴ء[1]) جنہوں نے غزل کے بانکپن کو اپنے

---

[1] قدیم تذکروں میں یہی تاریخ درج ہے، مثلاً میر: نکات الشعرا، ص ٢٣؛ حسن: تذکرہ شعرائے اردو، ص ١۵٩؛ لطف: گلشن ہند، ص ١٧٢؛ شیفتہ: گلشن بیخار، ص ٢٢٠؛ نساخ: سخن شعرا، ص ۵٨٧۔ مزید براں، "گل رعنا" کے مصنف حکیم عبدالحی (ص ١١٣) اور صاحب "تاریخ ادب اردو" رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں (ص ٩٣) کہ نوجوانی کے عالم میں انتقال کیا ــــ حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریخ اور یہ خیال، دونوں درست نہیں۔ جب یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے وقت (١٧٣٩ء) ناجی محمد شاہی لشکر میں شریک تھے اور داروغہ کے عہدے پر تعینات، تو یہ زمانہ ان کے بچپن کا نہیں رہا ہوگا۔ یقیناً اس وقت شاکر ناجی جوان ہوں گے۔ حملۂ نادری کے بعد کے حالات پر مبنی جو مخمس انہوں نے لکھا تھا اس کا یہ مصرع "لڑے ہوئے تو بیس برس ان کو بیتے تھے" کھل کر یہ بتا رہا ہے کہ یہ نظم ١٧۵٩ء میں لکھی گئی ہوگی۔ اس لحاظ سے ناجی کا انتقال ١٧٦٠ء میں واقع ہو سکتا ہے۔

اشعار میں قائم رکھا۔ اتفاق سے سپاہی بھی تھے[1] اور اپنی نادری حملے کا بہ نفسِ نفیس مقابلہ بھی کرنا پڑا[2]۔ برقِ نادری کے گرنے کے بعد شہر جس طرح تباہ و برباد ہوا، معاشرت جس طرح بگڑی اور دربار کا رنگ جس طرح پھیکا پڑا، ان تمام واقعات و حالات کو ناجی نے اپنے ایک طویل مخمس[3] میں پیش کیا ہے۔ اس کی اہمیت دو وجوہ کی بنا پر دو چند ہو گئی ہے۔ اول تو اس کے مطالعے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آپس کی خانہ جنگی نے مرکزی طاقت کو کمزور کر دیا تھا اور امرائے سلطنت تعیش پسند ہو گئے تھے۔ دوسرے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اس مخمس نے شہر آشوب کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "اردو شہر آشوب نویسوں کے لئے دلیلِ راہ ثابت ہوا"[4]۔ ہم یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ملک کی سیاسی و اقتصادی کیفیت و حالت کو مفصل اور واضح انداز میں پیش کرنے کے لئے یہ صنفِ سخن بے حد ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔

شاکر ناجی کے متذکرہ مخمس کے دو بند محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں نقل کئے ہیں۔ راقم الحروف بھی نقل کی اس روایت کو آگے بڑھا رہا ہے[5]

لڑے ہوئے تو بیس برس ان کو بیتے تھے

دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۹۳

[2] آزاد، محمد حسین: آبِ حیات، ص ۱۰۵

[3] ایضاً

[4] عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد: بحث و نظر، ص ۴۹

[5] محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" (ص ۱۰۵)، حکیم عبدالحی کی "گل رعنا" (ص ۱۱۳) اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی "بحث و نظر" (ص ۴۸) میں یہاں لفظ "تو" نقل ہوا ہے، لیکن ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنی کتاب "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" کے صفحہ نمبر ۱۴۴ پر لفظ "نہ" لکھا ہے۔

شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے

گلا میں ہنسلیاں[1] بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مرنا بہنپ تو ٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ دانا تھا
ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دکاں[2] نہ غلہ نہ بقال

دستیاب شدہ ان اشعار نے شاکر ناجی کو بلا ریب اردو شعر و ادب میں صاحبِ سیف و قلم کا رتبہ دے دیا ہے۔

بے نوا (م: ؟) کے متعلق میر حسن دہلوی نے تذکرہ شعرائے اردو میں لکھا ہے: "در اوائل سلطنتِ محمد شاہ در شاہ جہان آباد آمدہ ظریف الطبع بود۔ ساکن قصبہ سنام"[3] جیسا کہ ظاہر ہے محمد شاہ کا زمانہ ۱۷۱۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ بے نوا اس کے جلوس سلطنت کے بعد ہی سنام سے دہلی آئے ہوں گے۔ انھوں نے اس دور کے ایک تاریخی واقعہ کو مخمس میں پیش کرکے ایک تاریخ ساز خدمت

شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے
گلا میں ہنسلیاں[1] بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مر جا ہیں تو ٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ دانا تھا
ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دکاں[2] نہ غلہ نہ بقال

دستیاب شدہ ان اشعار نے شاکر ناجی کو بلا ریب اردو شعر و ادب میں صاحبِ سیف و قلم کا رتبہ دے دیا ہے۔

بے نوا (م: ؟) کے متعلق میر حسن دہلوی نے تذکرہ شعرائے اردو میں لکھا ہے: "در اوائل سلطنت محمد شاہ در شاہ جہان آباد آمد۔ ظریف الطبع بود۔ ساکن قصبہ سنام"[3] جیسا کہ ظاہر ہے، محمد شاہ کا زمانہ ۱۷۱۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ بے نوا اس کے جلوس سلطنت کے بعد ہی سنام سے دہلی آئے ہوں گے۔ انھوں نے اس دور کے ایک تاریخی واقعہ کو مخمس میں پیش کر کے ایک تاریخ ساز خدمت انجام دی ہے۔ اس زمانے میں قتل کا ایک ایسا جرم سرزد ہوا جس میں ایک جوہری

---

[1] محمد حسین آزاد نے "آب حیات" (ص ۱۰۵)، ڈاکٹر اعجاز حسین نے "مختصر تاریخ ادب اردو" (ص ۵۹) اور حکیم عبد الحیٰ نے "گل رعنا" (ص ۱۱۴) میں یہی لفظ نقل کیا ہے، لیکن حکیم قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" جلد دوم (ص ۲۵۸)، ڈاکٹر سید عبد اللہ نے "بحث و نظر" (ص ۴۸) اور ڈاکٹر معین الدین عقیل نے "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" (ص ۱۸۶) میں "ہیکلیں" لکھا ہے۔ ہندی مزاج کے پیش نظر یہاں ہنسلی کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔

[2] امر تعجب ہے کہ صاحب "گل رعنا" نے یہاں لفظ "مکان" نقل کیا ہے جو ترتیب و تسلسل کے لحاظ سے نامناسب ہے۔

[3] حسن، میر: تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۲۶

سزا کا مستحق ٹھہرا۔ لیکن اس نے ایک ایسے شخص کے یہاں پناہ لے لی، جس نے محمد شاہ کے حکم کے باوجود مجرم کو قمرالدین خان نامی وزیر کے سپرد کرنے سے صریح انکار کر دیا اور حکومت وقت کچھ نہ کر سکی۔[1]

فوجداری کے ایسے واقعات ہر دور میں پیش آتے رہے ہیں، اور جب تک انسان میں وحشیانہ جبلتیں قائم ہیں، رونما ہوتے رہیں گے۔ سوال واقعہ کی نوعیت کا ہے، مغل شہنشاہ کی حکم عدولی کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ کا کہیں بھی رعب و دبدبہ قائم نہ تھا، حتیٰ کہ اس کا وزیر بھی سراسر بے زور و بے اثر تھا۔ جبھی تو قتل کا ملزم شیر افگن کے گھر پناہ گزیں تھا[2] اور سرکاری کارندے وہاں سے اسے نکال نہ سکے۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت میں یوں اہم ہے کہ اس دور کی مغلیہ سلطنت کی بے وقعتی اور بے اثری کو واضح کر رہا ہے۔ بد نظمی کی یہ کیفیت ۱۷۲۹ء کی ہے، یعنی نادر شاہ کے حملے سے دس سال قبل!۔ بقیہ دس سالوں میں بد نظمی یقیناً انتہا کو پہنچ گئی ہوگی جب ہی تو بیرونی حملہ آور نے دلّی کو ویران و برباد کر دیا اور شاہی فوج مدافعت تک نہ کر سکی۔

قتل کے واقعہ کو بے نوا نے ایک مخمس کی شکل میں پیش کر کے اس دور کی سیاسی بد نظمی، عمّال حکومت کی بے اثری اور شاہ دہلی کی بے وقعتی کو ظاہر کر دیا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں محمد شاہی دور کی منہ بولتی تصویر ہے۔ آیئے اس تصویر کی کچھ جھلک ہم بھی دیکھ لیں ؎

یہ کیا ستم ہے اے فلک ہرزہ نابکار   مریخ پھر کے تیز کیا ہے خنجر کی دھار

---

[1] صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث: جرأت: ان کا عہد اور شاعری، ص ۱۸ و بعدہٗ

[2] جعفری، ڈاکٹر نعیم: شہر آشوب، مطبوعہ اردو، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۷ء، ص ۱۸۵

جوتا فروش مردِ مسلمانِ دین دار ۔۔۔ مردود جوہری نے لیا ہے ستم سے مار

سنگ جفا سے چور کیا لعل آب دار

موچی و لچے اکھٹے اللہ کوں[1] کر کے یاد ۔۔۔ قاضی و کوتوال سوں[2] کرتے پھریں فریاد

کہتے ہیں بادشاہ سیتی[3] دلاؤ ہماری داد ۔۔۔ اکھٹے ہو جور[4] باندھ کفر پر کریں جہاد

تا حشر دینِ محمدؐ ہو برقرار

قاضی و کوتوال و بادشاہ فریاد نہ سن سکے اور قاتل و مقتول کے ہمراہیوں کے مابین سخت جنگ چھڑی اور کشت و خون کا بازار گرم رہا[5]۔ سلطنتِ دہلی کے ضعف و زوال کے باعث اس ہنگامے کا جو نتیجہ نکلا وہ بے نوا کے اس بند میں بخوبی واضح ہے ۔

کتنوں کوں مارجی سے قضا نے گرا دیا ۔۔۔ کتنوں کوں جی بچا کے بہت بڑبڑا دیا

کاغذ یہ بے نوا نے یہ سن کر چڑھا دیا ۔۔۔ لگتے ہی مار جوتیوں سے طرّہ گرا دیا

تا حشر ہر زباں پہ رہے گا یہ یادگار

اشرف علی فغاں (م: ۱۷۷۲ء) بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ جذبے کی صداقت، فکر کی گہرائی اور اظہار کی قوت نے انہیں اس مقام تک پہنچایا کہ سودا اور میر دونوں ان کے معترف تھے۔[6]

---

[1] کو

[2] سے

[3] سے

[4] زور

[5] جعفری، ڈاکٹر تمکین: شہر آشوب، مطبوعہ اردو، کراچی، شمارہ ۱، سنہ ۱۹۷۷ء، ص ۱۸۵

[6] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۹۵

نیز ملاحظہ ہو آزاد، محمد حسین: آب حیات، ص ۱۲۴

فغاں بادشاہ دہلی احمد شاہ، کے رضاعی بھائی تھے۔ ۱۷۵۶ء میں جب
احمد شاہ درّانی حملہ آور ہوا اور دلی ایک بار پھر تاخت و تاراج ہوئی تو فغاں
نہایت دل برداشتہ ہو کر شہر سے نکلے اور مرشد آباد پہنچے۔ پھر وہاں سے
فیض آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد آئے اور وہیں کے پیوند ہوئے[1]۔

دربدری کی یہ ٹھوکر دراصل بگڑے ہوئے معاشرے اور غیر مستحکم سیاسی
نظام کی وجہ سے ان کا مقدر بنی۔ وہ درخت سے جھڑے ہوئے پتّے کی مانند
کبھی یہاں، کبھی وہاں گردش کرتے رہے۔ دربدری کی یہ کیفیت صرف ایک
فغاں کی نہیں تھی، بلکہ ان کی مانند نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو دہلی میں
پناہ و سکون نہ ملنے کے سبب بے سرو ساماں بھٹکے ہوں گے۔ اس بے پناہی
اور بے سکونی کی کیفیت کو جب وہ غزل کے اشعار میں پیش کرتے ہیں تو یہ
محض ان کی اپنی روداد نہیں، بلکہ اس دور میں رہنے والے بے شمار حرماں نصیب
انسانوں کی روداد بن جاتی ہے۔ ذرا دیکھیے، ایک معاشرتی مسئلے کو فغاں
دہلوی تغزل کی جملہ تابناکیوں کے ساتھ کس طرح پیش کر رہے ہیں ؎

کوہ میں مسکن کبھی ہے اور کبھی صحرا کے بیچ
خانۂ الفت ہو ویراں، ہم کو آبادی کہاں

پھر بھیجیو دامن میں فغاں لختِ جگر کو
ہم خانہ بدوشوں کا سر انجام یہی ہے

دلبستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے
گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا

---

[1] قادری، حکیم سید شمس اللہ: اردوئے قدیم، ص ۱۱۵

فغاں نے اپنے اردگرد کے ماحول کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ شاہِ دہلی کی قربت کی وجہ سے زوالِ سلطنت کے مشاہدے کا انہیں وافر موقع ملا تھا۔ قتل و غارت گری کے روح فرسا مناظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے ــــــ یہ سارے مشاہدات و محسوسات فکر کے سانچے میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں تو اس دور کی سچی تصویر نظر آتے ہیں۔ کلامِ فغاں کیا ایک زوال پذیر معاشرے میں رہنے والے انسانوں کی آہ و فغاں کا ترجمان نہیں ؟۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجئے اور پھر فیصلہ صادر فرمائیے کہ نیم وحشی صنفِ سخن کیا تاریخ ساز کام نہیں کر رہی ؟

در و دیوارِ چمن آج ہے خوں سے لبریز
دستِ گلچیں سے مبادا کوئی دل ٹوٹا ہے

بے طرح جوشِ گل نے چمن میں لگائی آگ
ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے

باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے
آنسو کہیں ڈھلک گئے لختِ جگر کہیں

آج تو سنتا ہوں گلشن کے لٹانے کی خبر
آہ کیوں کر لوں میں اپنے آشیانے کی خبر

سیاسی ماحول کی عکاسی درج ذیل شعر سے بہتر اور کس طرح ہو سکتی ہے ؟

یاروں نے سن لیا ہے اسیری کے نام کو
پہچانتے ہیں یہ نہ قفس کو نہ دام کو

اٹھارہویں صدی کے پرفتن دور میں فغاں نے صنفِ غزل کو معاشرے کا جس طرح ترجمان بنایا، وہ ادبِ اردو پر احسانِ عظیم کے مترادف ہے۔

فغاں جیسے غزل گو شاعر کا یہ احسان بھی کچھ کم نہیں کہ انہوں نے شاعری کو حسن و عشق کے موضوع سے ہٹ کر سیاسی آب و رنگ بھی دیا ہے۔ انہوں نے فوج کی بدنظمی کا تذکرہ کرکے اور سپاہیوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچ کر صحیح معنوں میں سلطنتِ دہلی کے ضعف و انتشار کی پول کھول دی ہے۔ علم سیاسیات کا کون طالب علم آج یہ نہیں جانتا کہ جب فوج منظم و مضبوط نہ ہو، اسے جملہ سہولتیں حاصل نہ ہوں اور وہ نان جویں کی محتاج ہو تو ایسے حالات میں ملک و قوم کا دفاع ممکن نہیں ہوتا۔ بیرونی حملے کو روکنا فاقہ زدہ سپاہیوں کے بس کا روگ نہیں ــــ کچھ یہی کیفیت فغاں کے دور میں بھی تھی۔ آئیے ان کی زبانی لشکر کی سرگذشت بھی سن لیں ؎

اعلیٰ سے تابہ ادنیٰ جتنے ہیں گرسنہ ہیں
لشکر میں ہو گئے ہیں بے اعتبار فاقے

کوئی اگر سپاہی سردار سے کہے ہے
لینا خبر شتابی مرتے ہیں یار فاقے

دیوان کے تو در پر دربان یوں کہیں ہیں
کیا ککڑیوں کو کھاویں ہیں چوبدار فاقے

اقبال کے نشاں کو ادبار لے گیا ہے
چپٹ کر گئے پھر پرے ــ ہیں بافدار فاقے

کہتا ہے ساربان تو کیا میں شتر کو لادوں
ہوں ایک دو بلا سے ــ ساری قطار فاقے

فوجی قطار کی یہ فاقہ مستی رنگ لا کر رہی اور سیلابِ بلا چاہے وہ بیرونی رہا ہو یا اندرونی، روکے نہ رکا۔

شاہ حاتم (م: ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء)[۱] نے جس وقت شعور کی آنکھ کھولی' اورنگ زیب کا انتقال ہو چکا تھا۔ مغلیہ حکومت کی جڑیں کمزور ہو گئی تھیں۔ ملک میں انتشار اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ ایسے وقت میں حاتم "تصفیۂ زبان کی طرف"[۲] ہی متوجہ نہیں ہوئے' مخمس اور قطعے کی صورت میں شہر آشوب کو بھی فروغ دیا۔ اس طرح انہوں نے اپنے دور کی سیاسی' سماجی اور معاشی حالت کو واضح طور پر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

حاتم کے شہر آشوب "بارہ صدی" کا بنیادی موضوع وہ سماجی انقلاب ہے جو نادر شاہ درانی کے حملے سے وجود میں آیا تھا' اور جس کے نتیجے میں طبقاتی کشمکش نے سماج میں جنم لیا تھا۔[۳] عوام اقتصادی مسائل کا شکار ہوئے تھے اور روزی کی تلاش میں بے سروساماں ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ عمّال حکومت رشوت خور اور اہل کار چور بن گئے تھے۔ اس زوال پذیر دور کی تصویر حاتم یوں پیش کرتے ہیں ؎

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور
یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور

---

[۱] اگرچہ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" (ص ۱۱۹) میں تاریخ وفات ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء درج کی ہے۔ لیکن ہمیں اس سلسلے میں اکثریت کا فیصلہ قبول کرنا چاہیے جس میں میر تقی میر (نکات الشعرا' ص ۷۹)' میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو' ص ۷۸)' مرزا لطف علی (گلشن ہند' ص ۸۱) اور عبدالغفور نساخ (سخن شعرا' ص ۱۲۰) شامل ہیں۔ ان سبھوں نے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۳ء حاتم کا سال وفات تسلیم کیا ہے۔

[۲] سکسینہ' رام بابو: تاریخ ادب اردو' ص ۸۸

[۳] عقیل' ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ' ص ۱۲۵

یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موت اور گور

یہاں بہنی پہ ہے مدار بخیر دار و مدار

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے

جو چور تھے وہ ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے

جو زبردست تھے سو ان دلوں میں زور ہوئے

جنہوں کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے

جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار

حاتم شریف خاندان کے ایک فرد تھے۔ صاف ستھرے اور پاکیزہ ماحول کے پروردہ تھے۔ تہذیب و تمدن اپنی عزیز تھا۔ لیکن جب معاشرہ بگڑا اور زمانہ ابتر ہوا تو پھر یہ صورت نظر آئی ؎

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ زمانہ اور آیا

دلوں سے مہر گئی، اب جفا و جور آیا

عجیب کیا کریں دنیا کا اور طور آیا

کمینے پھیل گئے پاجیوں کا دور آیا

گلی و کوچوں میں بن کے سجیں دکھاتے ہیں

گو حاتم شاعر غزل تھے اور اپنی اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ ان کی غزلوں کو نغمہ سرایانِ ہند محفلوں میں گاتے تھے[۱] لیکن ارد گرد کے ماحول کی بھرپور عکاسی کے لئے انہوں نے دوسری اصنافِ سخن کو آزمایا اور معاشرے کا جلوہ کچھ اس طرح پیش کیا کہ ان کا کلام اپنے دور کا آئینہ دار بن گیا۔ جس طرح وہ "دہلی

---

[۱] منقول سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادبِ اردو، ص ۸۹

کے رنگ کے موجد ٹھہرے[1]، اسی طرح اردو کی سیاسی، ملّی اور معاشرتی نظموں کے فروغ و ارتقا کا باعث بھی ہوئے۔

ان کا ایک شہر آشوب جو قطعہ کی صورت میں ہے، اورنگ زیب کے بعد کے دور کا صحیح آئینہ دار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی ؎

کیا بیاں کیجئے نیرنگیٔ اوضاعِ جہاں
کہ بیک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں

جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں
پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں

جن کے پوشاک سے معمور تھے توشے خانے
سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں برہنہ عریاں

وے جو بیکار ہیں ان کا تو خدا حافظ ہے
وے بنی نام کو نوکر ہیں تنخواہ کہاں

پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا اس وقت
ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروّت کا نشاں

گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے
کہیں مظلوموں کے رونے سے نہ آئے طوفاں

بادشاہِ وقت اور اس کی سلطنت سے متعلق حاتم واشگاف انداز میں جو کچھ کہہ گئے ہیں، وہ ایک طرح کی رہنمائی تھی۔ اس نوع کے چند اشعار دیکھئے اور طبقۂ متقدمین کے اس بزرگ شاعر کی سیاسی جرأت کی داد دیجئے ؎

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۸۷

دل ہو ویراں ہو نہ گر برجا حواس

سندھ وابستہ ملک سرداراں سے ہے

ایک دم کے بیچ ہو جاویں کئی لشکر تباہ

شاہ جو لیوے نہ اپنی کچھ خبر حب گاہ سے

جو خانہ زاد تھے وہ منصوبوں سے کرتے ہیں راج

غنیم الٹے دیکھو بادشاہ سے لے ہیں خراج

بادشاہ سے کون کون غنیم خراج نہیں لے رہا تھا اور کیا یہی خراج گزاری آگے چل کر غلامی کا طوق نہیں بن گئی؟

مرزا محمد رفیع سودا (م: ۱۷۸۱ء) صف اوّل کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں[1]۔ قصیدہ نگاری میں "اردو کے خاقانی و انوری"[2] تسلیم کئے جاتے ہیں۔ غزل میں ان کا خاص رنگ ہے[3]۔ ہجوگوئی کو رواج دینے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے[4]۔ زندگی بھر امرا کی تعریف و توصیف کے پل باندھتے رہے[5]۔ لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد رونما ہونے والے حالات و واقعات نے انہیں خاموش نہیں بیٹھنے دیا۔ ان کا یہ شعر اپنی جگہ پورے دور تنزل کی ایک تاریخ ہے ؎

کہ ایک شخص ہے بائیس صوبوں کا مالک

رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری سوں

---

[1] بدایونی، ڈاکٹر ضیا احمد: ایران قصیدہ کے ارکان اربعہ، مطبوعہ نگار، اصناف سخن نمبر ۱۹۵۷ء ص ۹۴

[2] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۱۰۸

[3] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۸۰

[4] ایضاً، ص ۸۲

[5] آزاد، محمد حسین: آب حیات، ص ۱۵۰

درج بالا شعر کے پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ ۱۷۰۷ء کے بعد جب سلطنت دہلی کی مرکزیت ختم ہوگئی اور ہر صوبے نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تو حکومت مغلیہ بظاہر بائیس صوبوں پر مشتمل ہونے کے باوجود قلعۂ معلیٰ تک محدود ہوگئی ــــ اور یہ حقیقت ہے کہ پورے برعظیم کے زوال انگریزوں کی فتح و کامیابی اور وطن عزیز کی غلامی و تسخیر کا بنیادی نکتہ یہی بائیس صوبوں پر تصرف کا فقدان تھا۔ اور یہی اہم نکتہ سودا کے درج بالا شعر کی اساس ہے۔

علاوہ ازیں، سودا نے بھی اپنے ہم عصر شعرا کی طرح ملک کی اقتصادی حالت، عوام کی بے اطمینانی و بے سروسامانی، سیاسی عدم استحکام اور قتل و غارت گری کے منظر کو اپنے فکروفن کا موضوع بنایا ہے۔ اس نوع کے دو بند یہاں پیش کئے جا رہے ہیں ؎

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نہ جانے کس نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اگی ہے زقوم
مچا ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول

تو ہی ہیں ملک ہیں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
ٹکے کہاں جو نہیں دے کے ہو انہوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل، نہ کچھ میاں خریف
جو عامل اب ہیں بحالات پر سولوں ہیں خفیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو ادل

سودا زمانے کے حالات وکیفیات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ہر دلعزیز شہر دہلی کا ماتم بھی کرتے ہیں جو بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں تاخت وتاراج ہوئی اور عوام کی امنگوں کا یہ مرکز ڈانواں ڈول ہو کر رہ گیا ؎

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسو عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا
عجیب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

جیسا کہ ہم اس باب کے آغاز میں لکھ آئے ہیں، اس دور کے شعرا حالات و کیفیات کے محض نوحہ خواں نظر آتے ہیں۔ لیکن سودا اپنے معاصرین کی طرح صرف تاسف وتاثر کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ ان سبھوں سے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور بادشاہِ وقت کو آئینِ داوری سکھاتے ہیں۔ اردو شاعری میں اپنی قسم کی پہلی آواز ہے۔ ایک شاعر پہلی مرتبہ گل وبلبل کے موضوع سے ہٹ کر اور نوحہ خوانی کے طرز کو چھوڑ کر سیاسیات^۱ جیسے ہمہ گیر مضمون کا احاطہ کرتا ہے۔ سودا اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ ملک کی طاقت وتوانائی کا سرچشمہ، عوام کی عزت ووقار کا مظہر اور خلقت کے سکون واطمینان کا موجب دراصل بادشاہِ وقت ہے۔ اور سودا اسی شاہِ دوراں سے یوں خطاب کرتے ہیں ؎

کسی گدا نے سنا ہے یہ اک شہ سے کہا
کروں میں عرض گر نہ اس کو سرسری جانے

---

۱ Political Science

امورِ ملکی میں اوّل ہے شہ کو یہ لازم
گدا نوازی و درویش پروری جانے

مقامِ عدل پہ جس دم سریر آرا ہو
ہر ایک خورد و کلاں میں برابری جانے

ملازموں سے یہ لاوے اسی کو بر سرِ کار
کہ جس سے کارِ خلائق کی بہتری جانے

بجا جو طرح سپاہی ہو اس کے سمجھے مرد
نہ یہ کہ مرنے کو بے جا سپہ گری جانے

جو شخص نائب داور کہائے عالم میں
یہ کیا ستم ہے نہ آئین داوری جانے[1]

سودا کے اس قطعہ بند کو اردو کی پہلی سیاسی نظم تصور کیا جائے گا۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ آج سے دو سوا دو سو سال قبل اس دور میں لکھی گئی جبکہ سیاسی شعور سرے سے ناپید تھا۔ مگر سودا نے اس سلسلے میں پہل کر کے حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو اردو کا پہلا عظیم قومی شاعر تسلیم کرا لیا ہے۔ سودا کی عظمت یوں بھی فزوں ہو جاتی ہے کہ وہ مغل تاجداروں خصوصاً فرّخ سیر کے غیظ و غضب اور جاہ و جلال سے پوری طرح واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک ذرا سی گستاخی و بے ادبی پر سر قلم کر دیے جاتے تھے۔ لیکن انہوں نے تاجدارِ ہند کو بہ بانگِ دہل آئینِ داوری کے اسرار و رموز سکھا دیے۔

---

[1] حقی، شان الحق (مرتب): نشیدِ حریت، ص ۳۳ ح

جس وقت مرزا رفیع سودا بادشاہِ دہلی کو آئینِ داوری سکھا رہے تھے، دکن کی سرزمین پر اپنی دھن کا ایک مردِ مجاہد سراپا عزم و ہمت بنا آئینِ داوری کو عملی طور پر برت رہا تھا۔ قوم کا یہ مایۂ ناز فرزند ٹیپو سلطان (م: ۱۷۹۹ء) تھا جو اپنے بہادر اور مرحوم باپ حیدر علی کی اس نصیحت کو مقصدِ حیات بنا چکا تھا:

"وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اب تم وطن کی حفاظت
کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔" [1]

باپ کی زندگی میں وہ مرہٹوں اور انگریزوں سے معرکہ آرا ہوتا رہا تھا اور ہر ہر محاذ پر اس نے اپنی بے مثال بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ اور اب میسور کی گدی پر تخت نشینی کے بعد اس کے عمل میں بلا کی شدّت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ تنہا — مرہٹے، نظام اور انگریز — تینوں سے چومکھی لڑ رہا تھا۔ آخر الذکر ٹیپو کی بے پناہ قوت، اس کے بے پایاں حوصلے اور بیکراں جذبۂ آزادی سے اس قدر ہراساں تھے کہ مرہٹے اور نظامِ دکن دونوں کو اپنی طرف کر لینے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ بنگال کے سراج الدولہ کو شکست دینے کے لیے انہوں نے جو ہتھکنڈے استعمال کیے تھے، انہیں جنوبی ہند میں بھی بروئے کار لانے لگے۔ چنانچہ سازشوں کا جال میسور کی آزادی کے لیے لقمۂ اجل ثابت ہوا اور وطن کا یہ سپاہی وطن کے ناموس و وقار کی حفاظت کرتا ہوا شہید ہو گیا۔

جس وقت شمالی ہند میں اردو شعرا شکست و ریخت کے مرثیے لکھنے میں مصروف تھے، جنوب میں عزم و ہمت کے نغمے الاپے جا رہے تھے، دشمنوں سے معرکہ آرا

---

[1] منقول محمود الرحمٰن، 'آزادی کے مجاہد'، حصّہ دوم، ص ۱۴۳

ہونے کا منظر بیان کیا جا رہا تھا اور اس مردِ غازی کی فتح و نصرت کے کارنامے دہرائے جا رہے تھے۔ اس کی نمایاں مثال مثنوی "اعراب سلطانی" ہے جس کا مصنف حسن علی عزت تھا۔ تذکرہ "طبقات الشعرا" میں کریم الدین نے اس شاعر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> "عزت تخلص حسین علی نام۔ اس مصنف نے ایک تاریخ نظم میں فتوحات ٹیپو سلطان کے کارناموں پر لکھی تھی اور اس میں لڑائی نظام علی خاں اور مرہٹہ وغیرہ کی صراحت ہے۔" [۱]

یہ وہی لڑائی ہے جس میں مرہٹے اور نظام نے ایکا کر کے ۱۷۸۶ء میں یعنی ٹیپو کے تخت نشین ہونے کے چار سال بعد اس کی ریاست پر حملہ کیا تھا۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جب ٹیپو سلطان کو اس حملے کی تیاری کی خبر ملی تھی تو اس نے نظام دکن کو لکھا تھا کہ "اس وقت ہمیں آپس میں لڑ کر اپنی طاقت ختم نہیں کرنی چاہیے ورنہ ہمارا اصلی دشمن (انگریز) اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب متحد ہو جائیں۔" [۲] لیکن اس خط کا کوئی اثر نہیں ہوا اور جنگ شروع ہوئی اور مسلسل چار سال تک چلتی رہی۔ بالآخر مرہٹے اور نظام دونوں کو شکست ہوئی اور ٹیپو سلطان فتح و نصرت سے ہمکنار ہوا۔ [۳]

---

[۱] کریم الدین، مولوی: طبقات الشعرائے ہند، منقول ہاشمی، نصیر الدین: فتح نامہ ٹیپو سلطان، مطبوعہ اردو، کراچی

[۲] مائلز، کرنل ڈبلو (مترجم): History of Tipu Sultan، ص ۷۰

[۳] ایضاً، ص ۹۰

"اضراب سلطانی" کے مصنف نے یہ مثنوی ٹیپو سلطان کے حکم سے لکھی تھی[1] - اس کی زبان دکنی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ آپ پڑھ کر محسوس کریں گے کہ حرکت و عمل کا ایک سماں بندھا ہوا ہے ؎

مرہٹہ مغل[2] فوج سب جمع کر	خوشی ساتھ سلطاں کی سن بدخبر
کئی سب نے لیں شرط سوگند سات	لیویں ملک جلدی سوں اب ہاتے ہات
سبھی ملک و مال و دیار و حصار	دونوں مل لیویں بانٹ ہے یہ قرار
منازل کوں طے کرکے جلد و شتاب	چلے آئے لے چنگ و بین و رباب
پٹن بیچ پہنچی ہے جب یہ خبر	کہ لڑنے کو باندھے ہیں راندان کمر
خوشی سات سلطاں سب فوج لے	ملاقات خاطر انو کے چلے
لئے چوطرف گھیر سب کو ہر سار	ہٹے توڑ سب قلعہ تو پوں سوں مار

شاعر نے ٹیپو سلطان کے بذاتِ خود توپ چلانے کا بھی ذکر اس مثنوی میں کیا ہے ؎

اپس ہات سوں داغ توپاں کنیں	جہنم میں بھیجے بہوت مشرکیں
سر اس کا گیا اور شتاب کے سات	جہنم میں ملنے کو یاراں منگات
زمیں کے اوپر پڑ کے تن تلملا	بہوت سی صعوبت سوں جاں کو دیا
دیکھے اس کا احوال سب مشرکاں	پکارے ہو بیتاب سب الاماں

اس مثنوی کا سب سے اہم اور ہمارے موضوع سے متعلق حصہ وہ ہے جہاں عزت نے فتح ونصرت کی اس خبر سے ارکاٹ میں مقیم اہلِ فرنگ کے

---

[1] ہاشمی، نصیر الدین: فتح نامہ ٹیپو سلطان، مطبوعہ اردو، کراچی جولائی سنہ ۱۹۶۶ء ص ۴۷

[2] آصف جاہ ثانی کی فوج مراد ہے۔

خوفزدہ ہونے کا حال بیان کیا ہے۔

یہ اخبار سب سن کر اہلِ فرنگ ۔۔۔ بنادر میں تصویر سا ہو کے دنگ
رہے کہیو کے سب عقل و تاب و تواں ۔۔۔ خصوصاً کرستان از خوف جاں
سبھی اہلِ کمپیل کے پاس جا ۔۔۔ کیا مشورہ تم کوں کیا سوجتا
وگرنہ یہ ملک و بنادر تمام ۔۔۔ ہمارے سوں لیتے چھین لا کلام
جب آوینگے کر ملک کا بند و بست ۔۔۔ تب ہما کوں دیوینگے آخر شکست

تاریخ شاہد ہے کہ جب انگریزوں نے مرہٹے اور نظام کی متحدہ طاقت کو پاش پاش ہوتے دیکھا تو وہ ٹیپو سلطان کی قوت سے بے حد خائف ہوئے اور یہی وجہ تھی کہ اپنے اس طاقتور دشمن کو زیر کرنے کے لئے انہوں نے دغا و فریب کے اوچھے ہتھیار استعمال کئے ۔

عزت کی یہ مثنوی قدیم دکنی زبان میں ہونے کے باوجود اس دور کی تاریخ کو دہرا رہی ہے جس میں عزم بھی ہے اور حوصلہ بھی! ۔ دشمنوں کو شکست دینے کا جذبہ بھی ہے اور ملک کے دفاع کا ولولہ بھی! ۔ اس معنی میں "فتح نامہ" شمال میں لکھی جانے والی منظومات سے بالکل مختلف ہے ۔

ٹیپو سلطان کی تعریف میں ایک مختصر سا قطعہ بھی ہمیں اسی دور میں ملتا ہے جسے قاضی غلام احمد نے لکھا تھا ۔ شہر کے یہ قاضی بقول نصیر الدین ہاشمی شاعر بھی تھے [1] ۔ اس قطعہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غلام احمد اس صاحب عزم و ہمت اور پیکر جرأت و شجاعت کو کتنی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ یہ مدح مبالغہ آمیز اور پر تصنع نہیں، حقیقت و صداقت پر مبنی

---

[1] ہاشمی، نصیر الدین : ٹیپو سلطان کی علمی اور سماجی خدمات، مطبوعہ ابصار، کراچی، (ٹیپو سلطان نمبر)، ص ۳۱۴

ہے۔ قاضی غلام احمد کے یہ اشعار ٹیپو سلطان کی سچی تصویر پیش کر رہے ہیں ۔

اوشہ کہ جن کی فتح جہاں میں ہے آشکار

تیغ ان کی دشمناں کے یوں سر کوں کرے شکار

روشن کئے ہیں دین کوں توڑے ہیں کفر کوں

کفار ان کے عصر میں ہیں یوں ذلیل و خوار

ہیبت سوں ان کے شاہ فرنگوں کا دل جگر

ٹپکے کہ جیوں کہ شیشہ میں یاقوت خام کار

دکن کی ان ولولہ انگیز نظموں کے مطالعہ کے بعد ہم دہلی کی طرف مراجعت کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس وقت وہاں کیا ہو رہا ہے ۔

جعفر علی **حسرت** (م: ۱۷۹۵ء) دہلی کی تباہی و بربادی دیکھ کر اپنے اس مولد و مسکن سے یہ کہہ کر نکلتے ہیں ۔

مرا دل داغ ہے حسرت جہان آباد کے غم سے

ہزار افسوس یہ گلزار یوں ویران ہو جائے

قائم (م: ۱۷۹۵ء) اور جرأت (م: ۱۸۱۰ء) بھی اپنے اپنے طور پر دل گرفتہ ہیں ۔ لیکن ان سبھوں میں اس دور کی صحیح ترجمانی کا فریضہ حسن و عشق کا شاعر انجام دے رہا ہے ۔ یہ میر تقی **میر** (م: ۱۸۱۰ء) ہیں جن کی آواز اپنے ہم عصروں میں سب سے اونچی اور اثر پذیر ہے ۔ واضح رہے کہ میر اردو غزل کی روح رواں ہیں ۔ ان کے بہتر نشتر آج بھی دلوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے ۔ لیکن انہوں نے عاشق مہجور کی واردات قلبی کے دوش بدوش خارجی حالات و کوائف کو بھی موضوع فن بنایا ہے ۔ معاشی بدحالی و ابتری نے بھی ان کے کلام میں جگہ پائی ہے ۔ نادری حملے کے کرب نے انہیں بھی یہ

کہنے پر مجبور کر دیا تھا ؎

غیر نے ہم کو ذبح کیا ہے نے طاقت ہے نہ یارا ہے
اس کتّے نے کرکے دلیری جسدِ حرم کو پھاڑا ہے

میر جیسے نازک طبع شاعر کا یہ شعر کھل کر اس غیر سے نفرت کو ظاہر کر رہا ہے جس کے "استعماری قدم"[1] ملک و ملّت کو روند رہے تھے۔ وہ لٹیروں اور قاتلوں کے ظلم و سفاکی پر اپنے غم و غصے کے اظہار کے لئے "کتے" جیسا ناشائستہ و رکیک لفظ بھی شعر میں استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے، حالانکہ انہیں اپنی زبان کے تحفظ کا اتنا پاس و لحاظ تھا کہ لکھنؤ کے دوران سفر ایک ہم راہی سے محض اس بنا پر گفتگو نہیں کی تھی کہ "زبان خراب ہوتی ہے۔"[2]

میر نے جاہ و ثروت کے چراغ کو جس طرح بجھتے دیکھا، عیش و مسرت کی محفلیں جس طرح اجڑتے دیکھیں، سکون و طمانیت کو جس طرح زیر و زبر ہوتے دیکھا، معاشرے کو جس طرح بگڑتے دیکھا ــــــ ان تمام تلخ حقائق کا ذکر اپنے کلام میں حسن و خوبی سے کرتے ہیں، وہ ان ہی کا کمال ہے ؎

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یک بارگی

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں
کچھ اس گلی میں ہم ہی نہیں خوار ایک

---

[1] عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۱۶۲
[2] آزاد، محمد حسین: آب حیات، ص ۲۰۴

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ

یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی

انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

آخر الذکر شعر میں مغلیہ دور کے دو فرماں روا فرخ سیر اور احمد شاہ کی طرف اشارہ ہے جنہیں بینائی سے محروم کر دیا گیا تھا۔[1]

دلی جو جاہ و جلال کا مرکز تھی، جہاں عیش و طرب کے شادیانے بجتے تھے، جس پر ہمہ دم نکہت و نور کی بارش ہوتی تھی، جس کے متعلق میر نے کہا تھا ؎

دلی کے نہ کوچے تھے اوراق مصور تھے

جو شکل نظر آتی تصویر نظر آتی

وہی طلسمات کی دلی دیکھتے ہی دیکھتے تیرہ و تار ہو گئی۔ ہر طرف تباہی و بربادی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ میر نے اسی شہرِ منتخب کا نوحہ نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا ہے ؎

اب شہر ہر طرف سے ویران ہو گیا ہے

پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا

اب خرابا ہوا جہان آباد

ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں

تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

---

[1] برگیس، جیمس: *The Chronology of Modern India*، ص ۱۶۰، ۱۹۷۰ء

میر جب ۱۷۸۲ء میں اپنے اس عزیز شہر کو الوداع کہہ کر لکھنؤ پہنچے تو اپنا تعارف دلی ہی کے ناطے سے کرایا مگر کس انداز میں ؎

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اجڑے دیار کا یہ مرثیہ محض میر کے جذبات و احساسات کا ہی ترجمان نہیں، خونچکاں تاریخ کا آئینہ دار بھی ہے۔ اس کے پس پردہ ظلم و جور، فتنہ و فساد، حرماں نصیبی و بدبختی اور ویرانی و بربادی کا ایک سلسلۂ لامتناہی متحرک نظر آتا ہے۔

میر کے زمانے میں برعظیم کے عوام جاٹوں، مرہٹوں، افغانوں اور ایرانیوں کی خوں آشام تلواروں سے جس طرح لرزہ براندام تھے، عورتیں جس طرح ڈری ڈری سہمی سہمی سی تھیں، بچے جس طرح خوف زدہ اور ہراساں تھے، کیا ان سب کے کرب ذہنی کا اظہار میر جیسے بلند پایہ غزل گو کے اس شعر سے نہیں ہوتا ؎

تلوار کے تلے ہی گیا عہدِ انبساط
مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں جوانیاں

سادہ، سلیس، پراثر و پرمعنی الفاظ پر مشتمل یہ "خوبصورت" سے دو مصرعے عوام کی الم انگیز زندگی کی تصویر ہیں۔ خارجی حالات و کیفیات کے صحیح ترجمان ہیں۔ اپنے دور کی یہ ایسی آواز ہے کہ آج بھی اسے سن کر ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔

اس دور کے سیاسی عدم استحکام اور امن و امان کے فقدان کے نتیجے میں

بیروزگاری اور معاشی زبوں حالی کی جو کیفیت رونما ہوئی، اس سے معاشی نظام کے تارو پود کا بکھرنا لازمی تھا۔ بیرونی حملوں کے بعد ملک کے خزانے کو شدید دھچکا پہنچا۔ اس معاشی ابتری سے کیا عوام، کیا فوج، کیا اہلکار ـــــ سبھی متاثر ہوئے۔ میر عشق و جنوں کے شاعر تھے، وصال و فراق کے مصوّر تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ملکی و قومی معیشت کی ابتری اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کو دیکھ کر کیا ہم انہیں سیاسی مبصر[1] ماننے سے انکار کر سکتے ہیں ؎

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش　　آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش　　بے لعب ناں پہ سو جگہ پرخاش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال　　کنجڑے جھینکتے ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال　　ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

[3]جتنے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر　　تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے[4] لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر　　مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں[2] ٹکڑا اگر برابر ماش

غرض میر تقی میر نے زوال آمادہ سلطنتِ دہلی کے انتشار و انحطاط،

---

[1] Political observer

[2] انتخاب کلام میر" مرتبہ مولوی عبدالحق اور "رشید حسرتیں" مرتبہ شان الحق حقی میں لفظ نیچے درج ہے جو نامناسب ہے۔

[3] ایضاً : لفظ "جیسے" نقل ہوا ہے۔

[4] ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مرتبہ کردہ "کلیاتِ میر" میں "جیسے" استعمال ہوا ہے، لیکن عبدالحق اور شان الحق حقی نے یہاں لفظ "جیسی" لکھا ہے۔

سیاہ کی مفلسی و قلاشی، عوام کی اقتصادی و معاشرتی زبوں حالی اور زندگی کی بے کیفی و بے اطمینانی کی جو صحیح تصویر کشی کی ہے، اس نے انہیں اس دور کا ترجمانِ صادق بنا دیا ہے، بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

میر کو اس دور کے احساسِ زوال اور عام انسانی غم و الم کا مظہر کہا جا سکتا ہے"۔[1]

اسی دور میں ہمیں شہر لاہور کا نوحہ بھی سنائی دیتا ہے۔ واضح رہے کہ پنجاب کا یہ دل سکھوں کے ظلم و ستم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دوسرے صوبائی خود مختاروں کی طرح انہوں نے بھی اس خطۂ زرخیز کو اپنے تصرف میں کر لیا تھا اور مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کی توہین بھی کر رہے تھے۔ اس دور کے حالات کا ذکر قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے ایک فارسی مکتوب میں ملتا ہے۔ وہ احمد شاہ درانی کے حملے کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"سابق چند بار احمد شاہ درانی[2] خدائش بیامرزاد در ہندوستان آمد، بہ مسلمانان ضعف تصدیع رسید و ہیچ بند و لبست نشد سرداران مسلمان برہم شدند و ملک لاہور و سرہند در تسلط سکہان رفت۔ مزاراتِ حضرات را شکستند و چپا چپا کردند، ہیچ تدارک نشد"۔[3]

اس خط سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سکھوں کی زیادتی کس قدر بڑھ گئی

---

[1] عبداللہ، ڈاکٹر محمد: بحث و نظر، ص ۳۲۴ [2] درانی کو دورانی لکھا ہے۔

[3] منقول خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: مکتوباتِ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مطبوعہ سہ ماہی اردو، کراچی، شمارہ ۴، بابت اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۳

تھی اور انہوں نے لاہور کو کس کس طرح تباہ و برباد نہ کیا ہوگا۔ اس تباہی و بربادی کا نوحہ ایک مثنوی "مگس نامہ" کی صورت میں سامنے آتا ہے جس کے مصنف مراد شاہ (م: ۱۸۰۰) تھے۔ انہوں نے مکھی کو علامت بنا کر اس دور کے پریشان کن حالات اور ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی ہے[1]۔ چند اشعار کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ دردِ دل کے اظہار میں اس وقت پنجاب پیچھے نہ تھا۔

شہر لاہور قبۂ اسلام — روشن آفاق میں ہے جس کا نام
تھا بہشت بریں بروئے زمیں — محبِ انساں تھے اس مکاں کے مکیں
اولیاء و مشائخ و سادات — علما اک سے اک ستودہ صفات
رشکِ آبادیٔ جہاں تھا یہ — الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ
کوئی اس پہ پڑا جو بوم قدم — ہے اب اس کا وجود رشکِ عدم
نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے — مکھیوں کی غرض دوہائی ہے
زر تو شاہ زماں سدھارے لے — مکھیوں کو گئے اجارہ دے
اسی صورت سے آگے احمد شاہ — بھاگیا چھوڑ چیونٹیوں کی سپاہ
اب ہیں پر مکھیوں سے سب ناچار — ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار

سکھوں کی ظاہری ہیئت کے پیشِ نظر مراد شاہ نے مکھیوں کی جو علامت اختیار کی ہے وہ حد درجہ پر معنی و حقیقی ہے۔ یہ علامتی مگس اجارہ دار بن کر جس طرح اہل پنجاب کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھے اور اعصاب پر جس طرح سوار تھے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ع اب ہیں پر مکھیوں سے سب ناچار۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی میں بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "اظہار جذبات کے ساتھ ایک دنیا کے

---

[1] جالبی، ڈاکٹر جمیل: تاریخ ادب اردو، ص ۶۶۱

سمجی نظر آئے گی۔[1]

انیسویں صدی کے ابتدائی دور تک کے جن شعرا کا جائزہ لیا جا چکا ہے وہ یا تو غزل گو تھے یا قصیدہ نویس یا پھر مثنوی نگار۔ ان کی شاعری تمام تر انہی اصنافِ سخن کے گرد گھومتی ہے۔ البتہ انہوں نے زمانے کے حالات و کیفیات اور معاشی و معاشرتی تغیرات کو اپنے اپنے فارم میں ضرور پیش کیا ہے۔ اور یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان شعرا کا کلام تاریخی و سیاسی دونوں لحاظ سے بڑی قدر و منزلت کا حامل ہے۔

اب ہم جس شاعر کا تذکرہ کرنے جا رہے ہیں اسے ایک زمانے تک تذکرہ نویسوں نے نظر انداز کیا، حتّٰی کہ اسے شاعر ماننے سے بھی گریز کیا جاتا رہا[2] اور اس کی شاعری سے بے اعتنائی برتی گئی[3]۔ اس لئے کہ اس کے یہاں حسنِ تغزل نہ تھا، قصیدے کا طمطراق نہ تھا، مثنوی کی سبک خرامی نہ تھی، طرزِ لکھنؤ کی رنگینی نہ تھی[4]، شعرائے دہلی کی طرح فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کا شوق نہ تھا[5] ــــــ لیکن زمانہ گزرنے کے بعد یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ اپنے دور کی ایک آواز تھا، اپنے زمانے کی جیتی جاگتی تصویر تھا اور اپنے معاشرے کی سچی تاریخ تھا۔ وہ عظیم شاعر اکبرآباد کے نظیر تھے (م: ۱۸۳۰ء)۔

---

[1] جالبی، ڈاکٹر جمیل: تاریخ ادب اردو، حصہ اول، ص ۶۶۲

[2] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۱۱۴

[3] احمد، کلیم الدین: اردو شاعری پر ایک نظر، ضمیمہ، ص ۲

[4] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ترجمہ مرزا حسن عسکری، ص ۲۸۹

[5] ایضاً

نادر شاہ درّانی کے حملے کے وقت انہوں نے دلّی میں آنکھ کھولی۔ جب سنِ شعور کو پہنچے تو اس شہر کو تباہیوں کی لپیٹ میں دیکھا۔ پھر ان کی نظر کے سامنے احمد شاہ ابدالی نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اب اس دارالخلافہ میں کہیں جائے پناہ نہ تھی۔ نظیر اپنی والدہ کو لے کر آگرہ پہنچے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

دلی سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے نہ اس اسکول کی پیروی کی نہ لکھنؤ کے مکتبۂ فکر کو اپنایا' بلکہ اپنی جدّت پسندی کو راہ دیتے ہوئے سب سے الگ ایک طرزِ سخن اختیار کیا جس کی تمام تر بنیاد ملک' قوم' ماحول' معاشرہ اور گرد و پیش پر قائم ہے۔ ان کی شاعری نہ تو درباری رنگ سے مزیّن ہے نہ سلاطین کی جاہ و حشمت کے ذکر سے مملو!۔ نظیر کا محورِ شاعری محض عوام ہیں۔ ان کا مرکزِ فکر اپنی زمین' اپنی فضا' اپنی ثقافت اور اپنا نظریۂ زندگی ہے ۔۔۔ انہی خصوصیات نے نظیر کو زندگی اور اس کی قدروں سے قریب تر کر دیا جس کا لازمی نتیجہ' انقلاب و تغیرات سے ان کی گہری واقفیت' معاشرے پر ان کی مضبوط گرفت اور سیاسی نظام پر ان کی بھرپور نظر تھی۔

عوام کی قربت نے انہیں عوامی مسائل سے بخوبی آگاہ کر دیا تھا۔ ان میں اہم مسئلہ اقتصادیات کا تھا۔ نظیر کے کلام میں دوسرے موضوعات کی نسبتاً یہ موضوع زیادہ نمایاں ہے[1]۔ سیاسی انتشار کے باعث قوم جس معاشی بدحالی کا شکار تھی' اس کی جھلک ان کے کلام میں یوں ملتی ہے ؎

کیا تونگر کیا غنی کیا پیر اور کیا بالکا
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

---

[1] عقیل' ڈاکٹر معین الدین: تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ' ص ۱۷۷

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں مانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

کاندھے پہ تیغ دھرتے ہیں روٹی کے واسطے

آپس میں خون کرتے ہیں روٹی کے واسطے

نظیر نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کو یہ نظریہ دیا کہ قوم کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے، اور اس معاشی بدحالی میں اس کا حصول ناممکن بن گیا ہے، اس لئے کہ زر ناپید ہے۔ ہر فردِ بشر اسی کی تلاش میں بے چین و مضطرب نظر آتا ہے ؎

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر

ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

اس کساد بازاری میں جبکہ روزی کے وسائل معدوم ہو چکے تھے، لوگ حصولِ زر کے لئے اس درجہ سیماب پا تھے کہ حلال و حرام کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی۔ یہ بات بجائے خود اخلاق گراوٹ کے مترادف تھی۔ نظیر نے اس اقتصادی و اخلاقی سقم کو اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے ؎

سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانا کہ کچھ حرام ہے

جو جس سے ہو سکا کیا پیٹ کے لئے

برعظیم پاک و ہند کے دوسرے شہروں کی طرح آگرہ بھی اس دور میں اقتصادی بدحالی، معاشرتی ابتری، معاشی خستہ حالی اور سیاسی عدم استحکام کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اپنے طویل مخمس میں انہوں نے زریں تاج محل والے شہر کے تیرہ و تار ماحول کو بخوبی عیاں کر دیا ہے ؎

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند

رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن و فکر کا ہے موج دار بند
ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو کاروبار بند

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ
وہ باغ کس طرح نہ لٹے نہ اجڑے آہ
جس کا نہ باغباں ہو نہ مالک نہ خار بند

نظیر اکبرآبادی اپنی منظومات میں صرف ماحول کی عکاسی ہی نہیں کرتے، ایک عوامی شاعر ہونے کے ناتے عام مزدوروں، پیشہ وروں اور نچلے طبقے کے لوگوں کی کس مپرسی اور زبوں حالی کو بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس انقلاب سے صرف امرا، رؤسا اور عمائدین سلطنت ہی زیر و زبر نہیں ہوئے، چھوٹے چھوٹے ادنیٰ لوگ بھی جو آبادی کا کثیر حصہ تھے، متاثر ہوئے تھے ؎

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشہ والوں کا ہے کاروبار بند

چھتیس پیشہ وروں اور صنعت کاروں کی زبوں حالی کا ذکر کرکے نظیر نے اپنے

دور کی صحیح تاریخ ہی پیش ہیں کی ہے بلکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بقول "اردو شاعری میں پہلی مرتبہ نظام کی آسودہ حالی کا دارومدار بھی انہی پر رکھا ہے جن کی تباہی دراصل پورے نظام معیشت کی تباہی ہے"۔[1]

نقادانِ شعروادب محض زبان وبیان اور حسن تخیل کے پیش نظر نظیر کو کوئی مقام ومرتبہ دیں یا نہ دیں ـــــ لیکن یہ حقیقت ضرور ہے کہ اس شاعر نے کھل کر اور واشگاف لہجے میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی ماحول کی ترجمانی کرکے "آنے والے نظم نگاروں کے لئے راہیں روشن کردی ہیں"۔[2]

لگ بھگ اسی زمانے میں بہار جیسے دور افتادہ مقام سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز میر تقی میر کے شاگرد راسخ عظیم آبادی[3] (م: ۱۸۲۴ء) کی ہے جو نہ صرف نظیر اکبرآبادی کے ہم عصر تھے بلکہ انہی کی طرح مختلف پیشہ وروں کی زبوں حالی کا نقشہ بھی کھینچتے ہیں۔ مثنوی کی صورت میں لکھا ہوا ان کا شہر آشوب اس دور کی معاشی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ سادہ وسلیس زبان اور سہل انداز میں وہ یوں اہلِ ہنر کے حالات وکوائف پر روشنی ڈالتے ہیں ؎

معطل ہے ہر کوئی بیکار ہے ۔۔۔ منوط مفلسی بر سر کار ہے
گدائی کا کاسہ لئے دربدر ۔۔۔ ہیں آوارہ ارباب فضل وہنر
مشائخ جو ذی عزّ وتعظیم ہیں ۔۔۔ دل انکے بھی صدمہ کش بیم ہیں
گئے سارے ورد ووظائف کو بھول ۔۔۔ کیا ایسا فکر شکم نے ملول
لکھوں خوشنویسوں کا میں حال کیا ۔۔۔ نوشتے پہ اپنے ہیں گریاں سدا

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ترجمہ حسن عسکری، ص ۲۱۹

[2] عبدالحیٔ، حکیم: گل رعنا، ص ۲۳۴

[3] کاکوی، شاہ ولی الرحمن: بہار کی چند ادبی شخصیتیں، مطبوعہ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر حصہ دوم شمارہ ۵۹-۶۰، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳۴۲

مسلّم ہوا ناظم وقت اگر — کوئی پوچھتا ہی نہیں اس کو پر
زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے — در مدعا یاں تو نایاب ہے
تجارت کا مایہ کسو میں کہاں — کہ باقی نہیں کچھ بجز نقد جاں
ہوئی تختہ دوکان سوداگری — نہ کوئی فروشندہ نے مشتری
ہر اک کو مرض مفلسی کا ہے آج — طبیب اب بچارے کریں کیا علاج
سپاہی کی مٹی بھی اب ہے خراب — کہ تنخواہ ہوا نوکری کا تو باب

راسخ کے اس شہر آشوب میں محض "زبان کا چٹخارا، محاورے کا لطف اور رعایت لفظی کی خصوصیت"[1] ہی نہیں ہے بلکہ ہر ایک صنعت گر، ہر ایک پیشہ ور کے متعلق صحیح کیفیت کا اظہار ہوا ہے۔ مسلّم سے لے کر طبیب تک اور خوشنویس سے لے کر کسان تک، ہر ایک ہنرمند کی مفلسی و قلاشی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ گویا راسخ نے ایک وسیع کینوس پر ہر سطح اور ہر طبقہ کے انسان کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس طرح اپنے دور کی یہ منفرد آواز ہے جسے اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تذکرہ نگاروں نے خود صاحبِ آواز کو نظر انداز کیا ہے۔

ناظرین! اب تک ہم دلّی، لاہور، دکن اور بہار کے اردو شعرا کا جائزہ لے چکے اور یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ ان مراکز میں ایسی شعری تخلیقات کثیر تعداد میں معرض وجود میں آئیں جنھوں نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی ماحول و اقدار کو بہ حسن و خوبی اجاگر کیا ہے اور اس طرح ایک ٹھوس اور جاندار تاریخ اس دورِ زبوں کی مرتب ہوگئی ہے ـــــ اب ہم شعر و فن کے دوسرے اہم مرکز لکھنؤ کا رخ کرتے ہیں کہ وہ بھی

---

[1] عبداللہ، ڈاکٹر سید: بحث و نظر، ص ۶۱

بیرونی جارحیت کا شکار ہوتا رہا ہے۔

مغلیہ حکومت کے ضعف کے بعد جب دلّی کو زوال آیا تو اس کا لازمی اثر دنیائے شعر و سخن پر بھی پڑا۔ اس کس مپرسی کی حالت میں خانماں برباد شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا کہ ان کے خیال میں وہی اس وقت جائے پناہ تھی ــــــ لیکن یہ جائے پناہ جس نے شعرائے دہلی کو "ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت"[1] کا برتاؤ کیا، جنگِ بکسر (۱۷۶۴ء) کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے چنگل میں آچکی تھی۔[2] کبھی تاوان کے بہانے، کبھی خراج کے حیلے، کبھی تحفظ کے ناتے، اس خطۂ زرخیز کے زر و جواہر انگریزوں کے وسیع و عریض دامن میں انڈیلے گئے تھے۔ شاہی خزانہ جس سے اہلِ علم و ادب کو انعام و اکرام عطا ہوتے تھے اور ان کی کفالت کا سلسلہ قائم رہتا تھا ــ اب غیروں کے تصرف میں آرہا تھا۔ غرض اودھ کی دولت ہتھیا لینے کا ہر ذریعہ استعمال ہو رہا تھا کہ وہاں کی حکومت میں دخل اندازی بھی شروع کر دی گئی[3] اور پھر رفتہ رفتہ انگریز سعادت علی خاں کی قائم کردہ سلطنتِ اودھ پر پوری طرح اثر انداز ہو گئے۔[4]

لکھنؤ کے اس بگڑتے ہوئے سیاسی ماحول نے یہاں کے شاعروں کو جو "صنعت زبان اور محاورات"[5] پر خصوصی توجہ کے لئے بدنام تھے، اسی طرح متاثر

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۲۲۰

[2] عزیز، اے: Discovery of Pakistan، ص ۱۹۲

[3] جعفری، رئیس احمد: واجد علی شاہ اور ان کا عہد، ص ۳۱۲ و لبعدہٗ

[4] ایضاً

[5] فتحپوری، علامہ نیاز: انتقادیات، حصّہ اول، ص ۵۰

کیا جس طرح دیگر مراکز کے شعرا متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے لکھنؤ کے زوال، انگریزوں کے تسلط، عوام کی اقتصادی بدحالی اور بادشاہ کی بے سروسامانی کا منظر اسی شدتِ جذبات اور خلوصِ فن کے ساتھ پیش کیا ہے جو اس نوع کے اظہار کے لئے ضروری تھا۔ اب آئیے، ہم چند ایک شاعروں کی تخلیقات کا جائزہ لے کر اس باب کے اختتام تک پہنچیں۔

سرفہرست ہمیں اودھ کے نواب وزیر علی خان کا نام نظر آتا ہے جو وزیر اور وزیری دونوں تخلص استعمال کیا کرتے تھے۔ آصف الدولہ کے بیٹے تھے اور ان کے انتقال کے بعد اس علاقے کے وزیر ہوئے۔ لیکن انگریزوں نے اپنی وزارت کے مسند سے ہٹا دیا اور بعد میں سرکشی و بغاوت کے جرم میں قید کر دیا۔[1] ان کی ایک غزل نہ صرف ان کے اپنے غم و اندوہ کی تصویر ہے بلکہ دوسرے فرماں رواؤں کی روداد دل بھی ہے جو فرنگیوں کے استبداد کا نشانہ بن رہے تھے۔ حسرت و یاس سے مملو اس غزل کے شعر ملاحظہ ہوں۔

جوں سبزہ رندے اگتے ہی پیروں کے تلے ہم
اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم

روتے ہیں شب و روز اسی فکر سے یارب
غنچے کی طرح باغ میں گل ہو نہ کھلے ہم

جس گل پہ نظر کرتے ہیں آتا ہے نظر خوار
گلشن کے چلے جاتے ہیں کانٹوں میں دبے ہم

اب پہلے ہی آغاز میں پامال ہوئے ہم
فریاد کریں کس سے یہ قسمت کے جلے ہم

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ترجمہ حسن عسکری ص ۲۵۴

زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں

رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات بلے ہم

تیسرے شعر کے مصرع اول پر نظر دوبارہ ڈال لیجئے۔ ع جس گل پہ نظر کرتے ہیں آتا ہے نظر خوار۔ کیا یہ اپنے عہد کی پوری داستان المناک چھپائے ہوئے نہیں ہے۔ چوتھے شعر کے پہلے مصرع پر بھی غور کیجئے "اب پہلے ہی آغاز میں پامال ہوئے ہم"۔ برطانوی اثر و رسوخ کے ابتدائی دور میں اودھ کے وزیر جس کرب والم سے دوچار ہوئے، اس کی طرف یہ اشارہ آنے والے برے دنوں کی صاف و صریح پیش گوئی بھی تھی۔

آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خاں کو معزول کر کے انگریزوں نے اپنی حاکمیت سلطنت اودھ پر قائم کر لی تھی۔ اور اس خطۂ زرخیز کو پورے طور پر اپنے دسترس میں کرنے کے لئے وہ جن جن سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں منہمک تھے، اس کا صحیح اندازہ شاہ کمال الدین کمال (م: ۱۸۳۵ء) کے مخمس شہر آشوب سے ہوتا ہے۔ یہ نظم اس زہریلے اثرات کو نمایاں کرتی ہے جو بڑھتے ہوئے برطانوی اقتدار کی وجہ سے سیاست و معاشرت میں پھیلتے جا رہے تھے۔ کمال محض اس انتشار کا ہی جائزہ نہیں لیتے، اودھ جس کا مرکز بنا ہوا تھا اور امرائے سلطنت کی بے کسی و بے لبسی کو ہی نہیں دکھاتے، وہ دلی کی تباہی و بربادی کا بھی ماتم کرتے ہیں ؎

وزیر و شاہ جو ہیں ان کے ملک کا ہے یہ ڈھنگ
کہ اپنے بخت سے رہتی ہے ان کو نت اٹھ جنگ
وزیر تو ہے گرفتار یاں بہ قید فرنگ
سکھ اور مرہٹوں نے واں کیا ہے شاہ کو تنگ
نہیں رہا ہے کچھ اقبال ان کا جز ادبار

ادھر تو قوم نصاریٰ ہے دائر و سائر
ادھر ہیں دلی میں سکھ اور مرہٹے کافر
سوائے کفر کب اسلام سے ہیں یہ باہر
عدوئے دین محمد ہیں سب پہ یہ ظاہر

جو اہلِ دیں تھے وہ سب ہو گئے اب بیکار

آگے چل کر کمال انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط پر اس طرح ماتم کناں نظر آتے ہیں ؎

وہی یہ شہر ہے اور وہی یہ ہندوستاں
کہ جس کو رشک جناں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہوئے سب ویراں
نظر پڑے ہے بس اب صورتِ فرنگستاں

ہیں سوار رہے یاں سوائے ترک سوار

جہاں کہ نوبت و شہنائی و جھانجھ کی تھی صدا
فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھو سلطنت کا رہا کیا رتبا
ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا

نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

نہ ہوئے دیکھ کے کیوں کر دل اپنا اب مغموم
ہو جب کہ جائے ہما آج آشیانہ بوم
وہ چھپے تو بس اس ملک میں ہیں سب محروم
فرنگیوں کے جو حاکم تھے ہو گئے محکوم

تو ہم غریبوں کا پھر کیا ہی یہاں شمار و قطار

ہم یہاں محسوس کریں گے کہ اب تک جس نوع کی منظومات نظر سے گزری ہیں ان میں شاہ کمال کے اس مخمس کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ اس میں کھل کر انگریزوں سے نفرت کا اظہار ہوا ہے اور صورتِ حال کی تبدیلی، سیاسی عدمِ استحکام اور معاشرے کی مفلوک الحالی کا ذمہ دار بھی انہی کو ٹھہرایا گیا ہے۔[۱] واضح رہے کہ ابتدائی دور میں ولی جیسے غزل گو کو یہ فرنگی تاجر کے روپ میں "مکروہ بد" نظر آئے تھے۔ اور اب، کچھ اسّی سال بعد ـــ شاہ کمال انہیں سلطنتِ اودھ کے زوال و انتشار کا موجب ٹھہرا رہے ہیں۔ اور اس طرح ہمیں برِعظیم پر انگریزوں کے نہایت تیزی سے بڑھتے ہوئے اقتدار کا علم ہو جاتا ہے۔ اس شہر آشوب کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

اس دور میں ہمیں ایک ایسے شخص کی درد بھری آواز بھی سنائی دیتی ہے جو نواب وزیر علی کی طرح نہ صرف معزول و معتوب ہوا بلکہ اس کی سلطنت کمپنی کی حکومت میں ہمیشہ کے لئے ضم کر دی گئی۔ اودھ کا یہ آخری تاجدار جسے انگریزوں نے یہ کہہ کر بدنام کیا تھا کہ "اپنا پورا وقت گوّیوں اور خواجہ سراؤں میں اور ان عورتوں میں جو یہ لوگ ان کی دلبستگی کے لئے پیش کرتے ہیں، صرف کرتے ہیں"[۲] ـــ غریبوں کا ہمدرد، اہلِ علم و ادب کا مربّی، فنکاروں کا سرپرست، فنونِ لطیفہ کا ماہر، اعلیٰ درجے کا شاعر اور کامیاب ڈرامہ نگار واجد علی شاہ اختر (م: ۱۸۸۷ء) تھے جن کی انتظامی صلاحیتیں

---

[۱] عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ، ص ۱۷۴

[۲] سلیمن، میجر جنرل: *Rambles and Recollections*، جلد ۱، دیباچہ ص ۱۷ و بعدہٗ

اب کھل کر سامنے آرہی ہیں۔[1]

بظاہر تو واجد علی شاہ فرماں روا تھے، لیکن سلطنت اودھ میں انگریزوں کی حیثیت شریک غالب کی تھی۔ وہ یہاں کی سیاست پر بقول شاہ کمال پوری طرح حاوی تھے۔[2] تاجدار اودھ کی پوزیشن شطرنج کے مہروں جیسی تھی اور ۱۸۵۶ء میں یہ مہرہ بھی سازش و فریب کی بساط پر پٹ گیا اور واجد علی کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں وہ مٹیا برج اور پھر فورٹ ولیم میں مقیّد رہے۔ یہ شعر ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے ؎

چمن سے پھینک دیا میرا آشیاں کیا خوب

نہال مجھ کو کیا آکے باغباں کیا خوب

اودھ کے اس معزول و مقید بادشاہ نے کلکتے سے اپنا ایک وفد داد و فریاد کے لئے انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجا اور سلطنت اودھ کی واپسی چاہی تو اسے ٹکا سا جواب دے کر بے نیل و مرام واپس لوٹا دیا گیا۔[3] اختر کی یہ بے بسی و بے چارگی اور حزن و ملال انکے اس شعر سے کس قدر واضح ہو رہا ہے ؎

قفس میں بند ہوں بے بال و پر ہوں دل دھڑکتا ہے

سبب ہے کونسا صیّاد اب میری رہائی کا

لکھنؤ کی دلکش فضا اور پرکشش ماحول سے دور — کلکتے میں شاہ اودھ جس کس مپرسی کی زندگی گزار رہے تھے اور عالم غربت میں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مرزا علی اظہر برلاس کا مضمون " واجد علی شاہ اختر" مطبوعہ اردو، کراچی شمارہ ۴، ۱۹۶۸ء، ص ۵۹ تا ۱۱۴

[2] ع نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

[3] جعفری، رئیس احمد: واجد علی شاہ اور ان کا عہد، ص ۲۹۵

گھر کی یاد کو سینے سے لگائے حبس کرب سے دوچار تھے، وہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ وہ بیکس و مجبور تھے۔ تاب و طاقت نہ تھی کہ قید تنہائی سے رہائی پاتے۔ ناچار یہ دعا کرکے ہی رہ جاتے ہیں کہ وطن کا دیدار نصیب ہو۔ اختر کے اس نوع کے اشعار حبِ وطن کے جذبات سے بدرجۂ اتم مملو ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بار خدا
پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار مرا
یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت
وسعتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حبِ وطن
تنگیٔ گور سے بدتر ہے فضائے غربت

واجد علی شاہ کی درج بالا غزل میں حبِ وطن کی ترجمانی بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ اسے پڑھ کر لکھنؤ اسکول کی شاعری پر عائد کردہ یہ اعتراض کہ یہ سراسر تکلف اور تصنع سے پر ہے اور اصلیت اور درد و اثر مطلق نہیں[1]، باطل ہو جاتا ہے۔

اختر کی ایک مثنوی "حزنِ اختر" خاصی مقبول و معروف ہے۔ قیدِ فرنگ کے دوران انہیں جن صعوبتوں، پریشانیوں اور تنہائیوں سے دوچار ہونا پڑا، ان کا جیتا جاگتا مرقع پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ محض ایک فردِ واحد کی روداد غم نہیں ہے جسے بیرونی تاجروں نے تاج و تخت سے محروم کر کے پابہ زنجیر کر دیا، بلکہ یہ پوری قوم کی درد بھری کہانی ہے۔ اس کے مطالعے سے

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۲۲۳

ہماری تاریخ کا وہ باب سامنے آتا ہے جب اودھ کی قومی حکومت ختم کرکے برطانوی تسلط کا آغاز ہوا اور جس کا ڈانڈا ایک ہی سال بعد زوالِ دہلی سے جاملتا ہے۔ بادی النظر میں "حزنِ اختر" ایک تاجدارِ اودھ کا ہی نہیں، پوری ملّت کا حزنِ بیکراں ہے۔ آئیے، اس مثنوی کے توسط سے اس حزنِ بیکراں کا جائزہ لے لیا جائے جو برِعظیم کا مقدّر بن چکا تھا ؎

نہ آقی ہے جاں نہ نکلتا ہے دم	تحیر ہوگئی رنج سے چشمِ نم
ہوا بھی جو آقی ہے تو سہم گئیں	نہ یاور نہ مونس نہ کوئی قریب
رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے	سبھوں نے کوئیں میں ڈھکیلا مجھے
ہوا تنگ ہیں قید خانے میں آہ	ہوا بے گنہ قید میں بادشاہ
عجب ہے یہ نیرنگ دنیائے دوں	زبوں ہے زبوں ہے زبوں ہے زبوں
فقط نام شاہی ہے ہوں میں خراب	کہاں میں کہاں قید لیکن عذاب
دل زار ہونٹوں پہ آ آ گیا	میں گھبرا گیا سخت گھبرا گیا

اپنی حالتِ زار کا نقشہ بیان کرنے کے بعد اختر نہایت دردانگیز طور پر خدا سے اپنی رہائی کی دعا مانگتے ہیں ؎

الٰہی مجھے قید سے دے نجات	نکلتی نہیں غم سے اب منہ سے بات
بس اب الحذر الحذر اے خدا	کر اس اخترِ زار کو تو رہا

لیکن یہ اخترِ زار وطن سے دور اسی عالمِ غربت میں انتقال کرجاتا ہے اور لکھنؤ دیکھنے کی تمنا دل میں ہی رہ جاتی ہے۔

سلطنتِ اودھ کو کمپنی سے ملحق کرنے کے لئے برطانوی کارندے جہاں ہزار حیلے بہانے ڈھونڈتے تھے، وہاں لکھنؤ کا ریذیڈنٹ سلیمن بادشاہ کو بدنام کرنے اور اس پر عیب لگانے میں سب سے آگے تھا۔ اس نے اپنے ایک

خط میں جو گورنر جنرل ڈلہوزی کو لکھا گیا تھا، واجد علی شاہ پر یوں الزام تراشتا ہے:

"اس کے تساہل اور غفلت نے اس کی رعایا کی
نظروں میں اسے ذلیل کر دیا ہے اور وہ اس سے
نفرت کرتی ہے۔"[۱]

لیکن جب یہی تساہل پسند اور غفلت شعار بادشاہ معزول کر کے قید میں ڈال دیا جاتا ہے تو ساری خلقت خون کے آنسو رونے لگتی ہے۔ شعرا اس کی بربادی کا نوحہ لکھتے ہیں، اس کی اجڑی ہوئی سلطنت کا ماتم کرتے ہیں اور برطانوی استبداد پر تاسف کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نوع کی اردو نظمیں جہاں ایک طرف اہلِ اودھ کے رنج و تعب کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہیں، وہاں برطانوی مورخین و عمال کی الزام تراشی کی نفی بھی کر دیتی ہیں۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ شاہ اودھ پر انگریزوں کے عائد کردہ الزامات کا جواب اس پرفتن دور میں کسی سے بن پڑا تو وہ شعرا ہی تھے۔ چلتے چلتے ہم ایسے شعرا کا جائزہ بھی لے لیں کہ قوم کے درد و غم میں یہ بھی برابر کے شریک ہیں۔

ایک ہندو شاعر دیبی پرشاد فرحت نے دو سو چورانوے اشعار پر مشتمل ایک مثنوی لکھی تھی[۲] جس میں شاہ اودھ سے اپنی عقیدت کا بھی اظہار کیا ہے، حالاتِ زمانہ پر بھی روشنی ڈالی ہے، اقتصادی مسائل بھی بروئے کار لائے ہیں اور دعا بھی کی ہے کہ معزول بادشاہ لکھنؤ واپس آ جائے کہ مسرت و

---

[۱] منقول برلاس، مرزا علی اظہر: واجد علی شاہ اختر، مطبوعہ "اردو" کراچی، شمارہ ۴، ۱۹۶۸ء، ص ۸۱
[۲] جعفری، ڈاکٹر نعیم: شہر آشوب، مطبوعہ "اردو" کراچی، شمارہ ۲۵، ۱۹۷۷ء، ص ۱۶۵

شادمانی کے دن لوٹ آئیں۔ واضح رہے کہ ظفرؔ کو دربار اودھ سے کوئی ناتہ نہ تھا جیسا کہ وہ خود اقرار کرتے ہیں ؎

زمانے کو حضرت نے بخشے خطاب

ہوا بزم شہ میں نہ میں باریاب

کہ تھا کچھ تعلق نہ سرکار سے

نہ واقف تھے ہم شہ کے دربار سے

ایک عام شہری کی حیثیت سے انہوں نے اپنے جذبات کی ترجمانی اس طرح کی ہے ؎

سبھوں کو تو ہے نوکری کا الم

ہمیں ہے فقط شہ کے جانے کا غم

مگر عیش و عشرت میں با یک دگر

خوشی سے تھی اوقات ہوتی بسر

سو وہ اس زمانے میں دشوار ہے

خیال اپنی عزت کا ہر بار ہے

جدھر جاؤں بازار سنسان ہیں

محل شہ کے دیکھو تو ویران ہیں

رعیت کی حالت بہت ہے تباہ

شتابی سے آئے مرا بادشاہ

پھرے باغ میں وہ شہ نامدار

چمن سے خزاں جائے آئے بہار

چمک پر جہاں کا ستارا رہے

نہ گردش میں اختر ہمارا رہے

سادہ اور رواں انداز میں لکھی ہوئی یہ مثنوی نہ صرف ایک ہندو شاعر کی عقیدت کا برملا اظہار کر رہی ہے بلکہ اس دور کے اودھ کا منظر بھی پیش کر رہی ہے۔[1]

اسی دورِ زبوں میں ہمیں خواجہ ارشد علی قلق (م: ۱۸۸۰ء) کا لکھا ہوا شہر آشوب ملتا ہے جس میں "خلوص بھی ہے اور تاثیر بھی حسن بھی ہے اور سحر آفرینی بھی!"[2] قلق شاہ اودھ کے ساتھ کلکتے گئے تھے اور خود بھی ان کے ساتھ اسیرِ زنداں رہے جیسا کہ مسدس میں کہتے ہیں:

بے خطا سات مہینے تو گرفتار رہے
اپنے خالق سے رہائی کے طلبگار رہے

جب سات مہینے بعد انہیں رہائی ملی تو وہ واپس لکھنؤ آئے تو مسدس شہر آشوب لکھا جو جذبات و مشاہدات کا حسین مرقع بن گیا ہے۔ اس کی اہمیت یوں بڑھ گئی ہے کہ قلق نے اس میں نہایت بے بسی کے عالم میں لکھنؤ سے روانگی، سفر کی صعوبت و دشواری، قیدِ فرنگ کی مصیبت و پریشانی اور پھر اہل اودھ کی تباہی و بربادی کے دلدوز مناظر پیش کئے ہیں۔ یہ واجد علی شاہ کے دور کی ایک ایسی نظم ہے جسے اردو ادب ہی میں نہیں، دنیائے تاریخ میں قدر و منزلت حاصل رہے گی۔ چند ایک منتخب بند کے مطالعے سے ہم اس کی ادبی و تاریخی اہمیت کا اندازہ لگا لیں گے:

شہر سے جب کہ مقدر نے نکالا ہم کو
سخت آفت، عجب اندوہ میں پالا ہم کو
کر دیا مثلِ زمانہ تہ و بالا ہم کو
یہی کہتا تھا ہر ایک دیکھنے والا ہم کو

---

[1] عبدالودود، قاضی: سفر آشوب، پٹنہ سنہ ۱۹۶۱ء میں تفصیل موجود ہے۔

[2] حنفوی، ڈاکٹر تمغام: شہر آشوب، مطبوعہ اردو، کراچی، شمارہ ۲۵ سنہ ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۳

بلبلِ ہند اب آوارہ وطن ہوتا ہے
حیف در حیف کہ ویران یہ چمن ہوتا ہے

رات کو کوچ کیا کرتے تھے دن کو مقام
ایک منزل پہ نہ پایا کہیں دم بھر آرام
نہ سرانجام سفر کچھ نہ کسی جا پہ قیام
بسکہ تھا طبع کی ناسازی کا وہ ہی ہنگام

شب روی میں جو تکلیف سوا پاتے تھے
صبح ہی منہ دیکھ کے کس پاس سے رہ جاتے تھے

اور اس چرخ ستم گار کے دیکھئے نیرنگ
شاہ غربت زدہ پر دیکھئے بیداد کے ڈھنگ
ایسا پروردۂ ناز و نعم اور قید فرنگ
بوئے گل سے بھی جو ہو جان نزاکت دل تنگ

مثل بلبل وہ گرفتار قفس میں ہو جائے
خود جو حاکم ہو وہ یوں غیر کے بس میں ہو جائے

واجد علی شاہ کے معزول ہو جانے کے بعد بسے بسائے لکھنؤ کا جو حال ہوا
اس کا ذکر قلق اس طرح کرتے ہیں ؎

تین حصے سے سوا شہر کھدا پایا تمام
جس طرف دیکھو نظر آتا ہے اک ہو کا مقام
مہ وش سینکڑوں رہتے تھے جہاں گرم خرام
ٹھوکریں کھا کے بشر چلتے ہیں اس جا ہر گام

اجنبی ہو گئے ایسے یہ بھٹک جاتے ہیں
ساکن شہر تلک راہ نہیں پاتے ہیں

درج ذیل بند میں تعلق شاہ اودھ کی حرماں نصیبی کی روداد ہی نہیں سناتے ہیں، بلکہ حکومتِ برطانیہ کے بے جرم و خطا بیداد کرنے پر صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں۔ یہ حسن تخئیل نہیں، سچائی کا مرقع ہے۔ ذرا اسے دیکھئے ؎

دلخراش ایسی الٰہی کوئی روداد نہ ہو
اس طرح گھر کسی دشمن کا بھی برباد نہ ہو
مدعی ایسا سپہر ستم ایجاد نہ ہو
کسی بے جرم پہ دنیا میں یہ بیداد نہ ہو
ایسی سرکار کسی کی نہ لٹے دنیا میں
یوں وطن سے کوئی اپنے نہ چھٹے دنیا میں

غرض واجد علی شاہ اختر کی سلطنتِ اودھ سے معزولی اور بے جرم و تقصیر قید و بند کی صعوبت ایک ذاتی انسان کا سانحہ نہیں، پوری قوم کا سانحہ تھا۔ یہ وقت کا ایسا موڑ تھا جہاں قومی تاج و تخت پر بیرونی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے ــــ یہ انیسویں صدی کا ایک ایسا لمحہ تھا، جہاں ملکی آزادی ختم ہوتی ہے اور غلامی کی زنجیریں پاؤں میں پڑ جاتی ہیں۔ اہلِ اودھ کو اس سیاسی انقلاب کا شدید احساس تھا۔ وہ لکھنؤ سے بادشاہ کی اس رخصت کو حریت و خود مختاری کی دائمی رخصت سمجھ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ رو رہے تھے اور "بام و در سے یہ صدائیں آ رہی تھیں"[1] ؎

واجد علی شاہ پیارا کلکتہ کو سدھارا
سونی پڑی ہیں سڑکیں ویران گلی گلی ہے

---

[1] جعفری ڈاکٹر تمکنت: شہر آشوب، مطبوعہ اردو، کراچی، شمارہ ۲۹، سنہ ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۲

ہم نے دیکھا کہ مروّجہ اصناف سخن کے محدود دائرے میں رہ کر شعرائے اردو نے اس طویل دور کے معاشرے اور ماحول کی کتنی صحیح منظر کشی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بدلے ہوئے سیاسی حالات کو "بہتر بنانے کے لئے ان کے بازوؤں میں سکت نہیں تھی، اس لئے وہ ان پر کڑھتے تھے، روتے تھے، آنسو بہاتے تھے اور اس طرح اپنا اور اپنی تہذیب کی بگڑی ہوئی حالت کا مرثیہ لکھتے تھے"[1] لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہی ملکی و ملّی نوحے آنے والے دور کے شعرا کے لئے مینارۂ نور ثابت ہوئے ہیں۔ ان منظومات سے پھوٹنے والی روشنی میں انہوں نے ایسی ڈگر کا کھوج لگایا جس پر چل کر اپنے فکر و فن کو انقلاب کا مظہر بنا دیا۔ میر انیس نے مغموم و مضمحل ہو کر ملک کی بربادی پر جو یہ فریاد کی تھی اور اجڑی ہوئی سلطنت کے دوبارہ آباد ہونے کے لئے جو پر خلوص دعا مانگی تھی ؎

کیوں کر دلِ غمزدہ نہ فریاد کرے	جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ اب خداوند کریم	اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

وہ پیش رو شاعروں کے لئے تازیانے کا کام کر گئی اور انہوں نے آنے والے دور میں یہ بتا دیا کہ شاعری صرف نوحہ ہی نہیں، عمل کی جھنکار بھی ہے۔ اگلے باب میں بھی تحریک جہاد کے موقع پر عمل کی یہ جھنکار صاف سنائی دے گی۔

---

[1] بریلوی، ڈاکٹر عبادت: روایت کی اہمیت، ص ۴۲۲

پانچواں باب

تحریکِ جہاد اور اردو شعرا

۱۸۵۶ء میں سلطنتِ اودھ کا الحاق ہوتا ہے اور اس کے اگلے ہی سال آزادی کی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اور اب ہمیں اصولی طور پر اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اپنے اصلی سفر کا آغاز کر دینا چاہیے۔ لیکن یہاں ہم وقتی طور پر اس موضوع سے اپنا رخ موڑ کر قومی تاریخ کے ایک اہم پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ـــــ اور یہ ہے تحریکِ مجاہدین! چونکہ یہ تحریک اور اس کے زیر اثر لکھی جانے والی نظمیں ہماری قومی اور ادبی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں اور ان سے آنے والے قافلۂ شعرا کو روشنی و توانائی ملتی ہے اور "عمل" کی سمت کا بھی پتہ چلتا ہے، لہٰذا یہ اہمیت و افادیت اس امر کی متقاضی ہے کہ ہم اسے دائرۂ تحریر میں لے آئیں۔

جیسا کہ ہم بابِ سوم میں لکھ چکے ہیں، اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہو گئی تھی اور ہر صوبے میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ان حالات سے پیدا ہونے والے نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م: ۱۲۲۵ھ) جو میرزا مظہر جانِ جاناں کے خلیفہ تھے[۱]، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "تغیر مع توابع بخیریت است لیکن از غلبہ کفر تنگ دل، سابق از حد تہا در ہندوستان اسلام ضعیف بود و مدتے کالعدم روافض و تشویش آسیب سکھاں بود و از قریب دہ سال تسلط مرہٹہ است۔"[۲]

اس کے بعد قاضی ثناء اللہؒ اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتے کہ

> "بادشاہ اسلام و لشکر مسلمانان توفیق جہاد و اعلاء

۱۔ خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: حضرت مظہر جانِ جاناں کے چند غیر مطبوعہ خطوط، مطبوعہ اردو، کراچی شمارہ ۳، جولائی ۱۹۶۷ء، ص ۵

۲۔ ایضاً: مکتوبات قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مطبوعہ اردو، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۳

کلمۃ اللہ ندارد"۔ [1]

قاضی صاحب کے اس خط سے جہاں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام برعظیم میں ضعیف ہوگیا تھا، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور دیگر مسلمانوں میں توفیق جہاد باقی نہیں رہی تھی، کفاروں کی بن آئی تھی اور وہ ہر طرح کی من مانی کر رہے تھے۔

ایسے پرآشوب وقت میں جبکہ روشنی کی ہلکی سی کرن بھی کہیں نمایاں نہ تھی، شاہ ولی اللہ (م: ۱۷۶۲ء) آگے بڑھے اور انہوں نے قوم کو پستی، ذلت اور بدحالی کے تاریک غار میں گرنے سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اسلامی سلطنت کو زیر و زبر ہوتے دیکھا تھا۔ نادر شاہی حملے کی تباہی ان کی نظر میں تھی۔ مغلیہ حکومت کے خلاف شمال رونما ہونے والی بغاوتیں ان سے پوشیدہ نہ تھیں۔ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی سرگرمیوں سے بھی وہ واقف تھے۔ پھر وہ بنگال اور جنوبی علاقوں میں بدیسی طاقت کو ابھرتا ہوا بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں ان تمام ناساعد حالات کا مقابلہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مرکزی اسلامی سلطنت مضبوط تر ہو اور تمام دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بادشاہ وقت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر انہوں نے اسے مندرجہ ذیل پیغامات دیئے جو سیاسی لحاظ سے بڑی قدر و منزلت کے حامل ہیں:

"تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم مشرک سے جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر کے سرکش رہنما کمزوروں کے گروہ میں شامل نہ

---

[1] منقول خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: مکتوبات قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مطبوعہ اردو، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۷، ص ۱۳۳

ہو جائیں۔"[1]

شاہ ولی اللہ نے ملک کے ناقص انتظام کو بہتر بنانے اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے بادشاہِ دہلی کو یہ نصیحت کی:

"چاہیے کہ ہر تین یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک حاکم مقرر کرو، ایسا حاکم جو عدل و انصاف کا پیکر ہو قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو۔"[2]

ہم گذشتہ باب میں یہ لکھ آئے ہیں کہ فوج منظم نہیں تھی۔ سپاہیوں کی حالت حد درجہ خراب تھی۔ شعرائے اردو کے بیشتر شہر آشوب میں ان کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا جا چکا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے پیش نظر مرکزی سلطنت کو فوجی تنظیم کا مشورہ دیا تھا تاکہ ملک کا دفاع ہو سکے اور امن و امان برقرار رہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

فوج کی نئے سرے سے تنظیم کرنے کے لئے اصلاحات جاری کرنی چاہئیں اور سپاہیوں کو باقاعدگی سے بروقت تنخواہیں ملنی چاہئیں۔ سپاہی مضبوط ہوں گے تو فوج مضبوط ہوگی۔ مضبوط فوج قوم اور ملک کا سب سے بڑا سہارا ہوا کرتی ہے۔"[3]

یہی وہ بنیادی باتیں تھیں جن کے فقدان نے سلطنتِ مغلیہ کی جڑیں کھوکھلی کر دی

---

[1] ولی اللہ: التفہیمات الالہیہ، جلد اول، ص ۲۱۳ وبعدہٗ
نیز ملاحظہ ہو نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات

[2] ایضاً

[3] ایضاً

تھیں۔ انہی امور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شاہ ولی اللہ نے مکاتیب لکھے۔ مگر انہیں اس مہم میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی[۱]۔ بادشاہ کی حالت میں ذرا بھی تغیر رونما نہ ہو سکا۔ بالآخر انہوں نے دربار کے امراء کو مخاطب کیا کہ وہ برعظیم میں اسلامی معاشرے کی سلامتی کے لئے کوئی مثبت قدم اٹھائیں۔ لیکن وہ عیش و عشرت میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ اس قسم کے مشورے سننے کی صلاحیت ان میں موجود نہ تھی[۲]۔ تب شاہ ولی اللہ نے مایوس ہو کر نظام الملک آصف جاہ سے ناگفتہ بہ حالات کی اصلاح کی درخواست کی، مگر اس پر بھی ان کی استدعا کا کوئی اثر نہ ہوا[۳]۔

ادھر پیشوا سردار ملہار راؤ نے جاٹوں سے اشتراک کر لیا اور شمالی ہند میں ہندو بادشاہی قائم کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ شاہ ولی اللہ نے صورتِ حال کو مزید خراب ہوتے دیکھا۔ انہیں برعظیم میں کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو دشمنوں سے نبرد آزما ہو کر اسلامی اقدار، اسلامی سلطنت اور اسلامی معاشرے کی حفاظت کرتا۔ چنانچہ انہوں نے افغانستان کے سردار احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا اور برعظیم کے تمام حالات و کوائف سے اسے مطلع کیا۔ نیز اسے سلطنتِ دہلی کے بدخواہوں کا قلع قمع کرنے کی طرف متوجہ کیا[۴]۔

آخر ۱۷۶۱ء میں ابدالی وارد ہوا اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو ایسی

---

[۱] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۲۳۰

[۲] ایضاً، ص ۲۳۰

[۳] ایضاً، ص ۲۳۱

[۴] نظامی، خلیق احمد: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۶۱

شکست دی کہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے، اور ان کی بادشاہی کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ شاہ ولی اللہ کی حکمت عملی اور ذاتی کوششوں کی بدولت اٹھارہویں صدی کے وسط میں دہلی کی اسلامی سلطنت ہندو سامراج کے چنگل میں پھنسنے سے بال بال بچ گئی ــــ اگر وہ چند سال اور زندہ رہتے تو عجب نہ تھا کہ بنگال اور جنوبی ہند میں قدم جمانے والے غیر ملکی سامراجیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف نبرد آزما ہوتے۔ مگر پانی پت کی جنگ کے دوسرے ہی سال وہ وفات پا گئے۔

اگرچہ شاہ ولی اللہ کی کوششوں سے مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا تھا اور مغل حکومت کو زندہ رہنے کا سہارا مل گیا تھا، لیکن شرقی اور جنوبی علاقے میں ایک نیا دشمن نہایت تیزی سے ابھر رہا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں اس نے سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر فتح حاصل کر لی تھی، ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر مسلمانوں کی متحدہ فوج کو شکست دے کر اودھ اور دہلی کو اپنا باج گزار بنا لیا تھا اور ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو شہید کر کے سرزمین دکن میں بھی اپنی برتری قائم کر لی تھی ــــ ادھر دہلی میں مغل بادشاہ ۱۸۰۳ء میں اس نئی طاقت کا وظیفہ خوار ہو گیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے بڑے لڑکے شاہ عبدالعزیز (م: ۱۸۲۳ء) دہلی میں بیٹھے برعظیم کے اس بدلتے ہوئے نقشے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس خاندان کے فرد تھے جس نے مسلمانانِ پاک و ہند کی ہمیشہ رہنمائی کی تھی ــ اور اب یہی ذمہ داری ان پر عائد ہو چکی تھی۔

شاہ عبدالعزیز ایک دور اندیش انسان تھے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے کہ اس ملک میں انگریزوں کا سکہ جم چکا ہے۔ ان کے مقابلے میں مسلمان بادشاہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کسی ریاست کا حاکم بھی اس قابل نہ تھا کہ

انگریزوں کی قوت توڑ سکے۔ دوسری طرف شاہ عبدالعزیز کو عوام کی بے بسی و بے نیازی کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ ایسے مایوس کن حالات میں وہ ایک مصلح اور رہبر کی حیثیت سے آگے بڑھے۔ وہ سوئی ہوئی قوم کو انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ تاریخ ساز فتویٰ دیا:

"برعظیم اب دارالاسلام یعنی وہ ملک جہاں اسلام
کو برسر اقتدار یا کم سے کم آزاد سمجھا جا سکے نہیں رہا۔
مسلمان اب دارالحرب میں ہیں۔"[1]

اس فتوے کے مطابق مسلمانانِ پاک و ہند کے لئے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ ہجرت کر جائیں یا پھر آزادی حاصل کریں۔ ظاہر ہے وطن چھوڑ کر کہیں اور جانا مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا ـــ لازمی طور پر یہیں رہنا اور آزاد رہنا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کا یہ فتویٰ حقیقی معنوں میں جنگ آزادی کی پہلی آواز تھی۔ اس کے ذریعے انہوں نے برعظیم کے مسلمانوں کو بتایا کہ جب ملک غلام بن جائے جب بیرونی قوم اہل وطن کی آزادی چھین لے تو ایسی صورت میں یا تو ہجرت کر جاؤ یا پھر آزادی حاصل کرو۔

عوام کو سیلاب بلا خیز سے چوکنا کرنا ہی ان کا مطمح نظر نہ تھا۔ وہ عملی اقدام کے خواہاں بھی تھے۔ وہ مجاہدوں کی ایک ایسی جماعت بنانا چاہتے تھے جو برعظیم کے مسلمانوں کو جہاد کے لئے آمادہ کرے ـــ اور جب راہ ہموار ہو جائے تو پھر اعلانِ جنگ عام ہو۔ اس جہاد کے لئے فوجی قائد کی بھی ضرورت

---

[1] عبدالعزیز، شاہ: فتاوائے عزیزی، جلد اول، ص ۱۶ - ۱۷

تھی۔ ایسا قائد جو بہادر ہو، سچا مسلمان ہو، وطن سے محبت رکھتا ہو، جنگ کے تمام طریقوں سے واقف ہو۔ اس کام کے لئے انہوں نے سید احمد بریلوی (م: ۱۸۳۱ء) کو منتخب کیا اور انہیں فوجی تربیت حاصل کرنے کی تلقین کی۔

جب شاہ عبدالعزیز کے ایما پر سید احمد ٹونک سے فوجی تربیت حاصل کرکے لوٹے تو انہیں کہا گیا کہ وہ پورے ملک کا دورہ کریں، جگہ جگہ جا کر لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کریں، روپیہ جمع کریں اور رضا کار بھرتی کریں۔[1][2]

جب ۱۸۲۱ء میں سید احمد دہلی سے نکلے اس وقت شاہ عبدالعزیز خاصے سن رسیدہ ہو چکے تھے۔ وہ اس مہم میں شریک ہونے کی دلی تمنا رکھتے تھے، لیکن پیرانہ سالی کی وجہ سے معذور تھے۔ مگر انہوں نے اپنے جذبے کا اظہار اس طرح کیا کہ سید احمد کو اپنی سفید عبا پہنائی اور سیاہ عمامہ سر پر باندھا[3] —— مرشد کی یہ شفقت دراصل اس جذبے کی غمازی کر رہی تھی جس کے تحت جہاد کا یہ سارا منصوبہ عملی جامہ پہن رہا تھا۔

سید احمد بریلوی اپنے رفقا کے ساتھ اس انقلابی سفر کے دوران شمالی اور مشرقی اضلاع کے تمام شہروں میں گئے۔ وہ عوام سے گلیوں میں ملے، سڑکوں پر ملاقات کی، مسجدوں میں جا کر ان سے بات کی۔ امیروں کی اونچی حویلیوں میں گئے۔ غریبوں کی جھونپڑیوں میں پہنچے —— غرض ہر جگہ اور ہر مقام پر انہوں نے پژمردہ مسلمانوں سے خطاب کیا۔[4]

---

[1] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی کتاب "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۲۵۳ و بعدہٗ۔ [2] ایضاً

[3] نوشہروی، ابو یحییٰ امام خاں: تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۸۷

[4] محمود الرحمٰن: آزادی کے مجاہد، حصہ اول، ص ۱۷

یہ انقلاب دورہ بنایت کامیاب ہوا۔ سید احمد اور ان کے مرید خاص شاہ اسمٰعیل (م: ۱۸۳۱ء) کی تقریروں نے ملک کے کونے کونے میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ ان کی تحریک جہاد پھیلتی چلی گئی۔ ہر جگہ کیمپ کھل گئے۔ لوگ دھڑا دھڑ بھرتی ہونے لگے۔ قومی فنڈ میں کثیر رقمیں جمع ہونے لگیں۔

کلکتے میں سید احمد کی آمد سے بنگالی مسلمانوں میں غضب کا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ انہی میں ان کے لائق مرید تیتومیر (م: ۱۸۳۱ء) تھے جنہوں نے اس صوبے میں جنگ آزادی کے لئے بڑا کام کیا اور انگریزوں سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے[۱]۔

ہم یہاں واضح کرتے چلیں کہ سید احمد کی فوجی تربیت، پھر تمام علاقوں کا سفر، عوام میں وعظ و تلقین کا سلسلہ، رضا کاروں کی بھرتی اور چندے کی فراہمی خالی از مصلحت نہ تھی۔ اس تحریک کی غرض و غایت سرزمین ہند کو برطانوی تسلط سے نجات دلا کر خلفائے راشدین کے نمونے کی حکومت الٰہیہ کا قیام تھا[۲]۔

اگرچہ اس تحریک کا رخ انگریزوں ہی کی طرف تھا[۳] لیکن ــــ سید احمد نے عملی مظاہرے کے لئے شمال مغربی علاقے کو منتخب کیا جہاں سکھ مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہے تھے۔ اسلام کے خلاف ان کا تعصب بڑھتا جا رہا تھا[۴]۔ ان کی فی الفور سرکوبی لازمی تھی اور اس طرح انگریزوں پر مسلمانوں کی دھاک

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ملک عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، ص ۶۵، وبعدہ
[۲] ندوی، مولانا ابوالحسن علی: سیرۃ سید احمد شہید، ص ۱۲۶ - ۱۲۷
[۳] ایضاً، ص ۳۳۵
[۴] ملاحظہ ہو خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: مکتوبات قاضی ثناءاللہ پانی پتی، مطبوعہ سہ ماہی اردو، کراچی، شمارہ ۲، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۳

بیٹھنے کا امکان بھی تھا۔ دوسرے اہم نکتہ یہ پیش نظر تھا کہ پنجاب پر قبضہ جما لینے کے بعد پٹھانوں اور افغانوں کا ایک متحدہ محاذ بنا کر انگریزوں سے بہتر طریقے سے نبرد آزما ہوا جا سکتا تھا۔ خود سید احمد نے شاہزادہ کامران کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس عندیے کا اظہار کیا ہے:

"اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رخ کروں گا تاکہ اس کو کفر و شرک سے پاک کیا جائے۔ اس لئے کہ میرا مقصود اصلی ہندوستان پر جہاد ہے نہ کہ ملک خراسان میں سکونت اختیار کرنا۔"[۱]

جب جنوری ۱۸۲۶ء میں سید احمد نے اعلان جہاد کیا تو برعظیم کے طول و عرض سے مجاہدین اٹھ اٹھ کر ان کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے۔ ان کے فوجی کیمپ میں مال و اسباب، زر و جواہر اور روپے پیسے کے ڈھیر لگ گئے۔ ہر شخص سر سے کفن باندھے تیار کھڑا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے جو تحریک چلائی تھی وہ اب پیکر عمل میں ڈھل چکی تھی۔

سید احمد بریلوی کی سربراہی میں مجاہدین وطن کا یہ قافلہ گوالیار، ٹونک، سندھ، بلوچستان، قندھار، غزنی اور کابل ہوتا ہوا درۂ خیبر کے راستے پشاور پہنچا۔ برعظیم میں وقوع پذیر ہونے والا یہ لانگ مارچ[۲] جذبۂ آزادی کی ایک روشن مثال ہے۔

سازش و فریب کاری کی کمند بالاکوٹ کی پہاڑیوں پر بھی پھینکی گئی اور

---

[۱] منقول ملک عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، ص ۱۲/۴
[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے محمود الرحمٰن: قومی شعور کے معمار۔ حضرت سید احمد شہید، مطبوعہ اخبار جہاں، کراچی، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۲ء، ص ۱۳

سکھ شبخون مار کر غالب آ گئے۔ چھ سو مجاہدین شہید کر دیئے گئے[1]۔ ان ہی میں سید احمد بریلوی اور شاہ ولی اللہ کے پوتے مولانا شاہ اسمٰعیل بھی تھے۔

گرچہ ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو یہ تحریک کچل دی گئی لیکن بالاکوٹ کی خاکستر سے جو چنگاری رونما ہوئی اس نے برعظیم کے مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ ہندوؤں اور انگریزوں سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ اور بھی فزوں کر دیا اور آزادی کی لگن ہر دل میں پیدا کر دی[2]۔

سید احمد شہید کی تحریک جہاد نے عوام میں جو جوش و خروش، جو ولولہ و شوق اور جو حوصلہ و عزم پیدا کیا تھا، اس سے ہمارے شعرا تہی داماں نہیں رہے۔ انہوں نے بھی اپنے فکر و فن اور لوح و قلم کے ساتھ اس تحریک کا ساتھ دیا اور ایسی نظمیں لکھیں جن میں نہ صرف میر کارواں کے ساتھ بے پناہ خلوص و عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے، بلکہ جہاد کی اہمیت و فضیلت اور اس کا مقصد و منشا بیان کیا گیا ہے۔ اس نوع کی جہادیہ نظمیں ہماری قومی و ملّی شاعری کا اہم ستون ہیں۔ یہ اس دور کی ترجمان ہیں جب پوری قوم حصولِ حرّیت کے لئے عملی زندگی میں قدم رکھ چکی تھی۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد آنے والے زمانے میں نہ صرف یہ تحریک مشعلِ راہ بنی بلکہ جہادیہ قسم

---

[1] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ص ۲۶۰

[2] دنیا نے دیکھا کہ اسی چنگاری سے جنگِ آزادی کی جو شمعیں روشن ہوئیں، انہوں نے دشمنوں کے قصر و ایوان تک جلا کر سیاہ کر دیئے۔ اور اسی بالاکوٹ کی پہاڑیوں پر سو سال بعد آزادی کا سبز ہلالی پرچم نہایت آن بان کے ساتھ لہرا اٹھا۔ (م۔ ر)

کی نظمیں بھی نشانِ منزل ثابت ہوئیں ۔ آیئے اب ہم اس تحریک کے تحت لکھی جانے والی منظومات کا جائزہ لے لیں ۔

جہادیہ شاعری میں سرِفہرست مومن خاں مومن (م: ۱۸۵۲ء) کا نام آتا ہے ۔ زمانہ انھیں اردو غزل کے توسط سے جانتا ہے ۔ وہ حسن و عشق کے موضوع، فراق و وصال کے تصور اور دل و جگر کی وارفتگی کے رشتے سے پہچانے جاتے ہیں ۔ ان کے اس شعر کے بدلے غالب جیسے "انا پسند شاعر"[1] اپنا دیوان نذر کرنے کو تیار تھے[2] ۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لیکن جب مجاہدوں کا قافلہ سید احمد کی قیادت میں میدان جہاد کی طرف روانہ ہوتا ہے تو یہی مومن پکار اٹھتے ہیں ۔

خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا
لبوں پر دم بنا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا
نہ کر بیگانۂ مہر امام اقتدا سنت
کہ اَزکارِ آشنائے کفر ہے ان کی امامت کا
امیر لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں یعنی
ارادہ ہے مرا فوج ملائک پر حکومت کا
زمانہ مہدئ موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا

---

[1] احمد سلیم: غالب کی انانیت، مطبوعہ اردو، کراچی (غالب نمبر) ۱۹۶۹ء ص ۱۰۵
[2] حالی الطاف حسین: یادگار غالب، ص ۹۱

مومن کو اس جہاد میں شرکت کی جو شدید آرزو ہے اس کا اظہار اس شعر
میں برملا کر رہے ہیں ؎

شوقِ بزمِ احمدؒ ذوقِ شہادت ہے مجھے

جلد مومن لے پہنچ اس مہدیٔ دوراں تلک

انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں حزن و ملال کی جو فضا طاری تھی اور مایوسی
کا جو گھپ اندھیرا مسلط تھا اس میں کوئی ایسا قائد دکھائی نہیں دے رہا تھا جو روشنی
کا مینار بن کر یاس و حرماں کی تاریکی کو دور کرتا۔ اس وقت نہ راستے کا تعین تھا
نہ منزل کا سراغ!۔ اس پر آشوب وقت میں جب سید احمد حوصلہ انگیز قیادت
کے لئے اٹھے تو ہر شخص ان کے ساتھ ہو لیا۔ ہر ایک کی امیدیں ان ہی کی ذات سے
وابستہ ہوگئیں۔ اب راہ منور ہوتی نظر آئی اور منزل کا سراغ ملنے لگا۔ سید احمد
نے اس طرح ساری قوم کی محبتیں اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔ ہر شخص کے دل
میں ان کے لئے عقیدت و احترام کا جذبہ موجزن ہوگیا ـــــ مومن خاں مومن نے
اس عظیم مجاہد کی مدح میں قطعہ لکھ کر صرف اپنے دلی جذبات کی ترجمانی نہیں
کی ہے بلکہ پوری مسلم قوم کے دلوں کا راز افشا کر دیا ہے۔ عقیدت کے جذبے سے
سرشار ہو کر لکھی ہوئی اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ

کہ فکر مدحت سبطِ قسیم کوثر ہے

وہ کون امامِ امام جہانیاں احمد

کہ محض مقتدیٔ سنّت پیمبر ہے

زبسکہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد

جو کوئی اس سے مقابل ہو سو وہ کافر ہے

وہ بادشاہ ملائک سپاہ کوکب دیں

کہ نورِ شمس و قمر جس کے گرد لشکر ہے

وہ برقِ خرمنِ ارباب شرک و اہلِ ضلال

کہ شعلۂ خوشۂ حاصل تو دانۂ اخگر ہے

مومن نے سید احمد بریلوی، ان کے مشن اور جہاد کی فضیلت و اہمیت پر ایک جہادیہ مثنوی بھی لکھی تھی جو ہماری قومی شاعری میں تاریخی لحاظ سے بڑی قدر و منزلت کی حامل ہے۔ ذیل میں کہیں کہیں سے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

مومن میرِ کارواں کی توصیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

بہت کوشش و جاں نثاری کروں — کہ شرعِ پیمبر کو جاری کروں

دکھادوں بس انجام الحاد کا — نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا — کہ سایہ سے جس کے خجل مہر و مہ

رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات — ہے کفّار کی موت اس کی حیات

خدا نے مجاہد بنایا اسے — سرِ قتلِ کفار آیا اسے

پھر مومن جہاد کی اہمیت و فضیلت پر یوں روشنی ڈال رہے ہیں ؎

ہوا مجتمع لشکرِ اسلام کا — اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک — کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک

جو داخل سپاہِ خدا میں ہو — خدا جی سے راہِ خدا میں ہو

امام زمانہ کی یاری کرو — خدا کے لئے جاں نثاری کرو

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو — حیاتِ ابد ہے جو اس دم مرو

جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم — سزاوارِ گردن فرازی ہو تم

اپنی اس طویل مثنوی کے آخر میں مومن جہاد میں شریک ہونے اور درجۂ شہادت پانے کی آرزو کا ایک بار پھر اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب · یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار · پہ تیرے کرم کا ہوں امّید وار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے · عروج شہید اور صدیق دے

مومن خاں مومن کہ جن کی شاعری کو "بالکل جنسیاتی شاعری"[۱] کہا گیا ہے، اپنے جہادیہ اشعار کے ذریعے اس وقت کے سوئے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے جو کوشش کر رہے ہیں، اسے ملّی شاعری کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ ایسے وقت میں جبکہ ان کے ہم عصر شعرا قوم و ملک کا نوحہ لکھنے میں مصروف تھے، یہ برطانوی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے۔

کہتے ہیں یہ ہم حیات کے خاک اس میں ہوں گر خاک
پر اب تو زمیں بوس کلیسا نہ کریں گے

مومن کے بعد جس شاعر کا تذکرہ کرنا مقصود ہے وہ دنیائے شاعری میں انجانی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کی جہادیہ نظم مجاہدین کے لئے طبل جنگ کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ مولوی خرّم علی بلہوری (م: ۱۸۵۴ء) تھے۔ یہ کئی دینی کتابوں کے مصنف تھے۔ سید احمد بریلوی کے ساتھ جہاد کے لئے سرحد گئے تھے، مگر دعوت و تبلیغ کے لئے واپس آ گئے۔[۲] انہوں نے ایک جہادیہ نظم لکھی

---

[۱] فتحپوری، علامہ نیاز: اردو غزل گوئی ولی سے عہد حاضر تک، مطبوعہ نگار، لکھنؤ (اصناف سخن نمبر) جنوری فروری ۱۹۵۷ء، ص ۱۱

[۲] مہر، غلام رسول: جماعت مجاہدین، جلد سوم، ص ۲۹۴

تھی[1]۔ بعض اصحاب اسے میدانِ جنگ میں خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے تاکہ مجاہدین کے دلوں میں اسلامی جہاد کا جوش تازہ ہو[2]۔ منتخب اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ شاعر نے جہاد کی فضیلت و اہمیت واضح کرنے کے لئے کتنا پر اثر اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔

فرض ہے تم پہ مسلمانو جہادِ کفّار
اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیں دار

اے برادر تو حدیثِ نبوی کو سن لے
باغِ فردوس ہے تلوار کے سائے کے تلے

فتنۂ قبر و غمِ صور و قیامِ محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو ہیں ہر کچھ ڈر

حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں

دینِ اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام گھٹا جاتا ہے

پیشوا لوگ اسی طرح جو کرتے نہ جہاد
ہند پھر کس طرح اسلام سے ہوتا آباد

دوستو جب ہمیں مرنا ہی مقدر ٹھہرا
پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجئے در راہِ خدا

---

[1] "شہیدِ حریت" مرتبہ شان الحق حقی میں یہ نظم مولوی لیاقت اللہ کے نام سے درج ہے۔
ملاحظہ ہو ص ۴۷ تا ۵۱

[2] مہر، غلام رسول: جماعت مجاہدین، جلد سوئم ص ۲۹۹

خرّم علی بلہوری کی طویل جہادیہ نظم ان دعائیہ اشعار پر ختم ہوتی ہے ؎

اپنا دے زور، مسلمانوں کو زور آور کر

وعدۂ فتح جو ہے ان سے، اسے پورا کر

ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اے شاہ

کہ نہ آوے کوئی آواز جز اللہ اللہ

سید احمد شہید کو عوام میں جو مقبولیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرمّت خاں مرمّت جیسے گمنام شاعر جو پیشے کے لحاظ سے سپاہی تھے، ان کے عقیدت مندوں میں تھے اور انہیں صدقِ دل سے اپنا روحانی پیشوا اور سردار مانتے تھے[1]۔ مرمّت کا زیادہ تر کلام اردو غزلوں کے علاوہ ہندوی انداز کے گیتوں پر مشتمل ہے۔ ایسے ہی ایک گیت میں وہ سید احمد کے ساتھ اپنی عقیدت مندی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

جائیں گے مست فقیر ——— کوئی دن یاد کرو گے

نین ہمارے پیو کے کارن بھر بھر لاوت نیر ——— کوئی دن یاد کرو گے

جا جنگل بیچ دھونی رمائیں گے، ماٹی کریں گے سر پر ——— کوئی دن یاد کرو گے

ہادی ہمارے اہلِ شریعت، سید احمد پیر ——— کوئی دن یاد کرو گے

مرمّت خاں نے ایک اور گیت میں سید احمد کے ساتھ اپنی والہانہ شیفتگی کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

نین روت نت ——— کرے گی ناری عمر اکارت کٹ گئی ساری

سکھیاں سگری پار اوتر گئیں اوگنہ بڑھی نیا ہماری

---

[1] سیتا پوری، نادم: مرمّت خاں مرمّت، مطبوعہ نقوش، لاہور، نومبر ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۰

سید احمد کے بل بل جاؤں   جن بیرا کر گہ پار اتاری

مجاہدین کے سالار اعظم سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لئے مرتمنت نے اردو کی روایتی شاعری سے ہٹ کر گیت کا سہارا لیا ہے۔ اب تک ہم ۱۸۰۷ء کے بعد لکھی جانے والی جتنی منظومات کا جائزہ لے چکے ہیں، ان میں مرتمنت کی نگارشات ہئیت کے لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہیں۔ یہاں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جذبات کے اظہار کے لئے کوئی فارم متعین نہیں ہوتا۔ جس طرح غزل سے ہٹ کر مثنوی قطعہ، رباعی، مخمس اور مسدس کو اظہار کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، اسی طرح گیت اور دوہرہ جیسی اصناف سخن بھی جذبات و خیالات کا مظہر بن سکتی ہیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ آزادی کے سلسلے میں لکھی جانے والی نظمیں اپنی ہئیت کے لحاظ سے کس درجہ منفرد اور یگانہ ہیں۔

اس قافلۂ مجاہدین میں ایک برگزیدہ شخصیت بھی شامل تھی۔ یہ شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے مولانا شاہ اسمٰعیل تھے جو ایک ادنیٰ سپاہی کی طرح سید احمد کی اطاعت و فرماں برداری کر رہے تھے۔ وہ ایک علم دوست خانوادے کے فرد ہونے کے ماسوا خود صاحب علم و دانش تھے۔ فن تقریر میں انہوں نے اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کی تھی۔ دینی علوم میں انہیں کمال تھا۔ ان کے وعظ کی محفلوں میں مولوی امام بخش صہبائی اور مفتی صدرالدین آزردہ جیسی سربرآوردہ شخصیتیں شریک ہوتی تھیں۔[1]

جب سید احمد جہاد کی تحریک پیدا کرنے کے لئے ملک کے طویل دورے پر نکلے تو شاہ اسمٰعیل جیسے فقید المثال مقرر بھی ان کے ساتھ تھے۔ جہاں کہیں بھی سید احمد

---

[1] ملک عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، ص ۳۴۲

کا قافلہ ٹھہرا۔ شاہ اسمٰعیل نے عوام کو جہاد میں شرکت پر آمادہ کیا اور ان کے دلوں میں حصولِ آزادی کا جذبہ ابھارا۔ یہ ان ہی کی باتوں کا اثر تھا کہ سلطانانِ برِعظیم سید احمد بریلوی جیسے جیالے سپہ سالار کے گرد جمع ہو گئے۔[1] گویا شاہ اسمٰعیل کی زبان سید احمد کے دل کی پکار بن گئی۔

اور جب سید احمد کی زیرِ قیادت میں مجاہدوں کا پرجوش قافلہ پشاور کی سمت روانہ ہوتا ہے تو علم و دانش کے پیکر شاہ اسمٰعیل ایک سرگرم مجاہد کی طرح ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اپنی شمشیرزنی کا جوہر دکھاتے ہوئے وطن کی راہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔

مولوی محمد حسین فقیر نے اس عظیم و جلیل شخصیت کو اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا یہ قصیدہ "در فضائل صبر نبیل مولانا محمد اسمٰعیل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے[2]۔ فقیر اپنے ممدوح کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

عالم ایسے تھے کہ کیا علم کا ان کے ہو بیاں
علما کو بھی رہی علم سے ان کے حیرت
صرف میں نحو میں وہ رتبۂ عالی ان کا
ابن حاجب کی نہ تھی عہد میں انکے حاجت
اہلِ معقول بنے ان کے بیاں سے معقول
اہلِ ہیئت پہ رہی ان کی ہمیشہ ہیبت
ہر اشارہ تھا اشارات[3]، شفا[4] تھا ہر لفظ
بو رسینا کو کلام ان کا سکھا دے حکمت

---

[1] احمد، خواجہ جمیل: Hundred Great Muslims، ص ۴۴۵
[2] مہر، غلام رسول: جماعت مجاہدین، جلد سوم، ص ۳۱۷
[3] تصنیف شاہ اسمٰعیل
[4] ایضاً

علم تفسیر کو کیا کہیے کہ گویا ان کو

ابن عباس کی تھی روح سے حاصل قربت

اس قدر علم احادیث رسول حق تھا

نائب ختم رسل ان کی مناسب ہے صفت

یہ نائب رسول جب میدان جہاد میں کفاروں سے معرکہ آرا ہوتا ہے تو اس کی شمشیر براں دشمنوں کے لئے پیام اجل ثابت ہوتی ہے۔ محمد حسین فقیر اس شمشیر زنی کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں:

ان کی شمشیر کا زہراب ملا دیتا تھا

فوج کفار کے دریا میں عجب سمیت

یہ سنا ہوگا کہ سکھوں کو بہت قتل کیا

سکھ سے پھر رہ نہ سکے سکھ ہوئے ایسے غارت

فقیر کے مندرجہ ذیل شعر سے شاہ اسمٰعیل اور دیگر مجاہدین کا مقصدِ حیات بخوبی عیاں ہو جاتا ہے:

مال سے ملک سے اور جاہ سے کچھ کام نہ تھا

تھا تو یہ کام تھا عالی ہو یہ دین ملت

مگر عظیم مجاہدین کا یہ قافلہ مقامی سازشوں کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل اور ان کے بے شمار ساتھی بالاکوٹ میں شہید کر دیے گئے۔ سید عبدالرزاق کلامی نے سپہ سالار اعظم کی خدمت میں گل ہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

فنا عشق مولا میں وہ ہو گئے	ہیں دونوں جہاں انکے قدموں تلے
خوشی سے وہ جام شہادت چڑھا	ہوئے واصلِ حضرتِ کبریا

ہمیشہ ہو ان پر خدا کا کرم   وہ تھے ہادی و رہنمائے امم

اگرچہ قوم کا یہ ہادی و رہنما بالاکوٹ کی سرزمین میں دفن کر دیا گیا لیکن اس کی جلائی ہوئی شمع بجھائی نہ جا سکی۔ اس کی لو آنے والے طوفان میں اور بھی تیز ہوتی گئی اور اس سے پھوٹنے والی روشنی میں حریت پسندوں کا قافلہ آگے بڑھتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو کی قومی و سیاسی شاعری میں تاب و توانائی آتی چلی گئی۔

چھٹا باب

انقلاب ۱۸۵۷ء اور اردو شعرا

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء[1] کی صبح کو میرٹھ کی فوجی چھاؤنی میں انقلاب کی دبی ہوئی چنگاری شعلۂ جوالہ بن کر اٹھی تو برطانوی استبداد کے قصر و ایواں جھلس اٹھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کو جو بادشاہ دہلی کے گماشتے[2] بن کر سیاہ و سفید کے مالک بن گئے تھے، یہ آگ اس طرح چاٹ رہی تھی، جیسے جنگل کے بھڑکتے ہوئے شعلے مضبوط و تناور درختوں کو ہم آغوش کئے چلے جاتے ہوں۔ انقلاب و آزادی کی یہ آگ جو چربی آمیز کارتوسوں سے بھڑکی تھی، انگریز مورخوں[3] کی نظر میں اس وقت بھی "غدر" کے نام سے موسوم تھی جب شاہِ برطانیہ کا جھنڈا برِعظیم کے سینے پر نصب تھا، اور آج بھی جبکہ آزادی حاصل ہوئے ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، اسی عنوان سے رقم کی جاتی ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جو سارے عالم کے حالات و کوائف کو حقائق کی روشنی میں پیش کرنے کا دعویٰ کرتی ہے، آزادی کی اس جنگ کو "غدر" کا عنوان عطا کرتی ہے[4]۔ موجودہ دور کا غیر متعصب مورخ پرسیوال اسپیر بھی عصبیت کی عینک لگا کر جب واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے تو یہ کہنے سے دریغ نہیں کرتا کہ "حقیقت میں اس غدر کو جدید آزادی کی پہلی کوشش قرار دینا قبل از وقت ہوگا۔"[5]

---

[1] غلام رسول مہر ۱۱ مئی کی تاریخ درج کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو سرگذشت مجاہدین، چوتھی جلد، ص ۲۹۱

[2] ہنٹر، ڈبلو ڈبلو: *The Indian Musalmans*، ص ۱۵۳

[3] مثلاً ایولن ووڈ، چارلس بال، میلی سن، سرجان ولیم اور کیسی

[4] انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا، جلد ۱۲، ص ۱۴۸ ـــ راقم الحروف کے احتجاجی مراسلے کے جواب میں ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ اگلے ایڈیشن میں عنوان بدل دیا گیا ہے، لیکن وہ بھی ہمارے نقطۂ نظر سے تسلی بخش نہیں۔ ملاحظہ ہو محمود الرحمٰن: انسائیکلو پیڈیا کی پاکستان دشمنی، مطبوعہ روزنامہ جنگ، ص ۱، مورخہ ۸ اپریل ۱۹۷۹ء

[5] اسپیر، پرسیوال: *The Oxford History of Modern India*، ص ۲۱۹

لیکن ہماری اپنی تاریخ یہ واضح کرتی ہے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں کارتوسوں سے بھڑک اٹھنے والی یہ آگ محض اتفاقی نہ تھی۔ اس کے پس پردہ جدّوجہد آزادی کی ایک طویل داستان مضمر ہے۔ آیئے تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھیں کہ ۵۷ء کے انقلاب کا پس منظر کیا ہے اور پھر اس ہنگامۂ دار و گیر کے زیر اثر تخلیق کی جانے والی شاعری ہمارا موضوع بحث ہوگی۔

۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اس حقیقت کی غمّاز ہے کہ نوجوان مجاہد سراج الدولہ بنگال کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے کس طرح سراپا جدوجہد بنا ہوا تھا۔[۱] نوہی سال بعد ۱۷۶۴ء میں میر قاسم، نواب شجاع الدولہ اور شاہ عالم ثانی کے اتحاد نے "کمپنی کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا تھا"۔[۲] بنگال، اودھ اور دہلی کی متحدہ فوج بکسر کے مقام پر حصولِ آزادی کے لئے انگریزوں سے معرکہ آرا ہوئی تھی۔ اسی سال وہاں کمپنی کی فوج میں متعین دیسی سپاہیوں نے میجر سکیٹر ہزی کی ناانصافی اور تنگ نظری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا، جس کے نتیجے میں ان سبھوں کو بندوق کی نالیوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔[۳] ادھر دکن میں حیدر علی برطانوی سیلاب بلا کے سامنے آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا اور ۱۷۶۶ء سے ۱۷۸۱ء تک اس بیرونی طاقت کو بیخ و بن سے اکھیڑنے کے لئے اس کی تلوار خوں آشام بے نیام رہی۔[۴] اس کا بہادر اور وطن دوست

---

[۱] وڈرف، فلپس: The Men Who Ruled India، جلد اول، ص ۱۰۰ و بعدہٗ

[۲] اسپیئر، پرسیوال: The Oxford History of Modern India، ص ۳۰

[۳] عزیز، اے: Discovery of Pakistan، ص ۲۵۹-۲۶۰

[۴] سوسائٹی، پاکستان ہسٹاریکل: A Short History of Hind-Pakistan، ص ۳۴۶-۳۵۰

بیٹا ٹیپو سلطان سترہ سال تک انگریزوں سے نبرد آزما رہا اور ۱۷۹۹ء میں اپنی قلمرو کے دفاع میں مردانہ وار لڑتے ہوئے جان دے دی۔[1] ان دونوں باپ بیٹے نے برعظیم کو فرنگیوں سے نجات دلانے اور آزادی کا پرچم بلند کرنے کے لئے ربع صدی تک جو جدّوجہد کی ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔

انگریزوں نے برعظیم میں اپنے قیام کو مستحکم کرنے کے لئے ابتدا ہی سے فوج رکھنے کا طریقہ اختیار کیا تھا اور اس میں زیادہ تعداد دیسی لوگوں کی تھی۔ یہ دیسی سپاہی پیٹ کی خاطر فرنگیوں کی نوکری تو کر رہے تھے، لیکن جہاں بھی موقع ملا، حاکموں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے، انقلابی نعرے لگاتے رہے اور ان سے معرکہ آرا ہوتے رہے۔ اس انقلابی مہم کا آغاز جیسا کہ پچھلے صفحے پر ہم لکھ آئے ہیں، بکسر سے ہوا۔ پھر ۱۸۰۶ء میں مدراس کے علاقے ویلور میں دیسی سپاہیوں نے جو ٹیپو کے حامی تھے، انقلاب برپا کر دیا۔ وہاں جتنے بھی انگریز افسران موجود تھے، ان سبھوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر مرحوم سلطان کا پرچم فضا میں لہرایا گیا۔[2] ارکاٹ میں مقیم کرنل رولو کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو دندناتا ہوا وارد ہوا اور پانچ سو انقلابیوں کو ہلاک کر دیا۔[3] واضح رہے کہ انگریز حاکموں کے خلاف دیسی سپاہیوں میں نفرت وکدورت کا یہ جذبہ ٹیپو سلطان کی شہادت کے سات سال بعد انقلاب کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ حصولِ آزادی کی لہر ۱۷۹۹ء کے بعد بھی ان ملکی سپاہیوں میں جاری وساری تھی۔

---

[1] قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ، ص ۲۲۴

[2] برگیس، جیمس: The Chronology of Modern India، ص ۲۸۹

[3] ایضاً

اگلے ہی سال' اسی ویلور کے مقام پر یہ جذبۂ آزادی دوبارہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ برطانوی سپہ سالار نے دیسی فوجیوں میں ہر قسم کا ظاہری امتیاز ختم کرنے کے لئے یہ حکم نافذ کیا کہ وہ ڈاڑھی منڈائیں گے اور اپنے سروں پر پگڑی نہیں باندھیں گے[۱]۔ اس حکم سے شدید اشتعال پیدا ہوا اور دیسی سپاہی انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے[۲]۔ یہ ہنگامہ جسے سی' ای' فلپس نے "غدر" کے نام سے موسوم کیا ہے[۳]' فی الحقیقت انگریز حاکموں کے خلاف غم و غصے کا ابلتا ہوا لاوا تھا۔

۱۸۲۴ء میں جب انگریز برما پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنا رہے تھے دیسی سپاہیوں پر مشتمل سینتالیسویں ڈویژن فوج نے سمندر کا سفر اختیار کرنے سے نہ صرف انکار کیا' بلکہ اس میں غم و غصے کے آثار نمایاں ہو گئے اور معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا[۴]۔ انگریز کپتان نے حکم عدولی پر بندوق کی باڑھ ماردی جس سے بیشتر سپاہی ہلاک ہو گئے۔ کمانڈر انچیف چارلس نیپیئر نے اس انکار اور غم و غصے کے پس پردہ خطرے کی گھنٹی بجتی ہوئی سن لی تھی اور اپنے ایک خط کے ذریعے گورنر جنرل ڈلہوزی کو آگاہ کر دیا تھا[۵]۔

یہی وہ زمانہ تھا جب شاہ عبدالعزیز کے فتوے نے برعظیم کے مسلمانوں

۱۔ عزیز' اے: Discovery of Pakistan' ص ۲۵۸

۲۔ اسٹیل: India Through The Ages' ص ۳۴۶

۳۔ منقول عزیز' اے: ایضاً

۴۔ سوسائٹی' پاکستان ہسٹاریکل: A Short History of Hind-Pakistan' ص ۳۶۸

۵۔ عزیز' اے: ایضاً' ص ۲۵۹

میں انگریزوں کے خلاف معرکہ آرا ہونے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ سید احمد شہید نے اسی مشن کے تحت ملک کا طولانی دورہ کیا تھا اور ایک ایسی جماعت کی تشکیل چاہتے تھے جو نصاریٰ کے بڑھتے ہوئے تسلط سے ملک کو آزاد کرالے۔ انہیں اس امر کا شدید احساس تھا کہ "نصاریٰ ہندوستان کے بلاد پر دریائے سندھ سے ساحلِ بحر تک قابض ہو گئے ہیں" [1] چنانچہ وہ برطانوی استبداد کا جم کر مقابلہ کرنے کے لئے راہ ہموار کر رہا چاہتے تھے اور ۱۸۳۱ء کی جنگِ بالاکوٹ ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی [2] جس کے تحت وطن کو اجنبی حکمرانوں سے پاک کرنا تھا۔

جس وقت سید احمد شہید مغربی خطے میں حصولِ آزادی کی راہ ہموار کرنے کی جدّ و جہد میں مصروف تھے، ان کے شاگرد تیتومیر بنگال میں انگریزوں سے براہ راست معرکہ آرا ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنے گاؤں نرکل باڑیہ کو جنگِ آزادی کی تحریک کا مرکز بنایا تھا اور اپنے تمام پیروؤں کو وہاں جمع کر لیا تھا۔ گاؤں کے چاروں طرف بانس کی مضبوط فصیل کھڑی کر لی گئی تھی۔ پنجاب کے رہنے والے ایک شخص مسکین شاہ کو تیتومیر نے اپنا نائب مقرر کیا تھا اور غلام معصوم نام کے آدمی کو مجاہدین کا سپہ سالار بنایا تھا۔

بانس سے تعمیر شدہ اس قلعے کے اندر چار ہزار کے قریب مجاہدین ظلم و ناانصافی کو ختم کرنے اور آزادی کا علم بلند کرنے کے لئے تیار تھے۔ پھر تیتومیر میدانِ عمل میں اترتے ہیں اور پورنا پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ندیا، لدگھاٹا، جیسور، رام چندر نگر اور ہگلی پر مسلمان مجاہدوں کا قبضہ ہو جاتا ہے اور دلیرو

---

[1] ملک، عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، ص ۴۱۸

[2] ندوی، مولانا ابوالحسن علی: سیرۃ شہید احمد شہید، ص ۱۲۶-۱۲۷

جاں باز مجاہد تیتو میر انگریزی راج کے خاتمے اور دوبارہ اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کا اعلان کردیتے ہیں۔[1]

جب مقامی انگریز حکام تیتو میر کی اس فوج کو نہ دبا سکے تو کلکتے سے نومبر ۱۸۳۱ء میں کمانڈر الیگزنڈر کی سربراہی میں ملیشیا فوج روانہ کی گئی، لیکن اسے بھی شکست کا سامنا نصیب ہوا۔ آخر انگریزوں کی ایک بڑی فوج بندوقوں سے لیس اور دو عدد توپوں کے ہمراہ بانس کے بنے ہوئے قلعے تک پہنچی۔ نیزوں اور ڈنڈوں سے مسلح مجاہدین نے دشمنوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا، لیکن تابکے! توپ و بندوق کی زد میں آکر حریت کے نہتے علمبردار شکست کھا گئے اور تیتو میر میدان جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔[2]

اسی بنگال میں حاجی شریعت اللہ (م: ۱۸۴۰ء) کی فرائضی تحریک اہل بنگال کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بڑا اہم کام کررہی تھی۔ پھر ان کی انقلابی تحریک کو ان کے بیٹے دودو میاں (م: ۱۸۶۲ء) نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے محض دین کے احیاء کے لئے ہی مخصوص نہیں کیا بلکہ سیاسی سرگرمیوں کے لئے وقف کردیا اور تازندگی انگریزوں سے نبرد آزما رہے۔ برطانوی حکام ہمیشہ ان کی جدّوجہد آزادی سے خائف رہے۔ چنانچہ اسے دبانے کے لئے ان کی گرفتاری کے سمن جاری کئے گئے اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے جرأت و حوصلے کے ساتھ جو اعلان کیا تھا، وہ پورے برعظیم کے مجاہدین آزادی کا اعلان تھا۔ اس کی گمک آج بھی سنائی دے رہی ہے:

---

[1] ملک، عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہدِ آزادی، ص ۴۶۴

[2] واقعہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ایضاً، ص ۱۷۵ — ۱۸۲

"ان کے نام جو سمن جاری ہوں گے' ان کی تعمیل
صرف دودو میاں نہیں کریں گے' بلکہ پچاس
ہزار دودو میاں اس آواز پر اٹھ کھڑے ہونگے۔"[1]

دودو میاں ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقل ہوتے رہے لیکن ان کے ہزاروں ماننے والوں نے صوبۂ بنگال میں آزادی کی مشعل کو جلائے رکھا۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ حقیقت ترشح ہوجاتی ہے کہ اہلِ وطن کے دلوں میں حصول آزادی کا جذبہ جنگِ پلاسی کے وقت سے ہی موجزن تھا۔ وہ انگریزوں سے اپنی دلی نفرت کا اظہار موقع بہ موقع کرتے رہے تھے۔ ان کے وجود سے اپنی سرزمین کو پاک کرنے کی کوشش سو سال سے جاری تھی۔ اس طویل جدوجہد میں سراج الدولہ سے لے کر ٹیپو سلطان تک اور سید احمد شہید سے لے کر دودو میاں تک — سبھی شامل تھے۔ ویلور کے دیسی سپاہی ہوں یا بنگال کی سینتالیسویں ڈویژن فوج' سبھی کا عمل مشترک تھا — یعنی حصول آزادی!

باشندگانِ برعظیم کے رگ وپے میں جاری وساری اس لہر کو لارڈ کیننگ نے انقلاب ۵۷ سے دو سال قبل ہی محسوس کر لیا تھا' جبکہ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ایک دعوت[2] میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا:

"ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان کے افق پر

---

[1] منقول ملک' عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی' ص ۱۶۰

[2] یہ تقریب اگست ۱۸۵۵ء میں منعقد ہوئی تھی۔

جو فی الحال پر سکون ہے' بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا
ضرور نمایاں ہو سکتا ہے۔ ابتدا میں یہ انسانی ہاتھوں
سے بھی زیادہ بڑا نہ ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ اتنا بڑا
ہو جائے گا کہ ہم سب کو گھیر کر کچل ڈالے گا"۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ "بادل کا ٹکڑا" فضا پاک و ہند میں ۱۷۵۷ء سے ہی نمایاں تھا جسے برطانوی حکمران اپنی قوت کے نشے میں نظر انداز کر رہے تھے ــــ اور یہی ٹکڑا انسانی ہاتھوں سے بھی زیادہ بڑی شکل میں ابھرنے لگا جب ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے واجد علی شاہ اختر کو معزول کر کے سلطنتِ اودھ پر اپنی حکمرانی قائم کر لی۔ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہی وہ سانحہ ہے جو آزادی کے متوالوں کے لئے تازیانہ ثابت ہوا۔

برطانوی استبداد کے خلاف مہم کا پر زور آغاز اسی سال اپریل کے مہینے میں ہوتا ہے جب معزول شاہِ اودھ کے درباریوں نے باقاعدہ ایک اسکیم مرتب کی اور مخفی طور پر نمائندے ملک کے اطراف میں بھیجے گئے تاکہ عوام اور دیسی سپاہ کی حمایت حاصل کریں۔[2] میلی سن کی بھی یہی دلیل ہے کہ "اس سازش میں نواب اودھ کے درباری اور بہی خواہ شامل تھے"۔[3]

زوالِ اودھ کے بعد پورے ملک میں چپاتیوں کی تقسیم تحریکِ آزادی کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ چپاتیاں ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک گاؤں

---

[1] فریزر، آر ڈبلو: British India، ص ۲۷۳

[2] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر) A Short History of Pakistan، جلد چہارم، ص ۱۱۹

[3] میلی سن: History of the Indian Mutiny، جلد پنجم، ص ۲۹۲

سے دوسرے گاؤں منتقل ہو رہی تھیں[۱]۔ روٹیوں کی یہ ترسیل دراصل پیغام رسانی کی ایک صورت تھی جس کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں بسنے والے باشندوں کو انقلاب کے لئے آمادہ کیا جا رہا تھا۔ مورخ ووڈ کے بقول "انگریز افسران ہندوستانیوں کی اس عجیب و غریب حرکت پر محض مسکرا کر رہ جاتے تھے لیکن ایک احساس سبھوں کو تھا کہ ہو نہ ہو اس میں کوئی راز ضرور ہے"[۲]

یہی وہ وقت تھا جب مولوی احمد اللہ شاہ ملک میں طوفانی دورہ کر رہے تھے اور عوام کو جنگِ آزادی کے لئے پوری طرح تیار ہو جانے کا حکم دے رہے تھے۔ "ان کی باغیانہ تحریریں پورے اودھ میں در و دیوار پر چسپاں نظر آ رہی تھیں"[۳]

انگریزوں کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ پورے ملک میں ان کے خلاف "سازش" کی جا رہی ہے اور مولوی احمد اللہ اس کے سرغنہ ہیں[۴]۔ ایک انگریز مورخ ہومز اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا کہ

> "انگریزوں کو خفیف سا وہم بھی نہ تھا کہ ان کی حکومت میں تزلزل پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس مولوی کی صلاحیت فتنہ انگیزی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کر سکے۔ کئی ماہ بعد حقیقت منکشف ہوئی اور وہ شخص

۱؎ سوسائٹی "پاکستان ہسٹاریکل": A Short History of Hind-Pakistan، ص ۳۶۸

۲؎ میلی سن: History of the Indian Mutiny جلد چہارم، ص ۳۹۷

۳؎ سر ایو بلین ووڈ مصنف "Revolt in Hindustan" کے اس نظریے کو اے عزیز نے اپنی کتاب Discovery of Pakistan میں نقل کیا ہے۔ ص ۲۶۴

۴؎ میلی سن: ایضاً، ص ۲۹۲

ان سازشیوں کے گروہ کا سردار ثابت ہوا جو اپنے ہم
مذہبوں کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت
کے جذبات برانگیختہ کرتے رہتے تھے"۔[۱]

انگریز مورخوں کی درج بالا نا ویلات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سن ستاون کی جنگ آزادی محض "چربی زدہ کارتوسوں" کی بنا پر سپاہیوں کی "بغاوت" نہ تھی۔ یہ وہ آگ تھی جو برعظیم میں انگریزوں کی آمد کے بعد ان کے خلاف سلگتی رہی تھی، حتی کہ اس سال بھڑک اٹھی۔[۲] اور جب بھڑکی تو پھر میرٹھ ہی انقلاب کے نعروں سے نہیں گونج رہا تھا، سارے برعظیم میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اگر یہ محض سپاہیوں کا واویلا ہوتا تو ویلور کی طرح کب کا دب گیا ہوتا۔

اسی میرٹھ سے مجاہدوں کا کاروانِ بے پناہ دہلی کی طرف کوچ کر گیا اور بہادر شاہ ظفر سے انقلاب کی قیادت سنبھال لینے کی استدعا کی گئی۔ اس بوڑھے مغل بادشاہ کو اپنی تہی دامنی کا احساس تھا، چنانچہ بڑی مایوسی سے جواب دیا کہ "نہ میرے پاس فوج ہے، نہ اسلحہ نہ خزانہ"۔[۳] لیکن مجاہدین یک زبان ہو کر کہہ اٹھے:

"آپ صرف اپنی رضامندی ظاہر کر دیں۔ ہم ہر چیز مہیا
کریں گے۔ میرٹھ میں انگریزوں کو شکست ہو چکی ہے۔ دہلی
آپ کے ہاتھ میں ہے، اور پشاور سے کلکتے تک سارے

---

[۱] ہومز: 'History of the Indian Mutiny' ص ۷۱

[۲] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر) 'A Short History of Pakistan' جلد چہارم، ص ۲۹۴

[۳] پال چارلس: 'Indian Mutiny' جلد اول، ص ۷۷

سپاہی اور عوام آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ سارا ہندوستان
غلامی کی زنجیریں توڑ دینے اور خداداد آزادی حاصل
کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اب آپ آزادی کا پرچم
اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ ہندوستان کے بہادر عوام اس کے
نیچے جمع ہو کر اپنی جدوجہد کا آغاز کریں۔ آپ ملک کی
باگ ڈور سنبھال لیں اور ہم ایک لمحے میں ان فرنگی
آسیبوں کو سمندر میں غرق کر دیں گے"۔[۱]

مغل بادشاہ نے نہایت عزم و حوصلے کے ساتھ باگ ڈور سنبھال لی۔ ملک کی
بیشتر ریاستوں نے دہلی کی مرکزی سلطنت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی وفاداری کا
اعلان کر دیا۔ اور جب بخت خاں چودہ ہزار کی فوج لے کر دہلی پہنچا تو مغل سلطنت
کے استحکام کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اب سیاست کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ انگریزوں
کی شکست و ہزیمت کی علامتیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ملک کے طول و عرض میں
برطانوی استبداد کے خلاف مورچے قائم ہو گئے تھے۔ قریہ قریہ اور شہر شہر آزادی
کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ انگریزوں کو کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ سارا ملک ان
کو ولیس نکالا دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بقول سر جون ولیم کئی:

"وہ جنگلوں اور ویران عمارتوں میں چھپتے پھر رہے تھے۔
اپنے ملبوسات سے فوجی نشانات نوچ نوچ کر پھینک
رہے تھے اور خرگوشوں کی مانند ڈرے سہمے گڑھوں اور

---

[۱] پال' چارلس: Indian Mutiny' جلد اول' ص ۷۷
[۲] قریشی' اشتیاق حسین (ایڈیٹر): A Short History of Pakistan' جلد چہارم' ص ۱۲۴

سوراخوں میں دبکے بیٹھے تھے۔"[1]

لیکن اس لمحۂ رستاخیز میں انہوں نے اپنی دیرینہ حکمت عملی کو از سر نو دہرایا اور بہادر شاہ ظفر کے خاص خاص مقربین کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ میر جعفر اور میر صادق کی طرح اپنے یہاں بھی منشی رجب علی، حکیم احسن اللہ اور مرزا الٰہی بخش جیسے لوگ ہاتھ آ گئے اور انہیں بڑے بڑے لالچ دے کر اس امر پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ گولہ بارود کے ذخیرے کو تباہ کر دیں۔ ظاہر ہے، بارود کی عدم موجودگی میں تمام آلاتِ حرب بیکار رہتے۔ دشمن دروازے پر کھڑا تھا۔ باہر سے کسی قسم کی امداد ملنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ادھر انگریزوں کی مدد کے لئے سکھوں کی "مسیح ٹرین" پہنچ چکی تھی۔[2]

بالآخران حالات میں انگریز دندناتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے۔ عین اس وقت جنرل بخت خاں بہادر شاہ ظفر کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ "بیشک انگریز شہر پر قابض ہو گئے ہیں اور قلعہ انہوں نے لے لیا ہے، لیکن ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ بادشاہ کے نام اور وجود کے زیر سایہ جنگ برقرار رہ سکتی ہے لہٰذا وہ لکھنؤ چلیں۔"[3] لیکن حکیم احسن اللہ نے بادشاہ کو ایسا کرنے سے روک دیا۔[4] اس پر بخت خاں نے بہادر شاہ کو سمجھایا کہ "حکیم انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور آپ کو غلط راستے پر ڈال رہا ہے۔ آپ کو اس سے انجام کار نقصان

---

[1] کئی، سر و جون ولیم: History of the Sepoy War in India، جلد دوم، ص ٦

[2] اسپیر، پرسیوال: Twilight of the Mughals، ص ۲۱۵

[3] میلی سن: History of the Indian Mutiny، جلد چہارم، ص ۵۰

[4] اسپیر، پرسیوال: ایضاً، ص ۲۱۶

نقصان پہنچے گا۔[۱] بادشاہ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور بخت خاں لکھنؤ چلا گیا۔[۲]

حصول آزادی کا نادر موقع درباری سازشوں اور متعصب سکھوں[۳] کی بدولت ہاتھ سے جاتا رہا۔ اسلامی سلطنت کا لہراتا ہوا پرچم سرنگوں ہو گیا۔ تخت شاہی بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ سے چھن گیا۔ برعظیم پاک و ہند میں مغلیہ دور کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ مسلمانوں کے عروج و ارتقا کی بساط الٹ گئی۔ ان کے اثر و اقتدار کی رہی سہی نشانی بھی ناپید ہو گئی۔ اب ہر طرف ناامیدی کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی اور خوف و دہشت کی دلدوز فضا ہر سو طاری تھی۔

حسرت و یاس کا یہ عالم تھا اور دوسری جانب فتح و نصرت کے نشے میں سرشار گورا فوج ظلم و ستم کا بازار گرم کر رہی تھی۔ شہر دہلی میں کسی شخص کی بھی زندگی محفوظ نہ تھی۔[۴] کمشنر دہلی کی بیوی مسز سانڈرز کے بقول "جہاں کہیں بھی کوئی ملکی باشندہ نظر آیا، اسے فوجیوں نے گولی سے اڑا دیا۔"[۵] علاوہ ازیں تختہ دار پر لوگ دھڑا دھڑ لٹکائے جا رہے تھے۔[۶] عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اپنے ہی شہر

---

[۱] اسپیئر پرسیوال: Twilight of the Mughals، ص ۲۱۶

[۲] مہر، غلام رسول: ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۱۱۷

[۳] سر جون لارنس نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ "اگر سکھ ہمارا ساتھ نہ دیتے تو کوئی بھی ہمیں تباہی سے بچا نہیں سکتا تھا"۔ منقول از عزیز: Discovery of Pakistan، ص ۲۷۳

[۴] اسپیئر پرسیوال: ایضاً، ص ۲۱۸

[۵] منقول ایضاً، ایضاً

[۶] ٹروٹر، ایل، جی: India under Victoria، جلد دوم، ص ۳۱

اپنی ہی گلی اور اپنے ہی مکان میں لوگوں کو پناہ نہیں مل رہی تھی۔ دیواریں ڈھائی جا رہی تھیں۔ مکانات منہدم کیے جا رہے تھے۔ بلند و بالا مینار زمیں بوس ہو رہے تھے۔ مدفون خزانے کی تلاش میں گورا سپاہی ہر گھر کی بنیادیں کھود رہے تھے شاہی محل بیخ و بن سے اکھڑ رہے تھے۔ دنیا کی بے نظیر حرم سرائیں زیر و زبر کر دی گئی تھیں۔ ہرے بھرے باغات ویران و برباد ہو رہے تھے[1]

اٹھارہ سو ستاون کا یہ ناکام انقلاب اور اس کے ہمہ گیر اثرات نہ صرف برعظیم کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں بلکہ اردو شاعری کا بھی خاص موضوع بنے ہیں۔ عام مورخوں کی طرح شعرا کی نگاہوں نے بھی یہ منظر دیکھا کہ سات سمندر پار سے آئے ہوئے فرنگی اپنی حکمت عملی اور جوڑ توڑ کی بدولت اس ملک پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان سخنوروں کے سامنے یہ تلخ حقیقت بالکل نمایاں تھی کہ کوچۂ دہلی جو کبھی اوراقِ مصور تھی ـــ اب وہاں توپ و تفنگ کا پہرہ تھا اور سنگین و سلاسل کی یورش تھی۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے حسین و جمیل عمارتوں کا یہ شہر کھنڈر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ان کی امیدوں کا آخری مرکز ـــ قلعہ معلی ـــ غیروں کی تحویل میں جا چکا تھا۔ ان کے جیتے جی حصولِ آزادی کی کوششیں دیرینہ ناکامی و نامرادی کے قالب میں ڈھل چکی تھیں۔ اب ہر سو شکست و ریخت کا روح فرسا سماں ان سب کے پیش نظر تھا۔

اس پر آشوب وقت میں اردو شعرا نے اپنے فکر و فن کو لالہ و گل کی ترجمانی "بلبل کی ہم زبانی اور دل کی رام کہانی"[2] جیسے موضوعات تک محدود نہیں رکھا

---

[1] فرگوسن، جیمس: A History of the Indian and Eastern Architecture، جلد دوم، ص ۳۱۱-۳۱۲

[2] حالی، الطاف حسین: مسدس حالی، دیباچہ، ص ۱

بلکہ پہلے کی طرح اس دور کی بے سروسامانی، بربادی و ویرانی اور اضمحلال و افسردگی کو بھی اصناف سخن کا عنوان بنایا۔ عوام کی بے بسی و مایوسی ان کی اپنی بے بسی و مایوسی بن کر شعر کے قالب میں ڈھلی ہے۔ قریہ و شہر کی ویرانی ان کے اپنے نہاں خانۂ دل کی ویرانی کی صورت پیرایۂ سخن بنی ہے۔ اہلِ وطن کی چیخ و پکار شاعروں کی اپنی چیخ و پکار بن کر برعظیم کی فضا میں گونجی ہے۔ بقول قربان علی بیگ سالک:

"ہر ایک صاحب فکر و فن نے اپنے منفرد انداز میں اس دورِ زبوں کے جملہ حالات و کوائف کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔ کسی نے اپنی فغاں کو بطرز مسدس شہر آشوب بلند کیا، کسی نے اپنے نالہ کو طرز غزل بخشا۔ اگر غور کیجئے تو ہر مسدس ایک مرثیہ ہے اور ہر ایک غزل ایک نوحہ ہے۔"[1]

آئیے اب ہم سانحہ ستاون کے پس منظر میں تخلیق پانے والی شاعری کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ گل و بلبل کے روایتی انداز سے ہٹ کر ہمارے سخنوروں نے کس طور پر کربناک لمحوں کی روح کو لفظوں میں سمیٹ لیا ہے اور سیاسی تغیر و تبدل کی سچی تصویر کس طرح پیش کی ہے۔

ہمیں اس دور میں سب سے اہم سب سے نمایاں اور سب میں ممتاز شخصیت بہادر شاہ ظفر (م: ۱۸۶۲ء) کی دکھائی دیتی ہے۔ حقیقی معنوں میں وہی سارے مصائب و آلام کا مرکزی نقطہ تھے۔ وہی شمع محفل تھے کہ جن کے بجھنے سے تمام بزم بے نور ہو گئی۔ وہی امید و آرزو کا آخری سہارا تھے کہ ان کے ملک بدر ہونے

---

[1] سالک، مرزا قربان علی بیگ: تذکرۂ فغانِ دہلی، ص ۷۰

سے پوری قوم مایوس و مضمحل ہو گئی ۔ جو سچ پوچھئے تو وہی سیلاب بلاخیز کا اصلی ہدف (Target) تھے ۔ ان کی شکست و ریخت پورے ایک تہذیبی دور ایک ثقافتی سلسلے، ایک نظام سلطنت، ایک علمی و ادبی ماحول اور ایک متمدن معاشرے کی شکست و ریخت تھی ۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے الفاظ میں :

"سیاست کی بساط سے اٹھ جانا صرف ایک کمزور مغل بادشاہ کا حادثہ نہ تھا، اس کے ساتھ ایک تہذیب، ایک معاشرت اور ایک تمدن کا تصور وابستہ تھا ۔" [1]

بہادر شاہ ظفر کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ بیرونی طاقت نے نہ صرف انہیں بے دست و پا کر دیا ہے، بلکہ ملک کو لوٹنے اور عوام کو مفلوج و بے بس کرنے میں شب و روز مصروف ہے ۔ وہ عوام کی خوشحالی اور وطن کی آزادی کے خواہاں تھے ۔ گرچہ حالات پر قابو نہ تھا اور ہاتھوں میں تاب و توانائی باقی نہیں رہی تھی، لیکن دل میں امنگ و حوصلے کی چنگاری تو فروزاں تھی ۔۔۔ اور یہی چنگاری وہ عوام کے دلوں میں بھی یہ کہہ کر فروزاں کرنا چاہتے تھے ۔۔

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

لیکن رہائی اتنی آسان نہ تھی اس لئے کہ مرکزی طاقت پارہ پارہ ہو چکی تھی ۔ سلطنتِ مغلیہ ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی ۔ اجتماعی طاقت کا تصور باقی نہیں رہا تھا ۔ بہادر شاہ ظفر کو احساس تھا کہ اگر برعظیم کے سارے صوبے دار، نوابین اور رجواڑے جو علیحدہ علیحدہ خانوں میں منقسم ہیں، متحد ہو جائیں اور یک بارگی

---

[1] صدیقی، ڈاکٹر ابو اللیث : جنگ آزادی کا اثر ہندوستان پر، مطبوعہ تنقیدی ادب، مرتبہ سردار مسیح گل، ص ۱۶

دشمن پر ٹوٹ پڑیں تو ملک کی کایا پلٹ جانے کے امکانات روشن ہو جائیں سو

کشتۂ قامت جتنے ہیں اس کے آپس میں سب مل کر

کردیں اگر اک حشر بپا، کیا اچھا ہو کیا اچھا ہو

حشر برپا کرنے کی تحریک جب میرٹھ سے اٹھی، انگریزوں کو ملک بدر کرنے والی فوج جب دہلی پہنچی اور جنرل بخت خان جب قلعہ معلی آیا تو تمام انگریز مورخین اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ بادشاہ اس سے خوش نہ تھا بلکہ انقلابیوں کی آمد پر "وہ حیران و ششدر تھا اور ان پر قلعے کے دروازے بند کروا دیے تھے"[۱] لیکن اسی انقلابی فوج کے قیام کے دوران جب عید قرباں آئی تو ظفر نے اس موقع پر دربار عام میں چند اشعار سنائے جن میں انگریزوں کی شکست و خاتمے کی دعا مانگی گئی تھی اور یہ اشعار جنرل بخت خاں کو بھیجے گئے تھے[۲] سو

لشکر اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو

گورکھا گورے سے تا گوجر نصاریٰ قتل ہو

آج کا دن عید قرباں کا تبھی جانیں گے ہم

اے ظفر تہ تیغ جب دشمن تمہارا قتل ہو[۳]

بیرونی مورخین اس بات کی تکرار کرتے نہیں تھکتے کہ بہادر شاہ دہلی میں

---

[۱] اسپیئر پرسیوال: *Twilight of the Mughals*، ص ۲۰۳

ڈاکٹر اسپیئر نے حکیم احسن اللہ کے بیان کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ مگر کیا کوئی غیر جانب دار مورخ حکیم کے قول کو قابل اعتبار سمجھ سکتا ہے جبکہ اس نے اپنی بریت کی خاطر سرکار برطانیہ کے سامنے من گھڑت باتیں بیان کی تھیں۔ (م ر۔)

[۲] نظامی خواجہ حسن: غدر کی صبح و شام دہلی، ص ۱۹۷

[۳] یہ قطعہ صادق الاخبار دہلی مورخہ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ میں شائع ہوا تھا۔

داخل ہونے والے انقلابیوں سے خوش نہ تھے، لیکن سر ولیم میور اپنی کتاب ہندوستانی غدر میں "اِیچ اِیچ" گریتھیڈ کے حوالے سے ان کا مندرجہ ذیل شعر سند کے طور پر ضرور نقل کرتا ہے[1] جو جنگ آزادی کے موقع پر تقسیم کیا جاتا تھا۔

ایران نے کیا نہ کیا شاہ روس نے

انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے

یہاں یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا جو شخص انگریزوں کی پنشن خواری سے خوش اور مطمئن نظر آتا ہو اور دہلی شہر میں داخل ہونے والی انقلابی فوج سے بدظن و ناخوش ہو، درج بالا شعر کہہ سکتا ہے۔ جواب واضح ہے ــــ حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر باوجود پیر سالی کے عزم جوان رکھتے تھے اور ملک و ملت کی آزادی کا جذبہ ان میں کسی سے بھی فروتر نہ تھا۔ کیا اس ضعیف مرد مجاہد کے امنگ و حوصلے کا اندازہ اس شعر سے نہیں لگایا جا سکتا جسے وی ڈی ساورکر جیسے مورخ نے اپنی کتاب[2] میں نقل کیا ہے۔

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی

تب تو لنڈن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی[3]

لیکن یہ ہندوستانی تیغ لنڈن تک نہیں چل سکی ــــ اس لئے کہ اپنے ہی بیگانے ہوگئے، وفادار سازشوں پر اتر آئے اور ہمدرد و بہی خواہ دشمنوں سے مل گئے، بقول ظفر۔

بھیجا تھا میں نے اپنی طرف سے انہیں وہاں

وہ بھی تو جاکے ان کے طرفدار ہوگئے

---

۱ میور، سر ولیم: Indian Mutiny، جلد اول، ص ۴۵۴

۲ ساورکر، وی ڈی: The Indian War of Independence، ص ۴۸۷

۳ بہادر شاہ ظفر نے یہ شعر اپنے خلاف طنزاً کہے جانے والے شعر کے جواب میں موزوں کیا تھا۔

دمدمے میں دم نہیں خیر مانگو جان کی ۔۔۔ اے ظفر ٹھنڈی ہوئی تلوار ہندوستان کی

منقول ساورکر، وی ڈی: ایضاً

ناظرین کو یاد ہوگا کہ دہلی پر انگریزوں کا تسلط ۱۸۰۳ء میں ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی حیثیت ایک وظیفہ خوار کی تھی جس کی تمام شہنشاہی قلعہ معلیٰ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کرب ناک لمحے کا اظہار ظفر کے کلام میں بکثرت ہوا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اب وہ کشتہ ہوں کہ میری لاش پر اے دوستو
اک زمانہ دیدۂ حسرت سے تکتا جائے گا

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

رفیق راہ محبت کدھر گئے یارب
کہیں نظر ہی نہیں اب وہ قافلہ پڑتا

یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو
مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سنو

نصف صدی کے دور تسلط کے بعد جنرل بخت خاں کی سربراہی میں تیموری چراغ کی لو تیز ہو گئی تھی اور مایوسی کے اندھیرے سرک رہے تھے۔ ہر لب پہ فتح و استحکام کی دعا تھی۔ "سر شام غنچہ کھل اٹھنے" [۱] کی نوید جاں فزا سنائی دے رہی تھی — لیکن جب انگریز قلعہ معلیٰ میں در آئے اور فتح و استحکام شکست و ریخت میں تبدیل ہو گیا تو پھر کیا کیفیت ہوئی' ظفر کی زبانی سنیے ؎

کیا خوشی ہر ایک کو تھی' کر رہے تھے سب دعا
جب گھسی فوج نصاریٰ' ہر اثر جاتا رہا

شام کو غنچہ کھلا تھا چوک کے بازار میں
اب وہاں پر اے خدا لاکھوں کا سر جاتا رہا

---

[۱] ع شام کو غنچہ کھلا تھا چوک کے بازار میں۔

رہتے تھے اس شہر میں شمس و قمر حور و پری

لوٹ کر ان کو کوئی لے کر کدھر جاتا رہا

شمس و قمر اور حور و پری کی تباہی و بربادی کا ماجرا بیان کرنے والے ظفر خود بھی طوق و سلاسل کے حلقے میں جلا وطن کر دیئے گئے کہ برطانوی حکمراں کی نظروں میں وہ بغاوت کے مجرم تھے[1]

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے

بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے

رنگون کے دوران قیام ظفر جیسے حساس شاعر نے درد دل کی مسلسل ترجمانی کی تھی۔ جسٹس سید محمود نے ایک بار ایک انگریز کے پاس اس زمانے کا کلام دیکھا تھا[2]۔ یہ مختلف ذرائع سے عوام تک بھی پہنچتا رہا تھا[3]۔ اسی میں ان کا ایک گیت بھی ہے جو زنداں خانے کی دیوار پر کوئلے سے لکھا ہوا ملا تھا[4]۔ ایک غزل گو شاعر نے اپنی اجڑی ہوئی سلطنت کا نوحہ قلمبند کرنے کے لئے گیت کا سہارا لیا ہے۔ اس میں درد کی آمیزش بھی ہے، بے بسی کا احساس بھی! طنز کی گہرائی بھی ہے اور ظلم و ستم کا اظہار بھی!۔ آیئے اس یادگار گیت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے دوسرے شعرا کی طرف ہم متوجہ ہوں

بند میں کیسو بھاگ مجبوری جورا جوری

---

[1] مارشمین، جون کلارک: Abridgement of the History of India، ص ۵۱۰

[2] حقی، شان الحق: نکتۂ راز، ص ۲۳۲

[3] ایضاً ایضاً

[4] ایضاً: نشید حریت، ص ۵۷

نیر عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۲۲۲

ہند کا تختہ گلشن بنا تھا

کیسر کی سی کیاری

گرم ہی نندھی کے جھونکے

لٹ گئی باگ بہاری

ہند میں کیسو بھاگ بچوری   جورا جوری

گولن کے گمکے بنائے

توپن کی پچکاری

سینے کھائی دی گل ماری

ایسی ہولی کھلائی

شور دنیا میں پچوری

ہند میں کیسو بھاگ بچوری   جورا جوری[1]

ظہیر دہلوی[2] (م: ۱۹۱۱ء) بہادر شاہ ظفر کے متوسلین میں تھے۔ انہوں نے ناکام جنگِ آزادی کے بعد اپنی آنکھوں سے قیامت خیز آندھی کو گلی در گلی تباہی و بربادی پھیلاتے دیکھا تھا۔ اور وہ اسی لمحۂ رستاخیز میں دربدر کی خاک چھانتے ہوئے دکن پہنچے اور وہیں کے پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کا لکھا ہوا شہر آشوب اس دور کی داستانِ الم ناک ہے۔ اس کے مطالعے سے انگریزوں کے ظلم و ستم کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے "دہلی دہلی نہیں بلکہ مقتل ہے۔ جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھئے بے گناہوں کے لاشے نظر آتے ہیں"[3]

---

[1] منقول حقی، شان الحق، "نشید حریت"، ص ۵۷، نیز خان، اجمل "قومی ترانے اور نظمیں" ص ۱۴

[2] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۳۱۹، نیز پانی پتی، شیخ محمد اسمٰعیل: شعرائے متغزلین، مطبوعہ نقوش، لاہور، غزل نمبر ۳، ۶۸

[3] جعفری، ڈاکٹر قمقام: "شہر آشوب"، مطبوعہ اردو، کراچی، شمارہ ۳، ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۶

ہر ایک رونق بزم جہاں قتل ہوا
ہر ایک قبلۂ ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیٔ شیریں زبان قتل ہوا
ہر ایک بلبل نوشیں بیان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ پشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

تاریخ گواہ ہے کہ جب انگریزی فوج مظفر و منصور شہر کے اندر داخل ہوئی[1] تو بغاوت کا الزام عائد کر کے ہر شخص کو تہہ تیغ کر رہی تھی۔ اس ناکردہ جرم کی پاداش میں اہل وطن قتل گاہوں کی طرف لے جائے جاتے تھے جہاں ان کے سر قلم کئے جاتے۔ ظہیر کا درج ذیل بند اس خونی منظر کو واضح کر رہا ہے ؂

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آب دار ہوئی
سنان نیزہ ہر اک سینے سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی
ہر ایک سمت سے فریاد گیرودار ہوئی

ہر ایک وشتۂ قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا

ظہیر کے شہر آشوب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہڈسن کے ہاتھوں[2] بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں اور پوتے کے بے دردی سے قتل کا ماجرا بیان ہوا ہے۔ اس

---

[1] عبداللہ، ڈاکٹر سید : بحث و نظر، ص ۸۸-۸۹
[2] برگیس جیمس : The Chronology of Modern India، ص ۳۶۶

دلدوز واقعے کی طرف اس دور کے کسی بھی شاعر نے اشارہ نہیں کیا ہے۔[1] یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ڈلہوزی نے یہ طے کیا تھا کہ شاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کی وفات کے بعد شاہی خطاب کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا اور اس کے جانشین کو لال قلعہ چھوڑنا پڑے گا۔[2] مزید براں، سر چارلس نیپیئر نے بیان دیا تھا کہ "اگر میں بارہ سال کے لئے ہندوستان کا بادشاہ منتخب ہو گیا تو کوئی بھی ہندوستانی شاہزادہ زندہ نہیں رہے گا"۔[3] انگریزوں کی اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ ان مغل شاہزادوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تاکہ نئے حکمرانوں کو کوئی خطرہ درپیش نہ رہے۔ اب ان شاہزادوں کی موت پر ظہیر کا نوحہ سنئے ؎

نہال گلشن اقبال پائمال ہوئے
گل ریاض خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے
کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطر گل کو نہ ملتے ملے وہ مٹی میں
جو فرش گل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں

غرض ظہیر دہلوی کا مسدس شہر آشوب طرز ادا، جزئیات نگاری اور واقعات کی صحیح عکاسی کی بنا پر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ قاری اس طویل مسدس کو پڑھنے کے بعد ظلم و تشدد کے روح فرسا مناظر اور عوام کی

---

[1] عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد: بحث و نظر، ص ۸۸
[2] قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین (ایڈیٹر): A Short History of Pakistan، جلد، ص ۱۲۱
[3] ایضاً

بے بسی و بے چارگی کو فراموش نہیں کر سکتا اور اس کے ذہن میں یہ شعر گونجتا رہے گا؂[1]

دراز دستیِ تغلیم ستم شعاروں کا
فلک کو یاس سے تکنا جفا کے ماروں کا

عرب کے جیّد عالم اور اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر صدر الدین آزردہ (م: ۱۸۶۸ء[2]) اس جنگِ آزادی میں برابر کے شریک تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے اسی زمانے میں انہیں حکم دیا تھا کہ وہ فوجی مقدمات کی سماعت کریں[2]۔ انگریزوں سے جہاد کرنے کے سلسلے میں جو فتویٰ علمائے کرام نے اس موقع پر دیا تھا، اس پر آزردہ کے بھی دستخط تھے[3]۔ انہی فتح و نصرت کے بعد انگریزوں نے جن بے شمار افراد پر "فردِ جرم" عائد کی، ان میں دہلی کے یہ صدر الصدور بھی تھے۔ چنانچہ انہیں پا بہ زنجیر کرکے زنداں میں ڈال دیا گیا اور جائداد، کتب خانہ اور مکان سب کچھ ضبط کر لیا گیا[4]۔

آزردہ کا مسدس شہر آشوب گیارہ بند پر مشتمل ہے۔ اسے صرف اس بنا پر ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے کہ اس میں "دلی کے تمدن، دلی کی بہترین معاشرت کی تباہی و بربادی کا ماتم نہیں ہے بلکہ ان کی توجہ تمام تر زیب و زینت، عیش و عشرت اور رقص و سرود کی طرف مائل ہو جاتی ہے[5]۔" اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو آزردہ نے اس

---

[1] پانی پتی، شیخ محمد اسمٰعیل: شعرائے تغزلین، مطبوعہ نقوش، لاہور، غزل نمبر ۱۹۶۰ء، ص ۶۵۳
[2] نظامی، خواجہ حسن: غدر کی صبح و شام، ص ۱۸۸
[3] مہر، غلام رسول: ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۱۳۳، نیز رضوی، خورشید مصطفیٰ: جہاد کا فتویٰ، ص ۵۶۸
[4] پانی پتی، شیخ محمد اسمٰعیل: ایضاً
[5] ندوی، علامہ سید سلیمان: غدرِ دلی کا نوحہ، مطبوعہ معارف، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۳۲ء ص ۳۰۵ - ۳۰۶
[6] ایضاً

مخصوص طبقے کی منظر کشی کی ہے جس سے وہ خود بھی تعلق رکھتے تھے۔ اس دور کے دوسرے شعرا جہاں عوامی سطح پر حالات و کوائف کی ترجمانی کر رہے تھے، وہاں آزردہ سماج کے ان افراد کی تباہی و پریشانی کا مرقع پیش کر رہے تھے جو براہ راست مملکتِ دہلی پر اثرانداز تھے۔ جن کا ہر فعل ہر قول عوام کے لئے باعث تقلید تھا ــــ اور عیش و عشرت کا یہی عنصر فی الواقع زوال کا باعث بھی ہوا تھا۔ بادی النظر میں آزردہ نے زوال و ادبار کے محرک ماحول اور افراد دونوں کی منظر کشی کی ہے اور جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد

تو یہ محض حقیقت نگاری ہی نہیں ہے' بلکہ معاشرے پر گہرا طنز بھی ہے!۔ آزردہ نے اپنے مخصوص طرز کے ماحول کا نقشہ کھینچ کر گیا مِنّی صداقت کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ ایک صدر الصدور کی حیثیت سے ان کا اٹھنا بیٹھنا جس طبقے میں تھا' وہی ان کا موضوع بنا ہے اور اس طرح انہوں نے اس باعزت طبقے کا جو نوحہ لکھا ہے وہ پڑھنے پر درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے ؎

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل دنیا اہل سے خلطِ اپنی زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا
آدمی کیا ہے' فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں ان کو کہ ڈالیں سر پر

یہاں ایک سماجی نکتہ ملحوظ رہے کہ جب ایسے با اثر لوگوں کا یہ حال تھا کہ وہ گلی کوچوں میں پریشاں حال پھر رہے تھے' اس صورت میں عام لوگوں پر کیا کچھ

بیتی ہوگی ـــ اور یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جب انگریزی فوج اور اس کے مددگار سکھ اور گورکھا سپاہی دہلی شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے مدفون خزانے کی تلاش میں متمول افراد کے گھروں کو کھود کر رکھ دیا۔ کیا ایسی صورت میں ان سکھوں کا گلی کوچوں میں پریشان پھرنا کیا ایک سچی کہانی نہیں ؟

آزردہ نے تذکرہ شہر آشوب کے ایک بند میں خواتین کی بے بسی، بے پردگی اور حرماں نصیبی کا ذکر کیا ہے۔ واضح رہے کہ اُس دور کے معاشرے میں چاہے وہ امیر گھرانے کی رہی ہوں یا متوسط اور غریب خاندان کی، عورتوں میں پردے کا سخت اہتمام تھا۔ سواری کے بغیر وہ گھروں سے باہر قدم بھی نہیں نکالتی تھیں۔ یہ اسلامی ثقافت کا ایک اہم پہلو تھا جو پورے برعظیم میں پیش نظر رکھا جاتا تھا ـــ لیکن اب انقلاب ستاون کے بعد بدلے ہوئے اور تباہ حال معاشرے میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ ؎

زیور الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گارج کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اوڑھائے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لئے چار طرف پھرتی ہیں
دو قدم چلتی ہیں مشکل سے تو پھر گرتی ہیں

آپ نے محسوس کیا کہ درج بالا بند اسلامی تہذیب و ثقافت کا کتنا جاندار مرقع ہے، خصوصاً طبقۂ نسواں کا کہ اُس دور میں زندگی اس سے بھی عبارت تھی۔

آخر میں دہلی کے اس عظیم مفتی کے ایک ایسے بند کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے جس میں اس وقت کی ایک عظیم شخصیت کے بے جرم قتل کئے جانے

پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ مولوی امام بخش صہبائی تھے، قدیم دلی کالج میں عربی و فارسی کے استاد۔ انہیں فارسی زبان میں کمال حاصل تھا۔[1] وہ فن شاعری پر خاصا عبور رکھتے تھے۔ قلعے کے اکثر شاہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔[2] اس نابغۂ روزگار کو اس کے خاندان کے اکیس افراد سمیت پھانسی دے دی گئی[3] اور مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔[4] یہ پس منظر جان لینے کے بعد، اب یہ بند ملاحظہ ہو۔

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوش جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

کیا یہ جرأتِ اظہار نہیں کہ انگریزوں کی عمل داری میں رہ کر اس شخص کے قتل کا ذکر کیا جا رہا ہے جو قرار واقعی بے جرم تھا۔ اور کیا آزردہ کے مقصودِ نظر صہبائی جیسے ہزاروں بے گناہ مقتول نہ تھے ـــــ اور پھر یہ مصطفیٰ خاں جن کی یاد آزردہ کو بے چین و مضطرب کر رہی تھی، اردو کے مشہور شاعر شیفتہ تھے

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۸۰

[2] ایضاً
نیز صابری، امداد: ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا، ص ۲۷۹

[3] ذکاء اللہ، مولوی: تاریخ عروج عہد انگلشیہ ہند، دہلی، ص ۷۰۶

[4] سکسینہ، رام بابو: ایضاً ص ۸۰

جو انگریزوں کی شدید مخالفت کی بنا پر اور مالاگڑھ کے رئیس کے دوش بدوش جنگِ آزادی میں سرگرم عمل رہنے کی وجہ سے داخل زنداں کر دیے گئے تھے اور ان کی جاگیر ضبط ہو گئی تھی[1] ـــــ ان محصور و مقتول "مجرموں" کا تذکرہ کیا آزردہ کے شہر آشوب کو حقیقت و صداقت کا مرقع نہیں بناتا؟ ـ جو سچ پوچھیے تو یہ مسدس بے خوفی و بے باکی کی ایک نادر مثال ہے جو اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اب ہماری نظر اردو کے صفِ اوّل کے شاعر مرزا غالب (م: ۱۸۶۹ء) پر مرکوز ہو جاتی ہے جو اسی دور ابتلا سے تعلق رکھتے ہیں اور "۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شروع سے آخر تک دہلی ہی رہے"[2] وہ محض ایک سخن ور ہی نہ تھے' نثر نگار بھی تھے اور اپنے متعدد خطوط میں انہوں نے اس لمحۂ جانکنی کی طرف اشارہ کیے ہیں:

"میں مع زن و فرزند ہر وقت اس شہر میں قلزم خوں
کا شناور ہوں"[3]

"یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو اگر جیتے رہے اور ملنا
نصیب ہوا تو کہا جائے گا ورنہ قصہ مختصر قصہ تمام ہوا
لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں"[4]

قلزم خوں کے شناور' مرزا غالب' انگریزوں سے خوف زدہ اور ہراساں تھے کہ مبادا باز پرس نہ ہو ـ اور جب ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں یہ لکھتے ہیں کہ:

---

[1] شہابی' مفتی انتظام اللہ: غدر کے چند علما' ص ۵۵

[2] نارنگ' ڈاکٹر گوپی چند: ۱۸۵۷ اور غالب' مطبوعہ "غالب نامہ آور" مرتبہ انجمن ترقی اردو' کراچی' ۱۹۶۹ء' ص ۱۱۳

[3] غالب: مکتوب بنام عبدالغفور سرور' مطبوعہ اردوئے معلّٰی' ص ۱۰۴

[4] ایضاً: بنام ہرگوپال تفتہ مطبوعہ ایضاً' ص ۲۱۷

انگریزی قوم میں سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے
اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی
میرا دوست، کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔"[۱]

تو ان پر انگریز پرست ہونے کی تہمت لگائی گئی، اور اس اتہام میں اضافہ ملکہ وکٹوریہ کی شان میں کہے گئے قصیدے سے بھی ہوا۔ لیکن الزام تراشنے والے یہ بھول گئے کہ اس شاعر نام آور نے انقلاب ستاون کے موقع پر منعقد ہونے والے دربار شاہی میں بہادر شاہ ظفر کا مندرجہ ذیل سکہ بھی کہا تھا:

بزر آفتاب و نقرۂ ماہ
سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

اور یہ وہی سکہ ہے جس کی وجہ سے وہ عتاب میں آئے۔ بقول انہی کے:

"میں نے سکہ نہیں کہا اور اگر کہا تو اپنی جان و حرمت
بچانے کے لئے، یہ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر گناہ بھی ہے
تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اسے
نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور
توپیں لگانی اور بینک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف
ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔"[۳]

الزام بغاوت سے برأت کا یہ پہلو اس قدر غالب آگیا ہے کہ ایک عمومی سی رائے بن گئی ہے کہ ان کا دل باغیوں کے ساتھ نہ تھا[۴] اور وہ انگریزوں کے قصیدہ

---

[۱] غالب: مکتوب بنام ہرگوپال تفتہ، مطبوعہ اردوئے معلیٰ، ص ۱۵۱
[۲] عفو و در گزر کا
[۳] غالب: مکتوب بنام یوسف مرزا، مطبوعہ ایضاً، ص ۲۴۹
[۴] حسین، پروفیسر ممتاز حسین: غالب ایک مطالعہ، ص ۵۶

خواں تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ غالب محض ایک دنیادار آدمی تھے۔ قناعت ان میں نہ تھی۔ وہ اپنے کمال سے شہرت اور منفعت دونوں حاصل کرنا چاہتے تھے"[1]۔ ان کی مالی خستہ حالی ہمیشہ انہیں بڑے بڑوں کی قصیدہ خوانی پر مجبور کرتی رہی کہ "کچھ نہ کچھ حاصل ہو جائے"[2]۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

"حب وطن سے عاری تھے یا اپنے ہم وطنوں کے لئے ان
کے دل میں کوئی ہمدردی نہ تھی"[3]۔

آزادی کی اس جنگ میں جو امرا و رؤسا مغل بادشاہ کے ساتھ تھے، ان سے غالب کی عزیزداری تھی۔ خود ان کے عزیز ترین احباب شیفتہ، آزردہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی بہ نفس نفیس انگریزوں سے معرکہ آرا تھے۔ غالب کو ان سبھوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ خصوصاً آخر الذکر کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کلکتے کے سفر پر روانہ ہوئے تو چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضل حق خیر آبادی سے وداعی ملاقات نہیں کر سکے تھے اس لیے ان سے ملنے کو دہلی واپس آگئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے"[4]۔ مولانا کو جب حبس دوام کی سزا سنا کر انڈمان بھیج دیا گیا تو غالب دل مسوس کر رہ گئے۔ ان کے فکر و تردد کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جب انہیں خبر ملی کہ مشہور سیاح دادخاں سفر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے

---

[1] سرور، آل احمد: غالب، مطبوعہ غالب نامہ آور، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، کراچی ص ۲۸۱

[2] ایضاً، ص ۲۸۱

[3] نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند: ۱۸۵۷ اور غالب، مطبوعہ غالب نامہ آور، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، کراچی، ص ۱۲۳

[4] رام، مالک: ذکر غالب، ص ۶۹

میں تو درج ذیل خط لکھ کر مولانا کی خیر و عافیت معلوم کی:

"یاں خاں صاحب! آپ جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں
سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت
کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہیں پائی۔ وہاں
جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے۔ گزارہ کس طرح کرتا ہے۔"[1]

یہی نہیں کہ غالب اپنے دوستوں کے لئے پریشان رہتے تھے بلکہ وہ جنگ آزادی کے اہم رکن بہادر شاہ ظفر کے بھی طرفدار تھے۔ جب آگرے میں انقلابیوں نے اہل برطانیہ پر فتح پائی تو جیون لال نے اپنے روزنامچے مورخہ ۱۳ رجولائی ۱۸۵۷ء میں لکھا کہ مرزا نوشہ نے اس خوشی میں قصیدہ پڑھ کر سنایا۔[2]

آئیے اب دیکھیں کہ غالب نے اپنے کلام میں اس دور کی کس طور پر ترجمانی کی ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ انقلاب ستاون کی ناکامی کے بعد اہل دہلی کو مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ یہ روح فرسا منظر غالب کے ذیل میں درج کئے ہوئے قطعے سے سامنے آجاتا ہے۔

بس کہ فعال ما یرید ہے آج | ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے | زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے | گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک | تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک | آدمی واں جا سکے نہ یاں کا

---

[1] منقول مہر غلام رسول (مرتب) خطوط غالب، حصہ دوم، ص ۱۵۵

[2] منقول حسین، پروفیسر ممتاز: غالب ایک مطالعہ، ص ۶۱

اس منظرکشی کے بعد غالب اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر اس وقت
پرآشوب میں ملاقات کی کوئی سبیل نکل بھی آئی تو گفتگو کا مرکز و محور سوائے
رنج و غم اور تباہی و بربادی کے کچھ نہ ہوگا کہ یہی مقدر بن چکا تھا ؎

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا　　　وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ رو کر کہا کیے باہم　　　ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب　　　کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

کیا داغ ہجراں کی طرف یہ اشارہ آزادی کی جنگ میں ہلاک ہونے والوں اور حبس دوام
بہ عبور دریائے شور کی سزا پانے والوں کی فرقت میں شاعر کا نوحہ نہیں۔

غالب کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ بخوبی ہو جائے گا کہ
تغزل کے رمز و کنایے کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے اس انقلاب کے اثرات
کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس نوع کے اشعار کے پس پردہ ان کا گہرا
شعور، ان کا عمیق مشاہدہ، ان کا قوی احساس کارفرما نظر آتا ہے۔ نئی مملکت
کا طوق جس طرح حلقۂ بیرون در بن گیا تھا، اس کیفیت کو غالب درد و اثر میں
ڈوبے ہوئے اشعار کے ذریعے یوں اجاگر کرتے ہیں ؎

گلشن میں بند و بست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تار نفس کمند شکار اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

اور جب سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے

کہ ؎

میں بھولا نہیں تجھ کو اے مری جاں

کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں[1]

دلّی کی ویرانی و بربادی کا نقشہ یوں تو سبھوں نے کھینچا ہے مگر غالب کا انداز دیکھئے کہ درج ذیل قطعے میں جہاں ایک طرف مغلیہ سلطنت کے زوال، تمدن و معاشرت کی تباہی اور قوم کی بے بسی و بے چارگی کی سچی جھلکیاں پیش کر رہے ہیں، وہاں ان کے دو اشعار میں تغزل کی شان بھی ہے، درد کا احساس بھی ہے، رمز و کنایہ بھی ہے اور معنی آفرینی بھی! ؎

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس

یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیّاد نے

یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

قارئین! یہاں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ دلّی کے تاخت و تاراج ہونے کی جو تفصیل تاریخ کی ضخیم کتابوں میں درج ہے، اسے غالب نے درج بالا قطعے کے آخری شعر میں فنکارانہ طور پر پیش کر دیا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ صیّاد (انگریز) موجود ہے اور عندلیب (مغلیہ شہنشاہ) کا وجود نہیں۔ ایجاز و ایمائیت کی ایسی روشن مثال مشکل ہی سے کہیں اور مل سکتی ہے۔

---

[1] غالب : عودِ ہندی، ص ۱۲۳

غالب میر مہدی کے نام اس خط میں حالاتِ حاضرہ کی طرف دبا دبا سا اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ "یہاں کا وہ حال ہے جو دیکھ گئے ہو" اور پھر درج بالا شعر لکھ کر موسمِ برسات کی طرف گریز کر جاتے ہیں جو خالی از مصلحت نہیں!

دلی پر اپنا تسلط جمانے کے بعد انگریزوں نے شکست و ریخت کا جو سلسلہ لامتناہی شروع کیا تھا، اس پر ایک خط میں روشنی ڈالتے ہوئے غالب لکھتے ہیں کہ "کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں، جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھادو......"[1]۔ اس کے بعد یہ شعر بھی درج کرتے ہیں ؎

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے[2]

غالب شب و روز کے تخریبی تغیرات پر حیرت زدہ ہی نہیں ہوتے ہیں بلکہ قتل و خونریزی کے مناظر سے ان کی "جان کے لالے پڑے ہوئے"[3] ہیں اور انہیں یہ نہیں معلوم ہے کہ اس "قلزم خوں" کے بعد اور کیا کیا صعوبتیں سامنے آئیں گی ؎

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے[4]

غالب جو واجد علی شاہ اختر کے بہی خواہوں میں تھے، جن کے معزول ہونے پر وہ نہ صرف افسردہ دل ہوئے تھے، بلکہ یہ کہا تھا کہ "نا انصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے"[5]، جو تاجدار دہلی کے دربار سے وابستہ رہے تھے، جن کا بہادر شاہ ظفر سے ذہنی و قلبی ربط تھا ــــ اس واقعہ

۱۔ غالب: مکتوب بنام میر مہدی مجروح، مطبوعہ خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۲۷۳
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً، ص ۲۶۶
۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً: مکتوب بنام سید غلام حسین قادر بلگرامی، منقول حسینی، پروفیسر ممتاز، غالب ایک مطالعہ، ص ۲۵۹

جانکاہ کو یقیناً فراموش نہ کر سکے ہوں گے جب "بیرونی گماشتے" شاہِ دہلی پر "بغاوت" کا الزام عائد کر رہے تھے اور اس کی پاداش میں اسے اپنے ہی ملک سے نکال باہر کر رہے تھے۔ آیئے، اس پس منظر میں غالب کے درج ذیل شعر کو پڑھتے ہوئے ہم دوسرے شعرائے متعارف ہوں ؎

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

دیگر شعرائے دہلی کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان میں حکیم محمد تقی سوزاں، افسردہ، محسن، شیفتہ، تشنہ، ظہور، ہمین، کوکب، عیش، کامل، سالک، صابر، مجروح، داغ اور حسامی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان سبھوں نے زوال و ادبار کا رقعہ پیش کیا ہے۔ سب کا موضوع، زاویۂ نگاہ اور انداز نگارش ایک جیسا ہے۔ البتہ اس فہرست کے آخرالذکر دو شاعر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بیان حالات و کوائف کو پیش کرنے کا طرز منفرد بھی ہے اور پراثر بھی!

داغ دہلوی (م: ۱۹۰۵ء) کا براہ راست تعلق قلعۂ معلّٰی سے تھا۔ وہاں نہ صرف ان کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی بلکہ شاہی طرز معاشرت اور آداب محفل کا رنگ بھی ان کی زندگی پر اثر انداز ہوا تھا۔ اس ذہنی و قلبی لگاؤ نے ان کے بیان میں درد و غم کی شدت پیدا کر دی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے زوال میں انہیں اپنا زوال دکھائی دیا تھا۔ سلطنتِ دہلی کی تباہی و بربادی داغ کی اپنی تباہی و بربادی تھی۔ ہزاروں آدمیوں کی طرح وہ بھی دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے[1]

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۳۶۶

فکر و غم کا یہی احساس داغ کے مسدس شہر آشوب میں کار فرما نظر آتا ہے۔ اس کرب و کسک کے دوش بدوش ان کی زبان، طرزِ ادا اور تخیل و صداقت کی آمیزش نے اسے حد درجہ اثر انگیز بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شہر آشوب بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "دلی کی بربادی کے متعلق سب شہر آشوبوں میں خاص امتیاز رکھتا ہے"۔ [1]

وہ دلی جو داغ کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز تھی، جسے خلد و بہشت سے بھی زیادہ بلند و برتر مقام حاصل تھا ؎

فلک جناب و ملائک جناب تھی دلی
بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلی

وہ بیرونی یورشوں کے بعد کس طرح طوفانِ حوادث کا شکار ہوتی ہے اس کا ماجرا داغ کے مخصوص انداز میں سنئے ؎

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک اک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھوں کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

شہر دلی میں ظلم و ستم کا جو بازار گرم ہوا، قتل و غارت گری کی جو کیفیتیں دیکھنے میں آئیں، ان کی منظر کشی متذکرہ شہر آشوب کے مختلف اشعار

---

[1] عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد، نقد و نظر، ص ۹۶

میں کی گئی ہے' مثلاً ؎

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا' کام ہی تمام کیا

زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی
رسن ہے' طوق ہے' گردن ہے بیگناہوں کی

خون آشام واقعات نے اہلِ دہلی کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہایت کس مپرسی میں مقام امن اور جائے پناہ کی تلاش میں نکلے۔ مگر دوران سفر جو صورت درپیش آئی اس کا ذکر داغ نے بڑے کرب والم کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کیوں نہ ہو' اس قافلۂ بے یار و مددگار میں وہ خود بھی شریک تھے[1] ؎

برنگِ بوئے گل اہلِ چمن چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھ زندوں کو بے چارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

تمام مورخین اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ انگریزوں نے سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی' لہٰذا ان سے دلی پرخاش اور شدید عناد رکھتے تھے۔ یہی بنا پر یہی بیرونی حاکموں کے عتاب و قہر کا نشانہ بھی بنے۔ مالی طور پر انہیں

---

[1] سکسینہ' رام بابو: تاریخ ادب اردو' ص ۳۶۶

مفلوج کرنے کی پوری کوششیں بھی کی گئیں ۔ اس رویّے کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ مسلمان دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں ۔ یہاں یہ نکتہ پیشِ نظر ہے کہ معاشی بدحالی کسی بھی قوم کے زوال کا سبب بنتی ہے، خصوصاً اہلِ علم و ہنر اور نوجوان طبقے کا بیروزگار ہو جانا بڑا المیہ ہوتا ہے ۔ انگریزوں نے اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو کچھ بھی طریقہ اپنایا، اسے داغ جیسے حسن و عشق کے شاعر نے نہی جابکدستی سے اپنے کلام میں پیش کر دیا ہے ۔ درج ذیل بند اپنے طرز اور موضوع کے لحاظ سے اس دور کی تمام منظومات میں ایک جدا حیثیت رکھتا ہے ۔ معاشی پہلو کس طرح اجاگر کیا گیا ہے؟ ذرا ملاحظہ فرمائیے ؎

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی
تلاش بہرِ سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی
کہ حکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی

یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ

غرض تیموری چراغ گل ہو جانے اور بساطِ سلطنت الٹ جانے کی بدولت پورا برعظیم، پوری قوم، پورا تمدن اور پوری معاشرت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی اور ملّت کے وجود و بقا کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ تحت الثریٰ تک پتہ نہ چلا ؎

جہاز ایسا تباہی میں آ گیا اپنا
ملا نہ تحتِ ثریٰ تک کہیں پتا اپنا

اس لمحۂ دار و گیر میں جہاں بڑے بڑے باکمال شاعروں نے خارجی و داخلی حالات و کوائف کی ترجمانی کی ہے، وہاں ایسے بھی سخنور نظر آتے ہیں جن کی کوئی ادبی شہرت نہ تھی، لیکن جن کے اشعار حقیقت و صداقت کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں حسام الدین حیدر حسامی (م: ؟) بھی تھے جنہیں خدا بخش تنویر سے تلمذ تھا[۱] کوئی انہیں ان پڑھ شاعر کہتا ہے[۲]، کوئی نابینا فقیر کے نام سے یاد کرتا ہے[۳]، لیکن یہ مسلمہ ہے کہ حسامی کی آواز اپنے دور کی ایک ایسی درد بھری آواز ہے جو کل بھی دل کے تاروں کو مرتعش کر رہی تھی اور آج بھی متاثر کر رہی ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ جس طرح میر تقی میر کے شعر ؎ وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا ...... الخ کو متعدد شاعروں کے سر منڈھا گیا، اسی طرح حسامی کی غزل بہادر شاہ ظفر کی ملکیت قرار دی گئی[۴]۔ یہ غزل جو بقول قاضی عبدالودود "مختلف الانواع اسقام سے مملو ہے"[۵] بہادر شاہ ظفر کی تخلیق کیوں کر ہو سکتی ہے جو نہ صرف "موزوں طبع، شیدائی سخن اور ساری عمر فنا فی الشعر رہے"[۶] بلکہ جن کے کلام کو شاہ نصیر، کاظم حسین بیقرار

۱؎ پانی پتی، شیخ محمد اسمٰعیل: شعرائے متغزلین، مطبوعہ نقوش، غزل نمبر، ص ۶۶۷

۲؎ حبیبی، ڈاکٹر قمقام: شہر آشوب، مطبوعہ اردو، کراچی، شمارہ ۳ ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۷

۳؎ حقی، شان الحق: نشید حریت، ص ۵۸

۴؎ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنی کتاب "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" میں اس غزل کے کئی اشعار ظفر کی طرف منسوب کئے ہیں۔ ص ۲۱۸

۵؎ عبدالودود، قاضی: آوارہ گرد اشعار، مطبوعہ نقوش، لاہور، ادب عالیہ نمبر اپریل ۱۹۶۰ء، ص ۱۲۶

۶؎ حقی، شان الحق: نکتہ راز، ص ۱۸۵

اور ذوق جیسے اساتذہ نے اصلاح دے دے کر سنبھالا تھا[1] جو شاعر شعر کا عاشق شیدا[2] ہو، وہ لفظ "امن" کو میم بالفتح[3] کبھی موزوں نہیں کر سکتا۔ غزل کا تیور خود یہ بتا رہا ہے کہ یہ کسی کچی عمر اور نا پختہ کار شاعر کا نتیجۂ فکر ہے۔ شیخ اسماعیل پانی پتی کے بقول حالی کا سنہ پیدائش ۱۸۳۲ء تھا[4]۔ اس لحاظ سے جنگِ آزادی کے وقت ان کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ عمر کے اس تعین سے یہ بات تسلیم کر لینے میں کوئی قباحت نہ ہوگی یہ نوجوان حالی کی غزل ہو سکتی ہے نہ کہ ظفر کی جو اس وقت عمر کی طویل منزلیں طے کر چکے تھے۔ آئیے اب اس مشہورِ زمانہ غزل پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

شاعر انقلابِ زمانہ پر اپنی بیقراری و سینہ فگاری کا یوں اظہار کرتا ہے ؎

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے[5]
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

حالی نے شہر دہلی کی بربادی و ویرانی کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے ؎

---

[1] آزاد، محمد حسین: آبِ حیات، ص ۴۳۲
[2] ایضاً، ص ۴۳۱
[3] ع ولے شہرِ دہلی یہ تھا چمن کہ سب طرح کا یہاں تھا امن
[4] پانی پتی، شیخ محمد اسمٰعیل: شعرائے متغزلین، مطبوعہ نقوش، غزل نمبر، ص ۶۲۷
[5] "اردو" اورنگ آباد، جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ غزل شائع ہوئی تھی۔ اس میں اس جگہ لفظ "اپنے" درج ہے۔
نیز نقوش، لاہور کے غزل نمبر میں بھی "اپنے" ہی نقل ہوا ہے۔

ولے شہر دلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن[1]

وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے

انقلاب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ گورا فوج جب شہر میں داخل ہوئی تو نہ صرف لوٹ کا بازار گرم ہوا بلکہ ہر وہ شخص جو سامنے نظر آیا، مستحق دار ٹھہرا۔ لاکھوں بے گناہ شہید کر دیے گئے، اور مسلمان خصوصی طور پر ہر ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ لاشیں بے گور و کفن کوچہ و بازار میں پڑی رہیں۔ ان روح فرسا واقعات کو حامی نے غزل کے پراثر پیرائے میں یوں بیان کیا ہے:

وہ رعایا ئے ہند تبہ ہوئی کہوں کیا جواں پہ جفا ہوئی[2]

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے

یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بے گناہ

ولے کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی ان کے دل میں غبار ہے

نہ دبایا زیر چمن انہیں نہ دیا کسی نے کفن انہیں

نہ کیا کسی نے دفن انہیں بے ٹھکانہ ان کا مزار ہے[3]

سن ستاون کے دور ابتلا سے قبل امیر و با اثر افراد عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کے دم سے بے شمار افراد کا بھلا ہو رہا تھا۔ لیکن اب وہ جب کرب و الم اور ذلت و رسوائی سے دوچار تھے، اس کا نقشہ

---

[1] قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون "آوارہ گرد اشعار" مطبوعہ نقوش میں اس مصرع کو یوں نقل کیا ہے ع ولے شہر دلی یہ تھا چمن کہ سب طرح کا یہاں تھا امن۔ شان الحق حقی نے نشید حریت میں یوں نقل کیا ہے ع نہ تھا شہر دلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن

[2] قاضی عبدالودود کے متذکرہ مضمون میں یہ مصرع یوں ہے ع

ساری رعایا ئے ہند تباہ ہوئی کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی

[3] ڈاکٹر معین الدین عقیل نے یوں نقل کیا ہے ع

کیا کس نے یارو دفن انہیں بے ٹھکانہ ان کا مزار ہے

ملاحظہ ہو ؎

شب و روز پھولوں میں جو تُلیں وہ یہاں خارِ غم سے فگار ہوں

ملے طوق قید میں جب انہیں کہیں بدلے گل کے یہ ہار ہے

جو سلوک اوروں سے کرتے تھے وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار[1]

وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، رہا تن پہ انکے نہ تار ہے

شاعر زمانے کو برا کہتا ہے اور لوگوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ بچ بچ کر نہایت احتیاط سے چلیں کہ یہاں رفیق و ہمدرد کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ حامی کا درج ذیل شعر اس دور کی سماجی زندگی کو بخوبی بروئے کار لاتا ہے ؎

یہ زمانہ ہے وہ برا فلک چلو بچ کے سب سے الگ الگ

نہ رفیق کوئی کسی کا یاں، نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

متذکرہ غزل کے مقطع میں شاعر اپنے آپ کو خدا اور رسولؐ کی مدد کا یقین دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ

کیا حامی ڈر تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے بر ملا[2]

تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامی کار ہے[3]

اس قیامت خیز منظر میں جب کہ کہیں سے بھی مدد اور سہارے کا امکان نہ تھا اور لوگ مایوسی کے گہرے غار میں شکستہ پا بیٹھے تھے، حامی کا یہ مقطع غم و الم کی تاریکی میں

---

[1] عبدالودود، قاضی: آوارہ گرد اشعار مطبوعہ نقوش، لاہور، ادب عالیہ نمبر، ص ۱۲۶

ع جو سلوک کرتے تھے اور سے اب ہیں دیکھو وہ کس طور سے

حق، شان الحق: نشید حریت، ص ۵۸ ع جو سلوک کرتے تھے اور سے وہ ہیں خوار اوروں کے طور سے

[2] عبدالودود، قاضی: ایضاً — "یہ مصرع ظفر کے تخلص کے ساتھ یوں بھی سنا گیا ہے ع

تجھے خوف حشر ہے کیا ظفر تو خدا کے فضل پہ رکھ نظر"

[3] قاضی عبدالودود نے اس مصرع کو یوں نقل کیا ہے ع

تجھے ہے وسیلہ رسول کا ترا وہ حامی کار ہے

امید و آرزو کی شمع روشن کر رہا تھا۔ یہ رجائی پہلو خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

نوجوان حامی کی یہ غزل فنی عیوب کے باوجود قبولِ عام کا درجہ رکھتی ہے۔ مترنم بحر، سادہ و سلیس الفاظ، جذبات دروں کے اظہار اور واقعات و حوادث کی صحیح ترجمانی کے سبب اسے اردو شاعری میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ اِس اَن پڑھ، نابینا اور غیر معروف شاعر کی انہی خوبیوں نے غزل کے جملہ فنی اسقام ڈھک دیے ہیں اور اسے وہ شہرتِ دوام عطا کر دی ہے جو بڑے بڑے قادر الکلام شاعروں کا بھی مقدر ہوتی ہے۔

شعرائے دہلی کے تذکرے کو اختتام تک پہنچانے سے قبل اس دور کے ایک اور غیر معروف شاعر منشی غلام علی خاں مشتاق کا ذکر بھی ہم کرتے چلیں۔ جیسا کہ بہادر شاہ ظفر کے ضمن میں ہم لکھ چکے ہیں، جنگِ آزادی کے دوران عید قرباں واقع ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس موقع پر بر سر دربار چند اشعار سنائے تھے جن میں گورا فوج کی شکست کی دعا مانگی گئی تھی۔ اسی موقع پر مشتاق نے بھی اپنے دو قطعات بطور تہنیت پیش کئے تھے۔ یہ اشعار محض بادشاہ کی تعریف و توصیف ہی پر مبنی نہیں، بلکہ انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار بھی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انقلابی فوج نے قلعۂ معلّٰی پر از سر نو تیموری جاہ و جلال کا پرچم بلند کر دیا تھا اور فتح و نصرت کے شادیانے بج اٹھے تھے۔ انگریزوں کے پنشن خوار، شاہ ظفر، کا دوبارہ بر سر اقتدار آنا عوام کی عین خواہش و امنگ کا مظہر تھا۔۔۔ مشتاق نے اسی عوامی جذبے کی ترجمانی کی ہے اور بہ بانگ دہل کہی ہے ؎

عید ہر سال تمہیں تہنیت آمیز رہے
غرق خونِ جانِ عدو خنجرِ خوں ریز رہے

قتل کفار ہوں اور فتح مبارک ہو ظفر

نام کو بھی نہ جہاں میں سر انگریز رہے [۱]

نصرت و فتح کا اک معوم سے لشکر آیا

دل سے جب نام ظفر سب کی زباں پر آیا

عید پر عید خوشی پر ہو خوشی آج ہمیں

لو مبارک ہو کہ دشمن تہ خنجر آیا [۲]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا مرکز صرف دہلی ہی نہ تھا' برعظیم کا ہر شہر اور ہر خطہ انگریزوں کے خلاف زبردست مورچے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ حسن و زیبائی کا شہر لکھنؤ بھی اس مہم میں پیش پیش تھا۔ جیسا کہ زیر تحریر باب کے آغاز میں لکھا گیا ہے' دربار اودھ کے بھیجے ہوئے نمائندے پورے ملک میں انقلابی تحریک پھیلا رہے تھے۔ مجاہدوں کے قافلہ سالار مولوی احمد اللہ شاہ جو پورے ملک کا دورہ کر چکے تھے اور اس سلسلے میں "دہلی کے مفتی صدر الدین آزردہ نے اپنے تعارفی خطوط دیئے تھے" [۳] اسی لکھنؤ میں برطانوی فوج سے برد آزما تھے۔ خود بیگم اودھ' حضرت محل' بہ نفس نفیس بیرونی قوت سے برسر پیکار تھیں۔ شاہزادہ فیروز شاہ نے اسی "شہر خوباں" میں علم حریت بلند کیا تھا اور حصول آزادی کے سلسلے میں بڑی سرگرمی دکھائی تھی ـــــ لیکن فتح و نصرت اہل وطن کے مقدر میں نہ تھی۔ شکست و ریخت کا جو نتیجہ سامنے آیا' اس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ انگریزوں نے فتحمندی کے

---

۱ مطبوعہ "صادق الاخبار" دہلی' مورخہ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ' صفحہ اول
نیز عکس مطبوعہ "نوائے آزادی" مرتبہ قریشی عبدالرزاق' ص ۶

۲ ایضاً

۳ قریشی' اشتیاق حسین: Ulema in Politics' ص ۱۹۰

نشے میں سرشار ظلم و ستم کا جو رویہ اختیار کیا، اس سے تہذیب و ثقافت اور علم و ہنر کا مرکز لکھنؤ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد وہاں کا جو حشر ہوا، اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"جن بارونق بازاروں میں زندگی اور زندہ دلی کا ہجوم رہتا تھا، ان میں لاشوں کی وہ کثرت اور انسانی گوشت کے سڑنے سے تعفن کی وہ شدت ہوئی کہ ایک عرصہ تک کتوں اور کرگسوں کے سوا انسان کا ادھر سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ ہرے بھرے باغ کے تھالے خون سے بھر گئے۔"[1]

شعرائے لکھنؤ جنہوں نے واجد علی شاہ اختر کی معزولی کے سانحہ کو موضوعِ سخن بنایا، اس خونچکاں منظر سے کس طرح اپنی نظریں ہٹا سکتے تھے اور ان کا دل زوال و ادبار کی اس انتہا سے کیوں کر اثر قبول نہ کرتا۔ چنانچہ اس دور کے لکھنوی شعرائے شہر کی بربادی کا ماتم بھی کیا ہے، تہذیب و ثقافت کے مٹنے کا نوحہ بھی لکھا ہے اور انگریزوں سے نفرت و کدورت کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔

میر امان علی سحر (م: ۱۸۵۷ء) نے نہایت سادہ و سلیس زبان میں شہر بے چراغ کی جو منظر کشی کی ہے وہ درد و اثر کے جذبات سے مملو ہے ؎

عجیب مجمع اہلِ کمال تھا افسوس

ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا

نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وردیاں نہ گجر

نہ توپ چلتی ہے اب نہ ہے غضب کا سناٹا

---

[1] رضوی، ڈاکٹر نیر مسعود: لکھنؤ کا عروج و زوال، مطبوعہ نقوش لاہور شمارہ ۱۰۴، ص ۲۳۴

ناکام انقلاب کے بعد اہل لکھنؤ کے مکانات منہدم کرادیے گئے تھے۔ اس توڑ پھوڑ کے نتیجے میں جو کیفیت سامنے آئی اسے سحر کی زبانی سنیے ؎

کسی کا کھد گیا پشتہ کہیں گری دیوار
چبوترہ کہیں غائب کسی کا دروازہ
جو کچھ خرید کو بازار تک گیا کوئی
وہاں سے پھر کے جو آیا تو گھر نہ پہچانا

معاشی بدحالی پر میر امان علی یوں روشنی ڈالتے ہیں ؎

جہاں میں صاحب جوہر کی ہے یہ بے قدری
ٹکے ٹکے پہ بکیں اصفہانیاں کیا کیا

انگریز حکام نے انقلابیوں کی قوت کو مزید کچلنے کے لئے شہر میں یہ حکم نافذ کردیا تھا کہ چار افراد ایک جگہ اکٹھا نہیں ہو سکتے۔ اس "حکم سرکار" نے شہر کے سناٹے[1] کو اور بھی دو چند کردیا تھا ؎

یہ حکم ہے کہ نہ ہوں چار ایک جا باہم
وہ دن گئے کہ شب و روز رہتا تھا جلسا

سحر نے نہایت سادگی سے مگر پر اثر انداز میں زوال لکھنؤ کی جو جھلک دکھائی ہے وہ تاریخی حقائق پر مبنی ہے اور اس میں کسی قسم کے غلو کا اشتباہ نہیں!

فدا علی عیش (م: ۱۸۹۹ء) نے اپنے مسدس "انقلاب لکھنؤ" میں اس شہر کے دور رفتہ کی شان و شوکت اور عظمت و رفعت کا نقشہ مسحور کن انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

---

[1] جعفری، ڈاکٹر قمقام: شہر آشوب، مطبوعہ اردو، کراچی، شمارہ ۲، ۱۹۷۷ء، ص ۱۸۰

لکھنؤ رشک دہ روضۂ رضواں تھا کبھی
صاحبِ منزلت و قدر فراواں تھا کبھی
زینت و زیب دہ ملکِ سلیماں تھا کبھی
باغ جنت کی روش تازہ گلستاں تھا کبھی

لوگ مشتاق تھے دیدار کے دیوانے تھے
ہفت اقلیم میں اس شہر کے افسانے تھے

پھر وہ عظمتِ رفتہ کا موجودہ دور کی تباہی و بربادی سے موازنہ کرتے ہیں اور اس طرح قاری کے سامنے تصویر کے منور و تاریک دونوں رُخ پیش کر دیتے ہیں۔ تخریب و زوال کے بعد کا لکھنؤ درج ذیل شکل و صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے؂

جا بجا ڈھیر مکانوں کے جو آتے ہیں نظر
کھینچ کر آہ بصد درد یہ کہتے ہیں بشر
تھا کسی وقت میں آباد یہ شہر خوشتر
شام تھی شام اودھ، صبح بنارس تھی سحر

پہلے آباد تھا یہ ملکِ سلیماں کی طرح
اب تو اُلٹا ہوا ہے خطۂ یوناں کی طرح

عیش کے اس مسدس کی اہمیت یوں بھی فزوں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اودھ کی ویرانی و بربادی کے علاوہ تہذیب و ثقافت کے مٹنے کا حال بھی بیان کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی فتح و نصرت صرف جغرافیائی حدود ہی پر مشتمل نہ تھی، اسلامی تمدن، طرز معاشرت اور تعلیمی ماحول پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ کسی بھی قوم کا زوال سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے حدود و اربعہ سے بیدخل ہونے اور مفلسی و قلاشی میں ڈوب جانے سے ہی عبارت نہیں،

کلچر کے مٹنے، طریقۂ تعلیم کے بدلنے، معاشرت کے متغیر ہونے اور زبان و ادب کے فرو تر ہو جانے پر بھی محمول ہوتا ہے۔ عیش نے اپنی سماجی و عمرانی نکات کو بروئے کار لا کر ہم عصر شعرا میں اپنا پلہ گراں کر لیا ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ برطانوی فتح و نصرت کے زیر اثر ہمارا کلچر، ہماری تعلیم اور ہماری ثقافت کس طور پر متغیر و متشکل ہوئی۔[۱]

اب کہاں اس کی وہ رونق وہ شکوہ اور وہ شان
اگلی باتوں کا نہیں خواب میں بھی نام و نشان
نہ وہ پوشاک نہ وہ لوگ نہ وہ لطف زبان
دیکھو بس آنکھوں سے اجناب عیاں را چہ بیاں

اب یہ تہذیب ہے یوں چال لشر چلتے ہیں
سیٹیاں منہ سے بجاتے ہیں جدھر چلتے ہیں

واضح رہے کہ شرقی تہذیب و تمدن میں سڑکوں پر سیٹیاں بجا کر چلنا بے حد معیوب سمجھا جاتا رہا ہے۔

اب ہم علمی و لسانی تبدیلیوں سے متعلق عیش کے اشعار پیش کرنے سے قبل یہ بتاتے چلیں کہ فرنگی قوم سلطنت اودھ پر جنگ بکسر کے بعد سے ہی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اور دلی پر اس کا بالواسطہ تسلط تو ۱۸۰۳ء سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو فروغ بھی حاصل ہو چکا تھا۔[۲] انگریزوں کے اس تسلط و تاثر نے اہل وطن کی زبان کو متغیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اب انقلاب ستاون کے بعد اس میں اور بھی تیزی آ گئی تھی۔ عیش ایک وطن دوست اور صاحب حمیت شاعر کی حیثیت سے ان بدلتے ہوئے عناصر پر گہرا

---

[۱] طوسی، ایم ایس: The Muslim League and Pakistan Movement، ص ۷

[۲] نیز حسین، خواجہ تہور: انیسویں صدی کے اہم اردو ادارے، مطبوعہ ادب لطیف لاہور اردو نمبر دسمبر ۱۹۵۵ء ص ۲۹

کررہے ہیں ؎

عہدِ شاہی کے جو کچھ لوگ نظر آتے ہیں
نیم وحشی وہی اس وقت میں کہلاتے ہیں
لبھوں سے غیر مہذب بھی سنے جاتے ہیں
پڑھ کے انگریزی مہذب کا لقب پاتے ہیں

جو زباں ان کی بہ عمدہ وہ زباں ہے اب تو
فعل انگریزوں کا مطبوع جہاں ہے اب تو

برطانوی سیلاب سے اسلامی تہذیب و تمدن اور تعلیم و ثقافت کو بچانے کے لئے جو کام اکبرالہ آبادی نے وسیع پیمانے پر شروع کیا تھا، اس میں تھوڑی بہت شمولیت فدا علی عیش کی بھی تھی۔

جان صاحب[1] (م: ۱۸۸۰ء) جو ریختی کے شاعر کہلاتے ہیں، ہنگامۂ دار و گیر میں لکھنؤ میں موجود تھے[2]۔ انہوں نے اس وقت کے حالات کو اپنے متعدد اشعار میں پیش کیا ہے۔ مثلاً درج ذیل شعر میں وہ بھگدڑ[3] کی کیفیت کو یوں واضح کرتے ہیں ؎

اس انقلاب نے ہر ایک کو کیا محتاج
زمانہ ہوگیا بھگدڑ سے اے بوا محتاج

جان صاحب اس دور کی معاشی بدحالی اور مالیاتی بحران کی تصویر بھی اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے سے نہیں چوکتے ؎

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ ریختی مع دیوان جان" مرتبہ مولوی سید محمد مبین نقوی
[2] حسنوی؛ ڈاکٹر قمر عام "شہر آشوب" مطبوعہ اردو کراچی شمارہ ۲ ۱۹۷۷ء ص ۱۶۹
[3] لفظ "بھگدڑ" جو عوام میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے لئے مستعمل تھا، کسی اور کے یہاں عجب شاذ و نادر ہی ملے گا۔

عوض میں دینے کے دلوائیں دھکّے گالیاں دیں

جوان کے در پہ کوئی جا کے ہو کھڑا محتاج

کہیں کہ تجھ سے سوا ہم فقیر ہیں چل

یہاں نہ کوڑی ملے گی، ہوا ہو جا محتاج

جان صاحب نے ایک جگہ اس دور کی ایک ایسی حقیقت کو نظم کیا ہے جسے پیش کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن عورتوں کی زبان اختیار کرنے والا یہ شاعر مردِ جرأت مند نکلا اور انگریزوں کے اس حکم کو ادب تاریخ کا ایک عنوان بنا گیا جس کے تحت ہتھیار رکھنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ (اور یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں دیسی لوگ "سامانِ حرب چھپائے تو نہیں بیٹھے ہیں' گھروں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔) آنے والے دور میں آزادی کی جدّ و جہد کو کچلنے کے لئے انگریز حکام نے ہمیشہ یہی طریقہ اپنایا۔ جان صاحب کے قانونی نوعیت کے دو اشعار یہ ہیں ؎

چاقو تک رکھنا نہ اب گھر میں بہادر مرزا

حکم سے ہوتے ہیں سرکار کے ہتھیار تلاش

سیسہ، شورہ اجی گندھک ہو کہ گولہ بارود

رات دن کرتی ہے ان چیزوں کی سرکار تلاش

جان صاحب کے کلام کو محض اس بنا پر نظر انداز کر دینا کہ یہ ریختی گو کا کلام ہے' نامناسب اور ادبی بد دیانتی کا موجب ہوگا۔ ہم یہاں واضح کرتے چلیں گے کہ زٹلی بھی ایسا ہی نظر انداز کیا ہوا شاعر تھا۔ لیکن قارئین گذشتہ باب میں یہ دیکھ آئے ہیں کہ وہ اپنے دور کی کیسی گرجدار آواز تھا۔ اور ابھی ابھی ہم حسامی کا تذکرہ کر آئے ہیں جو بقول شخصے ان پڑھ اور نابینا فقیر تھا' لیکن اس کا کلام آج بھی ہمیں متاثر کر رہا ہے۔ سو جان صاحب بھی ہمارے لئے ایسے ہی عزیز ہیں جیسے صفِ اول کے دوسرے شعرا۔

اب ہمیں بزم لکھنؤ کے ایک ایسے شاعر کا تعارف کرانا مقصود ہے جو آزادی کی اس جنگ میں بہ نفس نفیس شریک تھا۔ ہماری مراد منیر شکوہ آبادی (م: ۱۸۸۱ء) سے ہے۔ ان کے متعلق جہاں رام بابو سکسینہ یہ لکھتے ہیں کہ "بعد غدر ایک رنڈی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی"[۱] وہاں غلام رسول مہر بھی اس رائے کے حامی نظر آتے ہیں اور یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں بعض ایسی شخصیتوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو حبس دوام کی سزا پا کر انڈمان پہنچیں مگر وہ معاملہ بالکل جداگانہ تھا۔[۲] لیکن تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رنڈی کا قتل محض بہانہ تھا۔ دراصل منیر شکوہ آبادی ان مجاہدین آزادی کے متعلق اشعار لکھتے رہے تھے جو انگریزوں سے معرکہ آرا ہوئے اور ناکام جنگ آزادی کے بعد جنہیں پھانسی دے دی گئی۔ اس حقیقت کا اعتراف خود غلام رسول مہر کے یہاں موجود ہے۔[۳] آیئے ہم اس مسئلے کو سلجھاتے چلیں کہ اسی میں اس شاعر کی بڑائی مضمر ہے۔

فرخ آباد کے رئیس نواب تجمل حسین خاں[۴] نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا اور ان کے پاس تیس ہزار کا لشکر مقابلے

۱۔ سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۲۴۰

۲۔ مہر، غلام رسول: ۱۸۵۷ کے مجاہد، ص ۱-۲

۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ۱۸۵۷ کے مجاہد

۴۔ یہ وہی تجمل حسین خاں ہیں جن کے متعلق غالب نے کہا تھا ؎

دیا ہے اور کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

کے لئے موجود تھا[1]۔ لیکن غداروں کی وجہ سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا[2]۔ ایک انگریز افسر کے جان بخشی کے وعدے پر انہوں نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا[3] اور اپنی ان کی خواہش کے مطابق مکہ بھیج دیا گیا[4]۔ لیکن ان کے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کو جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھے، برطانوی حکام نے پھانسی دے دی[5]۔ منیر نے اس المناک حادثے کی تاریخ کہی[6]۔ قطعہ کے آخری دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

وہ بے گنہ ہوا تیغ مرگ سے مقتول

عنایت اس کو کیا حق نے گلشن جنت

منیر نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ

ہوا شہید امیر دلیر با ہمت

۱۲۷۴ھ

غلام رسول مہر کے بقول منیر شکوہ آبادی نے فرخ آباد کے دو اور رئیسوں کے جنگ آزادی کے سلسلے میں پھانسی پانے پر بھی قطعہ تاریخ کہا تھا[7]۔ آخری دو شعر

---

[1] میلی سن: History of the Indian Mutiny، جلد سوم، ص ۳۴۷

[2] شہابی، مفتی انتظام اللہ: ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، ص ۸۹

[3] میلی سن: ایضاً، ص ۲۲۳

[4] مہر، غلام رسول: ۱۸۵۷ کے مجاہد، ص ۱۷۴

[5] ایضاً، ص ۱۷۵

[6] ایضاً، ص ۱۷۵

[7] ایضاً، ص ۱۷۶

ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

دونوں جوان نیک، امیرانِ باحشم
مقتولِ تیغِ تیز قضا آہ آہ ہائے
تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے یہ منیر
دونوں شہیدِ راہِ خدا آہ آہ ہائے

دونوں قطعات کا بغور جائزہ لیجئے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ منیر نہ صرف انہیں بے گناہ ثابت کر رہے ہیں اور "مجرم کا نہیں" شہید کا لقب عطا کر رہے ہیں بلکہ ان کے قتل پر اپنے دلی تاسف کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جن کے متعلق یہ اشعار کہے گئے تھے، وہ کوئی غیر معمولی شخصیات نہ تھیں بلکہ وہ رؤسائے فرخ آباد تھے اور یہ ناممکن سی بات ہے کہ منیر کے ان قطعات کی خبر مخبروں کے ذریعہ برطانوی افسران کو نہ ہوئی ہو اور انہوں نے باغیوں کا نوحہ لکھنے والے اس شاعر کا نام باغیوں کی فہرست میں نہ ٹانک لیا ہو۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ حقائق کا سلسلہ کچھ اور دراز دکھائی دیتا ہے۔ جب وقت آزادی کی جنگ شروع ہوئی تھی، منیر نواب علی بہادر خان، والیٔ باندہ کے مصاحب تھے[1]۔ یہ وہ وقت تھا کہ جھانسی کی رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے اور ڈھونڈو پنت نانا انگریزوں کے خلاف اٹھ چکے تھے اور دیگر ریاستوں کو جنگ آزادی کا پیغام دے رہے تھے۔ منیر شکوہ آبادی نے نواب علی بہادر کو انقلاب میں شریک ہونے پر آمادہ کیا[2]۔ چنانچہ والیٔ باندہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور راج گڑھ پر حملہ کر کے اسے قبضے میں کر لیا[3]۔ اس

---

[1] عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۲۳۸
[2] صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث: لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۴۶۹
[3] شہابی، مفتی انتظام اللہ: مشاہیر جنگ آزادی، ص ۱۲۶

فتح و نصرت کے موقع پر منیر نے یہ شعر کہا تھا۔

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو

سب عدو مقتول تیغ و بستۂ زنجیر ہیں[1]

جب انگریزوں نے دوبارہ یورش کی تو منیر شکوہ آبادی مرزا ولایت حسین کے ہمراہ امداد حاصل کرنے کی غرض سے نکلے اور فرخ آباد میں گرفتار کرلئے گئے۔ مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی[2]۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی یہ سزا جو خود منیر شکوہ آبادی کے بقول[3] مصطفےٰ بیگ نامی ایک شخص کی تزویر سے انہیں ملی، کیا محض برنائے قتل تھی۔ یہاں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۸۵۸ء سے انگریزوں نے انڈمان کو عمر قید کی سزا بھگتنے والوں کے لئے مخصوص کر رکھا تھا[4] اور قتل کے ملزم کے لئے یہی سزا تجویز کی گئی ہوگی۔ مگر یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ نواب جان طوائف اس دور کی مایۂ ناز اور اہم شخصیت تو نہ تھی کہ اس کے قتل کے سلسلے میں منیر شکوہ آبادی پر اس انداز سے جور و ستم روا رکھا گیا:

"باندے کے زنداں میں مجھ پر لاکھوں ستم ہوئے اور

پھر ہم کو الہ آباد بھجوا دیا گیا۔۔۔۔۔ پھر وہاں سے

---

[1] شہابی، مفتی انتظام اللہ: غدر کے چند علماء، ص ۶۵؛

[2] صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث: لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۶۹۴

[3] ع مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں تھے

کج روی میں بڑھ کے چرخ پیر سے

کرکے خون ناحق نواب جان

مجھ کو پھنسوا دیا تزویر سے

[4] انسائیکلوپیڈیا، اردو، فیروز سنز، ص ۱۸۰

کلکتہ پیدل روانہ ہوئے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پاؤں
میں بیڑیاں۔ فوٹو اتارا گیا اور ہم کالے پانی بھیج دیے
گئے۔"[1]

ظلم و تشدد کی یہ کیفیت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ایک غیر معروف اور غیر اہم شخصیت کا قتل محض بہانہ تھا، ورنہ مقصود سزا سراسر سیاسی تھا۔

جب کہ ہم ابھی ابھی لکھ آئے ہیں، منیر نے جنگ آزادی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کو اشعار میں پیش کیا ہے۔ ان کی تاریخی و ادبی اہمیت مسلم ہے۔ مزید براں، انھوں نے متذکرہ قید کا حال بھی ایک طویل قطعہ میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کچھ شواہد قید کے لکھوں اگر — خون ٹپکے ہر لب تقریر سے
باندہ کے زنداں میں لاکھوں ستم — سہتے تھے ہم گردش تقدیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
بول و غائط کی جگہ بستر کے پاس — تھی نجس تر خانۂ خنزیر سے
روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں — نان گندم تھی سوا اکسیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب — خشک تر تھی سبزہ شمشیر سے
تھا بچھونا ٹاٹ، کمبل اوڑھنا — گرم تر پشمینۂ کشمیر سے

درج بالا نظم کی اہمیت محض اس بنا پر نہیں ہے کہ یہ ایک مقید شاعر کی روداد دل ہے، بلکہ اس کی سیاسی قدر و قیمت بھی آشکارا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ انگریزوں نے جنگ آزادی میں حصہ لینے والے محب وطن افراد کو

---

[1] منقول عشرت، خواجہ محمد عبد الرؤف، تذکرہ آب بقا، ص ۹۵

ظلم وستم کا نشانہ بنانے کے لئے باندہ یا کسی اور شہر کے زنداں میں ہی پابجولاں نہیں رکھا تھا، اپنے جزیرہ انڈمان میں بھی مقید کر رکھا تھا، جہاں کے قید خانے کا یہ حال تھا کہ "ہر کوٹھری پر چھپر جس میں رنج و رض بھرا ہوا، چھتیں ٹپکتی تھیں، مرض ارزاں، درد گراں، بیماریاں بے شمار، خارش و قوباعام"[۱] انگریزوں نے اس جہنم نما جزیرے میں صرف منیر شکوہ آبادی ہی کو قیدی بنا کر نہیں رکھا، "بے شمار متقدر علمائے کرام کو یہاں کے زنداں خانے میں دھکیل دیا گیا تھا"[۲] منیر کا درج بالا قطعہ ان سارے مجاہدین کی روداد دل ہے جنہیں یہاں پابہ زنجیر کر کے ظلم و جور کا نشانہ بنایا گیا۔ تشدد کی وارداتیں چاہے باندہ میں پیش آئی ہوں چاہے انڈمان میں ـــــ منیر کی نظم سب کی ترجمانی کر رہی ہے۔

منیر شکوہ آبادی کو لکھنؤ سے نہ صرف عشق تھا[۳] بلکہ ان کی غزلوں میں یہاں کے دبستان کا رنگ خاص نمایاں نظر آتا ہے[۴]۔ اس شہر کی تباہی و بربادی پر وہ بے حد دل گرفتہ دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی اس دلی کیفیت کا اظہار غزل کے اشعار میں وہ اس طرح کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کا اپنا رنج و غم آشکار ہو جاتا ہے بلکہ جنگ آزادی کے بعد کے زوال پذیر لکھنؤ کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے ؎

دل تو پژمردہ ہیں داغ تخم گلستاں ہوئے تو کیا
آنکھیں بے رونق ہیں دیوان زخم خنداں ہوئے تو کیا

---

[۱] خیرآبادی، فضل حق: الثورۃ الہندیہ، ص ۴۲۸

[۲] سوسائٹی، پاکستان ہسٹاریکل: A Short History of Hind-Pakistan، ص ۴۲۳

[۳] پانی پتی، شیخ محمد اسمٰعیل: شعرائے متغزلین، مطبوعہ نقوش لاہور، غزل نمبر، ص ۶۲۹

[۴] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۲۴۲

موت کے پنجے میں شاہانِ دلاور پھنس گئے
شیر افگن ایک دو شیر نیستاں ہوں تو کیا
بیگمیں، شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
اب چڑیلیں صاحبانِ قصر و ایواں ہوں تو کیا
مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں، صومعے ویران ہیں
یادِ حق میں ایک دو دلہائے سوزاں ہوں تو کیا
مٹ گئے "قصر معلّٰی"، کھد گئے زرّیں محل
رنج سے معمور گردل ہائے ویراں ہوں تو کیا
سخت جان و بے حیا دو چار ہم سے جو رہے
ہر گھڑی پابند خوف عزت و جاں ہوں تو کیا

سخت جاں منیر جو اتنی صعوبتیں اٹھانے کے بعد بھی ۱۸۸۱ء تک زندہ رہے اور ہر گھڑی عزت و جاں کے خوف سے لرزہ براندام "لکھنؤ کے عہد رفتہ کو بھولنے میں کامیاب نہ ہو سکے"[1] ؎

پھر لکھنؤ میں آئی دوبارہ نہ آج تک
جنت میں کیا بہار گئی عیش باغ کی

اس ہنگامہ دار و گیر کے وقت امیر مینائی (م: ۱۹۰۰ء) جوانی کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ تباہی و بربادی کے جو مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے، وہ اشعار کے قالب میں یوں ڈھل گئے ہیں ؎

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے
روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے

---

[1] عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۲۰۲

یا ہم جاتے ہیں گھر سے رخصت ہو کر
یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

اگرچہ امیر مینائی کی بقیہ زندگی رام پور اور حیدر آباد دکن کے شاہی درباروں سے وابستہ رہی، لیکن انہیں لکھنؤ کا زوال خون کے آنسو رلاتا رہا۔

امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں کہاں ہوں گی
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کو امیر مینائی جیسے ثقہ بزرگ نے جس طرح محسوس کیا تھا، اس کا اظہار ان کے اشعار میں ہونا لازمی تھا۔ ذرا ملاحظہ کیجئے، غزل کے پیرائے میں پورے دور کی کربناک فضا کتنے اثر انگیز طور پر ابھر رہی ہے۔

قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اللہ رے انقلاب جہان پلید کا
خون حسین غازہ ہے روئے یزید کا

یہ کس کی تیغ جفا کا یارب ہر ایک دل پر ہے رعب غالب
ہلال کی ہے خمیدہ گردن سپہر چلتا ہے سر جھکا کر

انگریزوں کی پھیلائی ہوئی تباہی و بربادی پر نوحہ خوانی کرنے والے لکھنوی شعرا میں صرف سحر، عیش، جان، منیر یا امیر ہی نہیں دکھائی دیتے اس دور کے کسی بھی شاعر کے کلام کا جائزہ لیا جائے انہی موضوعات کی جلوہ گری نظر آئے گی۔

آئیے اب ہم دیار لکھنؤ سے نکل کر چند دوسرے مقامات کے شعرا سے بھی متعارف

ہو جائیں کہ اس نوع کی شاعری میں ان کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ رہا ہے۔ مراد آباد سے تعلق رکھنے والے مولانا کفایت علی کافی (م: ۱۸۵۷ء) صاحب علم وفضل اور حمد و نعت کے شاعر تھے[1]۔ جب سن ستاون میں غیر ملکی حکومت کے خلاف قدم اٹھائے گئے تو انہوں نے بھی مسندِ علم اور بزمِ سخن کو چھوڑ کر جنگِ آزادی میں مردانہ وار حصّہ لیا[2]۔ انگریزوں نے جب مراد آباد پر قبضہ کر لیا تو دیگر مجاہدین کے ہمراہ یہ بھی گرفتار ہوئے اور انہیں پھانسی کا حکم ہوا۔ جب مولانا کافی کو تختۂ دار کی طرف لے جایا گیا تو یہ نہایت بلند آواز سے اپنی تازہ غزل پڑھتے ہوئے چلے۔ چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ۱۸۵۷ء میں اسلام کی سربلندی کی جو پیش گوئی کی تھی وہ ایک صدی ختم ہونے سے بھی قبل حرف بہ حرف پوری ہوئی ؎

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا

ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا

نامِ شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن
حشر تک نام و نشانِ پنجتن رہ جائے گا

---

[1] نساخ، عبدالغفور: سخن شعرا، ص ۳۹۵
[2] جعفری رئیس احمد: واجد علی شاہ اختر اور ان کا عہد، ص ۵۵۴

مولانا کافی کا آخری شعر اس حقیقت کو بخوبی واضح کر رہا ہے کہ شاہِ برطانیہ جس کی حکومت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، آج اپنے ہی جزیروں میں سمٹ کر رہ گیا ہے، اور اسلامی جمہوریۂ پاکستان کو دنیا کے نقشے پر ابھرے ہوئے بتیس سال گزر چکے ہیں۔

شہر بریلی کے سید احمد، جو خان بہادر خان، والیٔ روہیلکھنڈ کی حکومت میں مفتی کے عہدے پر سرفراز تھے[1]، شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ وہ اس جنگِ آزادی میں بہ نفسِ نفیس شریک تھے۔ انگریزوں نے جب روہیلکھنڈ پر اپنا قبضہ جما لیا تو جہاں خان بہادر خان اور دیگر مجاہدینِ آزادی کو پھانسی دے دی گئی[2] وہاں سید احمد کو کالے پانی کی سزا دے کر انڈمان بھیج دیا۔ اس ویران جزیرے میں جس قسم کا ظلم روا رکھا جاتا تھا، اس کا ذکر منیر شکوہ آبادی کے ضمن میں ہم کر چکے ہیں۔ ہمارے مجاہد شاعر سید احمد بھی انہی مصائب و آلام کا شکار ہوئے اور یہ تشدد ان پر اس درجہ شاق گزرا کہ سرکارِ دوعالم کے حضور ایک منظوم عرضداشت پیش کی[3]۔ تین اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؎

نہ سننا تھا جو کچھ وہ سب کچھ سنا
نہ ہونا تھا جو کچھ وہ سب کچھ ہوا

لٹا گھر دیارِ وطن بھی چھٹا
چھٹے سب کے سب دوست آشنا

---

[1] بدایونی، سلیمان: بدایوں ۱۸۵۷ء میں، ص ۹۷

[2] بریلوی، سید الطاف علی: حیاتِ حافظ رحمت خان، ص ۲۲۳

[3] قادری، محمد ایوب: جزائر انڈومان نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات، مطبوعہ اردو، کراچی جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۱۷

اسیری اب اس پہ بہت شاق ہے
یہ سید رہائی کا مشتاق ہے

مگر رہائی اس سید زادے کے نصیب میں نہ تھی۔ وہ انگریزوں کا ظلم و جور سہتے رہے حتیٰ کہ وہیں خدائے حقیقی سے جا ملے۔ ان کے اشعار ہمیں آج بھی یہ باور کرا رہے ہیں کہ آزادی کی راہ میں گھر بار لٹانے والے یہ لوگ صاحب سیف بھی تھے' صاحبِ قلم بھی!

اسی زمانۂ پرآشوب میں ہمیں الہ آباد کے خالص غزل گو شاعر[1] مولوی وحید الدین وحید (م: ۱۸۹۲ء) کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ ہمارے موضوع سے متعلق ان کی ایک غزل "موزوں الفاظ کی تلاش' ترکیبوں کی تراش خراش' سوز و گداز اور درد و غم کے بیان"[2] کی وجہ سے معرکے کی چیز ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد رونما ہونے والی صورت حال کو "استعارے کے پردوں"[3] کے میں جس فنکارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے' وہ شاعر کی کہنہ مشقی اور قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ اس غزل کے مطالعے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اردو کا جو بھی شاعر جہاں کہیں مقیم تھا' برعظیم کے سیاسی تغیرات سے نہ تو بے خبر تھا اور نہ ہی غیر متاثر! ۔ انگریزوں کے مکمل تسلط سے جو عظیم انقلاب ملکی سطح پر رونما ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کی بساط الٹ گئی تھی' اس نے کڑا جیسے دور افتادہ قصبے کے درویش صفت شاعر کو بھی

---

[1] عثمانی' محمد عادل: وحید کڑوی' مطبوعہ قومی زبان' کراچی' جنوری ۱۹۷۷ء' ص ۱۴
[2] جعفری' ڈاکٹر تمقام: شہر آشوب' مطبوعہ اردو' کراچی' شمارہ ۳' ۱۹۷۷ء' ص ۱۱۶
[3] حقی' شان الحق: نکتہ راز' ص ۳۱۵

یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا ؎

لالۂ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہو گیا
جلوۂ شمعِ شبستانِ چمن کیا ہو گیا

اے صبا نشو و نمائے غنچہ و گل کیا ہوئی
آب و رنگِ خوبرویانِ چمن کیا ہو گیا

تختہ ہائے ارغوان و لالہ و گل کیا ہوئے
کشورِ آبادِ سلطانِ چمن کیا ہو گیا

انگریزوں کے مظالم نے جس طرح اہلِ وطن کے نظامِ حیات کو متزلزل کر دیا تھا اور پورے برِعظیم میں جائے پناہ کی تلاش میں جس قسم کی افراتفری اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی، وہ اس حقیقت کی غماز ہے کہ سرے سے انتظام سلطنت ہی درہم برہم تھا۔ ان سیاسی عناصر کو وحید نے کس چابکدستی سے غزل کے اشعار میں بیش کیا ہے اس کا اندازہ ناظرین خود ہی لگائیں گے ؎

اپنے موقع پر نظر آتا نہیں کوئی نہال
انتظامِ نخلبندانِ چمن کیا ہو گیا

جس کو دیکھو بے اجازت اب وہ رکھتا ہے قدم
اہتمامِ اہلکارانِ چمن کیا ہو گیا

حسنِ تغزل کو بروئے کار لاتے ہوئے وحید الہ آبادی درج ذیل شعر میں دفاعی قوت کے ضعف و تنزل کا شکوہ کر رہے ہیں ؎

وہ روانی موجۂ انہار گلشن میں نہیں
جوہرِ شمشیرِ عریانِ چمن کیا ہو گیا

یہ دراصل جوہرِ شمشیر کے فقدان کا ہی نتیجہ تھا کہ سلطنتِ دہلی اختتام

پذیر ہوئی اور بہادر شاہ ظفر جو قطرۂ شبنم کی مانند ہزاروں گلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے ملک بدر کر دیئے گئے۔ تاریخ کے اس گھمبیر واقعہ کی ترجمانی وحید الہ آبادی جیسے روایت پرست غزل گو نے اس طرح کی ہے ؎

کیا ہوا دامانِ گل میں قطرۂ شبنم جو تھا

وہ درِ نایاب نیسانِ چمن کیا ہو گیا

غرض اس ناکام انقلاب نے مسلمانوں کی شان و شوکت، ان کا جاہ و جلال، ان کی تہذیب و ثقافت، ان کی عظمت و سربلندی، ان کا معاشی و معاشرتی استحکام اور ان کا سیاسی وقار و امتیاز ـــــ سب کچھ ختم کر دیا۔ اس عظیم سانحہ پر وحید یوں نوحہ کناں ہیں ؎

غنچہ و گل، یار و ساقی، شیشہ و جام و شراب

اے وحید اپنا وہ سامانِ چمن کیا ہو گیا

درج بالا سطور سے ہم نے یہ اندازہ لگا لیا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو ہمارے شعراء نے بہ حسن و خوبی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اظہارِ خیال کے لئے باقاعدہ کوئی فارم کوئی نئے آرٹ مختص نہیں کیا گیا تھا۔ موزونیٔ طبع کے لحاظ سے شاعری کی جو بھی مروجہ ہیئت پسند آئی، محسوسات اور مشاہدات کی عکاسی کا ذریعہ بنی۔ علاوہ ازیں واقعات کی ترجمانی کہیں صاف اور واضح طور پر کی گئی ہے اور کہیں رمز و کنائے کے انداز میں! لیکن یہ حقیقت ہے کہ شعراء نے خارجی ماحول سے خود کو الگ تھلگ نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس لمحۂ دار و گیر کی شاعری بھی اس خیال و رائے کو یکسر رد کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے جس کی رو سے ہمارے شعرا محض داخلی جذبات و محسوسات کی

ترجمانی کرتے رہے ہیں اور اپنے ارد گرد رونما ہونے والے حالات و واقعات سے سراسر بے خبر و ناآشنا رہے ہیں۔ اردو ادب کا یہ المیہ ہے کہ حسن و عشق، گل و بلبل، فراق و وصال اور شوق و جنوں جیسے موضوعات کچھ اس طرح ذہن و دل پر حاوی ہیں کہ قاری و نقاد دونوں ہنوز اس دائرے سے نکل نہیں پائے ہیں، اور روز ازل سے یہی فتوٰی دیا جا رہا ہے کہ شعرائے اردو کو نہ ہی سیاست سے کوئی تعلق رہا ہے، نہ ہی معاشرت و معیشت سے۔ غالباً قاری و نقاد کے اسی سوچ کا منطقی نتیجہ تھا کہ تشبیہ و استعارہ کے پس پردہ زندہ و متحرک تاریخی عوامل کبھی نظر نہ آئے "ورنہ ہر جگہ اسیر سے مراد کوئی فرضی بلبل اور صیاد سے مراد چڑی مار نہیں ہوتا" [1] اور جب غالب مغلیہ دور کے زوال کا ماتم اس طرح کرتے ہیں ؎

گلشن میں بند و بست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

تو شرح نگار کو باغ میں ہر طرف دلآویزی کے سامان نظر آتے ہیں اور قمری کے طوق کی بدولت حلقۂ بیرون در پر دلفریبی و دلکشی کا گمان گزرتا ہے۔ [2]

شاعر اور اس کی شاعری کو سمجھنے کا یہی عالم ہو تو پھر ع
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے

---

[1] حقی، شان الحق: نکتۂ راز، ص ۳۱۵

[2] چشتی، پروفیسر یوسف سلیم: شرح دیوان غالب، ص ۴۱۴

ساتواں باب

قومی و وطنی شاعری کا عبوری دور

ملک وملت کے تحفظ کا جو سلسلہ جنگِ پلاسی سے شروع ہوا تھا وہ سو سال بعد شکست و ریخت کے انتہائی مایوس کن موڑ پر آ کر ختم ہو گیا۔ امنگ و آرزو کی برق پاش لہریں احساسِ محرومی کے سرد خانے میں منجمد ہو کر رہ گئیں۔ عزم و ہمت کی شعاعیں حزن و یاس کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں فنا ہو گئیں۔ جن کے ہاتھوں میں وقت کی طنابیں تھیں، وہ لمحۂ جانکنی میں دم توڑنے لگے۔ مردہ دلی پست ہمتی اور ناامیدی کے عناصر سرگرمِ عمل ہو گئے۔ وقت کے آہنی ہاتھوں نے جوش و عمل کے سارے جذبات مفلوج کر دیے۔ اب قوم تھی اور ماتمِ یک شہر آرزو!

برعظیم کی تاریخ کا یہ بڑا ہی اہم موڑ تھا۔ ملک چھن چکا تھا۔ غلامی کا طوق گلے میں ڈال دیا گیا تھا۔ ذلت و رسوائی کی زنجیریں پاؤں میں حائل ہو چکی تھیں۔ انگریز فتحمندی کے نشے میں سرشار، اجل کی صورت سر پر کھڑے تھے۔ قوم نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کے مصداق مجسمۂ بےجان کی طرح ختم کر رہ گئی تھی۔

مسلمانوں کے لئے یہ وقت قیامت سے کم نہ تھا۔ تختِ شاہی سے یہ اٹھائے گئے تھے۔ زمامِ سلطنت ان کے ہاتھوں سے چھینی گئی تھی۔ اقتدار ان کا ختم ہوا تھا۔ "انقلاب کے ہمہ گیر منصوبے انہوں نے بنائے تھے۔ برطانوی سامراج کا قلع قمع کرنے کے لئے صف آرا بھی یہی ہوئے تھے"۔[1] ان حقائق کا لازمی نتیجہ تھا کہ انگریز ان ہی کے درپے آزار ہوئے۔ شکست و ناکامی بجائے خود ایک سانحہ تھی اور اس پر مستزاد ظلم و تشدد کی گرم بازاری! ــ چنانچہ عزم و حوصلے کی رہی سہی چنگاری بھی مظالم اور مایوسی دونوں کے انبار تلے دب کر رہ گئی۔

اس پرآشوب اور جاں گسل دور میں سر سید احمد خاں (م: ۱۸۹۸ء)

---

[1] ہرگلس ہنری ـــ منقول از عزیز: Discovery of Pakistan ص ۲۸۳

جیسی ہمہ گیر شخصیت رونما ہوئی۔ وہ ایک وسیع النظر، دور اندیش اور مصالحت پسند انسان ہی نہ تھے، وقت کے بڑے اچھے نبّاض بھی تھے۔ انہوں نے جہاں ایک طرف دربار مغلیہ کی آخری جھلک دیکھی تھی، وہاں دوسری جانب ورودِ انگریز کے بعد مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا نظارہ بھی کیا تھا۔ وہ حالات و کوائف کو دگرگوں ہوتا دیکھ کر محض خاموش تماشائی بن جانے والوں میں نہ تھے۔ قوم کے ایک سچے درد مند کی حیثیت سے انہیں اس کی زبوں حالی کا شدید احساس تھا اور وہ عزم صمیم لے کر اٹھے کہ ملک و ملت کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو گرداب بلا سے نکال کر ہی دم لیں گے۔

سرسید نے ایک طرف "اسباب بغاوت ہند" "سرکشی ضلع بجنور" اور "رسالہ خیر خواہان مسلمان" لکھ کر انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والی کدورت کو زائل کیا تو دوسری جانب اپنی مسلسل سعی و کاوش سے ملّتِ محکوم کو نئے فرماں روا سے قریب تر کرنے کی راہیں ہموار کیں۔ لیکن ایسا کرنے سے سرسید کا مقصد و منشا قطعًا وہ نہ تھا جس کی طرف معین احسن جذبی نے اشارہ کیا ہے کہ "وہ مسلمانوں کو تاج برطانیہ کی کار آمد اور وفادار رعایا بنانا چاہتے تھے"۔[1] سرسید احمد خاں کی تمام کوششوں کو منطقی زاویے سے جانچنے کی کوشش نہیں کی گئی، ورنہ یہ بات از خود واضح ہو جاتی کہ ان کا ایسا کرنا اس دور میں ناگزیر تھا۔ ہندو جو جنگ آزادی میں تھوڑا بہت ساتھ دے رہے تھے، مسلمانوں سے کنارہ کش ہو کر انگریزوں کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ انگریزی تعلیم کے حصول کی طرف تیزی سے پیش قدمی کر کے وہ دنیاوی منفعت سے بہرہ مند ہو رہے تھے۔ ان کے برعکس، مسلمان مایوسی کے

---

[1] جذبی، معین احسن: حالی کا سیاسی شعور، ص ۵۷ - ۵۸

اتھاہ سمندر میں ڈوب کر سب کچھ کھو رہے تھے، جان بھی ــــ کہ نہ جانے کتنے دار و رسن کی آزمائش سے گزر رہے تھے[1] اور مال بھی ــــ کہ بڑے پیمانے پر جائداد اب تک ضبط ہو گئی تھیں[2]۔ ناکام جنگ آزادی سے ابھی ایک ٹھوکا لگا ہی تھا کہ دوسرا ٹھوکا معاشی بحران سے لگ رہا تھا۔

سرسید جانتے تھے کہ نئے حکمران کی قوت مستحکم ہو چکی ہے۔ مسلمان اس قابل اب نہیں رہے کہ ان سے اپنا چھینا ہوا وقار، اپنی اجڑی ہوئی سلطنت اور اپنا کھویا ہوا جاہ و حشم امروز و فردا میں حاصل کر سکیں۔ ان تمام حقائق پر غور و خوض کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو انقلاب کے اس نئے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنا ضروری اور لازمی ہے۔ اسی میں ان کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ ہوا کے نئے رخ کا ساتھ دینے کے معنی یہ تھے کہ انگریزوں کی لائی ہوئی تعلیم کو اپنایا جائے۔ اس طرح معاشی صورت حال بھی بہتر بن سکے گی اور ذہن و دل پر پڑے ہوئے قدامت کے دبیز پردے بھی اٹھ جائیں گے۔ ایسا اس لئے بھی ضروری تھا کہ مسلمان محض مزارِ ماضی کے مجاور بن کر جیت نہیں سکتے تھے۔ اپنی زندگی کی دوڑ میں سبقت بھی لے جانا تھا ــــ اور وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ ان ہی کے ہم وطن جستیں مارتے چلے جا رہے تھے۔ سرسید کا یہ فیصلہ کتنا درست اور صائب تھا، اسے غیر مسلم سیاست داں کی زبانی سنئے:

> "سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو
> جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں،

---

[1] اسپیئر پرسیوال: Twilight of the Mughals، ص ۲۱۸

[2] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۰۳

یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصّہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی ان سے زیادہ مضبوط تھے۔"[1]

سرسید کا یہ فیصلہ کہ مسلمان جدید تعلیم حاصل کریں صرف اس لئے نہ تھا کہ وہ انگریز حاکم کے سامنے سرخرو ہو سکیں، اپنی معاشی حالت کو بہتر بنا سکیں اور ہندوؤں سے جو کچھ ہی دن پہلے ان کے محکوم رہ چکے تھے، پیچھے نہ رہ سکیں ——— بلکہ اس لئے بھی تھا کہ وہ جدید تعلیم سے اپنے آپ کو آراستہ کر کے کھوئی ہوئی سلطنت، کھویا ہوا وقار، کھوئی ہوئی شان و شوکت دوبارہ حاصل کر سکیں۔ نئی تعلیم سے ان کے رگ و پے میں توانائی کی جو لہر رواں ہوگی وہ انہیں غفلت شعاری کے حصار سے باہر نکال لائے گی کہ اس وقت جدّ و جہد اور سعی و عمل ہی درکار تھا۔

سرسید کی تعلیمی تحریک سے جہاں ایک طرف ذہن و دل میں روشنی پھوٹ رہی تھی اور منزل کا سراغ مل رہا تھا، وہاں دوسری جانب ان کی ادبی تحریک سے دنیائے شاعری میں ایک انقلاب بھی رونما ہو رہا تھا ——— اور اسی ادبی انقلاب نے شاعروں کے ایک پورے قافلے کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ وطن کی عظمت کے گیت گائیں، پژمردہ، مضمحل اور مایوس قوم کو از سرِ نو بیدار کریں اور ان میں سعی و عمل کا جذبہ ابھار دیں۔ سرسید کی اس تحریک کا مقصد و مدعا منطقی بھی تھا اور نفسیاتی بھی! — اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے ——— جب تک اہلِ وطن کے ہاتھوں میں ملک پنال

---

[1] نہرو، جواہر لال: An Autobiography، ص ۳۱۵

تھا، وہ اس کی قدر و اہمیت سے کما حقہٗ آگاہ نہ تھے۔ فطرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ کبھی ابھرا نہ تھا۔ مادرِ گیتی کی دلکشی کبھی سامنے نہ آئی تھی۔ کوہ و دریا کبھی موضوعِ سخن نہیں بنے تھے۔ قوم جب تک خوشحال و کامراں تھی، اس کے شاندار ماضی کو کبھی دائرۂ نور میں نہیں لایا گیا تھا۔ اس کے عزم و ہمّت کی کہانی کبھی دہرائی نہیں گئی تھی۔ اس کی رگوں میں خوابیدہ تاب و توانائی کو کبھی کریدا نہیں گیا تھا ــــ اور اب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جبکہ ملک کلّی طور پر ہاتھوں سے نکل چکا تھا اور قوم ایک ہاری ہوئی جنگ کے نتیجے میں پس مردگی کے تحت الثریٰ تک پہنچ چکی تھی"[1] یہ عناصر منظرِ عام پر آرہے تھے:

"وطن سے محبت، وطن کے ماضی کی سنہری تصویریں، اس کی تاروں بھری راتیں اور ٹھنڈی ہوائیں، اس کے لہلہاتے ہوئے میدان اور گنگناتے ہوئے دریا، ہر شاعر کے دل میں بسے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی جو صدیوں سے یہاں موجود تھیں، لوگوں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ اور واقعی اس ملک کے باسیوں کو اپنے وطن کی محبت کا یہ احساس پہلی دفعہ اتنی شدت سے ہوا تھا۔"[2]

ان عناصر کا منظرِ عام پر لانا منطقی عمل بھی تھا اور نفسیاتی نکتہ بھی! ہر چیز کھو جانے کے بعد ہی اپنی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔ مرغوب سے مرغوب شے جب تک اپنی گرفت میں ہوتی ہے، اس کی قدر و منزلت کا خیال کہاں پیدا ہوتا ہے، لیکن جب ہی

---

[1] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ، ص ۳۱۴

[2] سرور، آل احمد: دیباچہ انتخاب جدید، ص ۳-۴

شئے دوسروں کے قبضے میں چلی جاتی ہے تو دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی ہے، روح میں تڑپ سی پیدا ہوتی ہے اور رگ و پے میں خلش سرایت کر جاتی ہے۔ کیا یہ ہوک، یہ تڑپ، یہ خلش اس امر کی غماز نہیں کہ گم کردہ شئے کا اصلی و حقیقی وارث اس کے لئے کتنا بے چین ہے۔ اور کیا اس بے چینی کے پس پردہ اسے دوبارہ حاصل کرنے کا جذبہ کار فرما نظر نہیں آتا۔ بقول حالی ؎

عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا

بے نوا کو ہے زیادہ قدر دینار و درم

"تعرف الاشیاء بالاضداد" ہے قول حکیم

دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم

درج بالا استدلال کو پیش نظر رکھ کر جب ہم یہ غور کریں گے کہ اس وقت وطن کی عظمت کے جو گیت گائے گئے، قوم کے تن مردہ میں سعی و عمل کی جو لہر دوڑائی گئی اور اس کے پر شکوہ ماضی کی تصاویر دکھا کر اسے بے چین و مضطرب کیا گیا تو کیا اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ ایک بڑی جنگ لڑنے کے لئے اپنے آپ کو ابھی سے تیار کریں — حقیقت تو یہ ہے کہ تعلیمی تحریک کے ذریعے معاشی توانائی کا حصول اور ادبی تحریک کے ذریعے قوم و وطن کی عظمت کا احساس — یہ سب کچھ جنگ آزادی کی ابتدائی تیاریاں تھیں۔ اور آنے والے زمانے نے ثابت کر دیا کہ معاشی طور پر آسودہ حال قوم نے کس طرح بیرونی استبداد کا مقابلہ کیا اور قوم و وطن کے گیت گانے والے یہ شعرا مستقبل کے حریت پسند شاعروں کے لئے کتنے چراغ روشن کر گئے۔

سرسید کی مساعی جمیلہ کے ذکر کے ساتھ یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ان کی ادبی تحریک کی راہ کو انجمن پنجاب نے خاصا ہموار کر دیا تھا۔ محمد حسین آزاد (م: ۱۹۱۰ء) لٹ لٹا کر اور پریشانیاں اٹھا کر ۱۸۶۲ء میں

لاہور پہنچے تھے[1]۔ وہاں انہوں نے ایک علمی و ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی[2] جس کا مقصد عروس شاعری کو تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانۂ موجودہ کی روشنی میں لانا تھا[3]۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تغیّر محض اس بنا پر محسوس کیا گیا تھا کہ انگریزی کے درآمدہ ادب نے آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں اور آزاد کو ملکی ادب کی جملہ روایات اس قدر فرسودہ نظر آ رہی تھیں کہ وہ ان سب کو ملیامیٹ کر دینا چاہتے تھے۔ اگر ان کا خیال ایسا ہوتا تو آبِ حیات" کے اختتام پر شعرائے اردو کو یوں خراج عقیدت پیش نہ کرتے:

"اجسام خاکی کی پرستش کرنے والے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم گئے
اور مشاعرے ہو چکے۔ نہیں نہیں۔ تمہاری تصنیفیں،
تالیفیں، حکایتیں اور روایتیں جب تک موجود ہیں تم
آپ موجود ہو۔ تمہارے فخر کی دستاریں ایسے تحسین و
آفریں کے پھولوں کے تاجدار ہیں جو ہمیشہ لہلہاتے رہیں
گے اور گلے میں ان سدا بہار پھولوں کے ہار ہیں جن تک
کبھی خزاں کا ہاتھ نہ پہنچے گا۔"[4]

کیا مولوی محمد حسین آزاد ان سدا بہار پھولوں کو بدیسی ادب کی قربان گاہ پر نذر خزاں کر دینا چاہتے تھے ـــــ محض اس بنا پر کہ وہ میجر فلر اور کرنل ہالرائڈ کے ماتحت تھے؟ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اس حسّاس ادیب و شاعر نے اپنی نوجوانی کا زمانہ

---

[1] سروری، عبدالقادر: جدید اردو شاعری، ص ۸۱
[2] ایضاً، نیز حسین، سید احتشام: اردو نظم کا تاریخی و فنی ارتقا، مطبوعہ نگار لکھنؤ
اصناف سخن نمبر، جنوری فروری ۱۹۵۷ء، ص ۱۳۴
نیز سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص ۴۰۸
[3] سکسینہ، رام بابو: ایضاً، ص ۴۱۹
[4] آزاد، محمد حسین: آبِ حیات، ص ۵۳۸

شفیق باپ مولوی محمد باقر کی سرپرستی میں گزارا تھا جنہوں نے اپنے "دہلی اردو اخبار" کو جنگ آزادی سے متعلق خبروں کی اشاعت کے لئے وقف کر دیا تھا۔[1] کیا نوخیز شاعر آزاد کی طویل نظم اسی اخبار کے ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کے شمارے[2] میں شائع نہیں ہوئی تھی جس میں انگریزوں کے متعلق یہ بد دعا کی گئی تھی ؎

حکّام نصاریٰ کا بہ دین و دانش و بینش
مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یکبار[3]

یہ وہی محمد حسین آزاد ہیں جن کے والد کو انگریزوں نے نام نہاد بغاوت کے جرم میں گولی کا نشانہ بنایا تھا[4] اور یہ بہ ایّام جوانی دیدۂ گریاں اور قلب تپاں لئے ہوئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے تھے۔ اور جب لاہور کے محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ انگریز برعظیم کے علم و ادب کو واحدیت کا رنگ دینا چاہتے ہیں[5]۔ مگر کیا نے حکمراں کی اس پالیسی کا اظہار کرتے ہوئے آزاد قوم کی ناگفتہ بہ حالت پر صدائے احتجاج نہیں بلند کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے "آب حیات" کے تیسرے دور کے خاتمے پر آزاد کے دل سے نکلی ہوئی آہ و فغاں:

---

[1] صدیقی عتیق: ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۷۴ – ۳۸۱

[2] ایضاً، ص ۳۸۲ – ۳۸۳

[3] ایضاً

[4] واقعہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قادری حامد حسن: داستان تاریخ اردو، ص ۴۱۲ و ما بعدہٗ

[5] آج تاریخ اور ادب کا کون طالب علم یہ نہیں جانتا کہ ایسا کرنے میں انگریزوں کا اپنا مقصد پیش نظر تھا۔ وہ اپنے ادبی رنگ میں ہمیں رنگ کر اپنا ہم خیال و ہم نوا بنانا چاہ رہے تھے۔ اگر برطانوی حکمرانوں کو اردو ادب کی ترقی کا ایسا ہی شوق تھا تو میکالے مشرق کے تمام سرمایۂ کتب پر انگریزی زبان میں لکھی ہوئی ایک کتاب کو فوقیت نہ دیتا اور ان کے متعلق یہ حکم نہ لگاتا کہ وہ جس کاغذ پر چھپی ہوئی ہیں وہ اگر کورا ہوتا تو ان کلاسیکی کتابوں سے زیادہ قیمتی ہوتا۔ میکالے نے ہماری ادبی میراث کی قدر و قیمت کو زائل کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انگریزی ادب کی برتری قائم ہو اور ذہنی غلامی کا سلسلہ دراز ہو۔ تفصیل کے لئے: لیز ڈبلیو این: Indian Musalmans۔ ص ۴۸ و ما بعدہٗ

"اسی کو آج اہلِ فرنگ ڈھونڈتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شئے
کی اصلی حالت دکھائی چاہیے۔ مگر حالت کون دکھائے کہ
اپنی حالت بگڑی ہوئی ہے ؎

دل شکستوں کا سخن ہووے نہ کیونکر نادرست
ساز بگڑے ہے تو نکلے ہے صدا بگڑی ہوئی" [۱]

وہ آزاد جو "مجتہدین کے خاندان سے تھے" [۲]، جنہوں نے اپنے والد کے دوش بدوش جنگ آزادی میں حصّہ لیا تھا، وہ یکلخت اپنی قوم، اپنی روایت، اپنے ادب سے قطع تعلق نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بدلے ہوئے ماحول میں شاعری سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو سرسید تعلیم سے لے رہے تھے۔ دونوں کا منشا ایک تھا۔ دونوں کی منزل ایک تھی۔ دونوں ہی قوم کے ہمدرد تھے۔ دونوں انقلاب چاہتے تھے۔ سرسید نے اس کے لئے تعلیمی تحریک کا سہارا لیا اور آزاد نے انجمن پنجاب کا!۔ دونوں اپنی سہاروں کے توسط سے اصلاح چاہتے تھے کہ حالات کا یہی تقاضا تھا۔ بقول سید احتشام حسین:

"غدر میں جو لوگ، چونکے انہوں نے اس بڑے واقعے کو نئی زندگی
کا نقطۂ آغاز بنا لیا اور اس کے بعد سے ہمارے سامنے بہت
سی نئی تحریکیں آگئیں۔ چونکہ ظاہری اور مادی طور پر
ہندوستان کو شکست ہوئی تھی، اسلحے چھن گئے تھے، غیر
ملکی حکومت کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی، اس لئے ایک طرح
کی مایوس کن شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہو گئی اور نتیجہ
کے طور پر اصلاح پسندی کا دور شروع ہوا جس نے شاعری

---

[۱] آزاد، محمد حسین: آبِ حیات، ص ۱۲۸
[۲] تماری، حامد حسن: داستان تاریخ اردو، ص ۴۱۲

اور ادب کو بھی اصلاح پسندی کی شاہراہ پر لگا دیا۔"[1]

اس اصلاح پسندی کے نتیجے میں قومی و وطنی شاعری کے جو نمونے سامنے آئے انہوں نے جنگِ آزادی کے لئے پوری قوم کو از سرِ نو تیار کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب اور بیسویں صدی کی سیاسی تحریک کے درمیان کی یہ عبوری شاعری ہمارے موضوع سے خارج نہیں کی جا سکتی۔ اس نے ملک و ملت کو عظمت کو اجاگر کر کے سیاسی شعور کا ڈول ڈالا ہے اور آزادی کے جذبے کو فروغ دیا ہے۔ ہم سب یہ بخوبی جانتے ہیں کہ سیاست ملک و ملت کے دائرے میں ہی گھومتی ہے اور آزادی انہی دو چیزوں سے عبارت ہے۔ آئیے اب دیکھیں کہ اس عبوری دور میں ہمارے کون کون سے شعرا کس کس انداز میں قوم کے نصیبِ خفتہ کو جگانے کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔

محمد حسین آزاد کو جس طرح "نظم گوئی اور نئے تصورِ ادب کو پھیلانے میں اولیت حاصل ہے"[2]، اسی طرح اردو میں قومی و وطنی منظومات کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ جیسا کہ ہم ابھی ابھی ذکر کر چکے ہیں، وہ جنگِ آزادی سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دل میں وطن اور قوم دونوں کی محبت کارفرما تھی۔ وہ نئے حالات سے سمجھوتہ تو کر لیتے ہیں لیکن جذبۂ قومیت کو فنا نہیں کرتے۔ انجمن پنجاب کی بنیاد ڈال کر اور "جدید شاعری کا سنگ بنیاد رکھ کر"[3] وہ ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جس پر چل کر قوم کے شعور و ادراک کو بیدار کیا جا سکے۔ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اپنے انقلاب انگیز خیالات کے اظہار کے لئے "شاعری کا نیا ڈھنگ زیادہ تر مغرب سے

---

[1] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۱۷۸

[2] ایضاً: اردو نظم کا تاریخی و فنی ارتقا، مطبوعہ نگار لکھنؤ، اصناف سخن نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۳۵

[3] سروری، عبدالقادر: جدید اردو شاعری، ص ۷۷

مانگا تھا"[۱] لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے کہ نئی ہیئت نے اسالیب اور نئے طرزِ سخن کے پس پردہ جو عوامل آزاد کے یہاں کام کر رہے تھے، ان کا تمام تر مقصد قوم کو بیدار و ہوشیار کرنا تھا کہ اس کے بغیر زندگی کی دوڑ میں کامرانی بعید از قیاس تھی۔ کلیم الدین احمد آزاد کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے محض اسلوب و ہیئت کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں اور اسے "ماحول کے اثرات سے بھی بیگانہ"[۲] قرار دیتے ہیں۔ انہیں "نظمِ آزاد" کے پس منظر میں شاعر آزاد کا جذبۂ صادق نظر نہیں آیا اور وہ یہ حکم صادر کرنے پر مجبور ہو گئے کہ "شاعر جو مجدد ہو جو ایک نئے دور کی بنیاد قائم کر سکے، آزاد ایسے شاعر نہ تھے"[۳] ناظرین! ہم بھی اس امر کا جائزہ لے لیں کہ آزاد جو مجتہد باپ کے بیٹے تھے، جو مجتہدین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور جو خود بھی مجتہد تھے، قومی و ملی شاعری کو فروغ دینے اور مردہ قوم میں زندگی کی رمق پیدا کرنے کے سلسلے میں کسی مجدد کا رول ادا کر رہے ہیں کہ نہیں؟

ایک تھکی ہاری محکوم و پژمردہ قوم کی یہ نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ "پدرم سلطان بود" کی تخیلاتی دنیا میں طمانیت قلبی تلاش کرتی ہے۔ یہ حصار اپنی بے پناہ دلکشی اور پُرفریبی کے باعث کچھ ایسا مضبوط ہوتا ہے کہ قوم ایک دو دن تو کیا سالہا سال اسی کوئے جاناں میں طواف کئے چلی جاتی ہے۔ یہی حال سن ستاون کے ناکام انقلاب کے بعد مسلمانوں کا بھی تھا۔ یہ ذہنی کیفیت مریضانہ مزاج کا مظہر تھی۔ اس کا علاج لازمی تھا ورنہ حصولِ آزادی تو درکنار، دال روٹی کے بھی لالے پڑ جاتے ــــ اور پھر یہ

---

[۱] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۱۸۵
[۲] احمد، کلیم الدین: اردو شاعری پر اک نظر، حصہ دوم، ص ۱۸
[۳] ایضاً، ص ۲۸

معاشی بدحالی قومیت کا سارا شیرازہ ہی منتشر کر دیتی۔

یہ مولوی محمد حسین آزاد تھے جنہوں نے قوم کے گرد تنا ہوا روح پرور تخیلات کا جالا صاف کیا اور اسے یہ بتایا کہ زندگی کی بقا، قومیت کے فروغ اور وقار و سربلندی کے حصول کے لئے اپنا عملؒ درکار ہے ؂

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا
نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادہ سے مطلب نہ خانداں سے غرض
یہاں تو نام سے کچھ ہی نہ ہی نشاں سے غرض
تمہارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں
گھرانے اچھے گھر اچھے تمام اچھے ہیں

آزاد ہم وطنوں کو صرف عمل کا ہی احساس نہیں دلاتے ہیں، وہ کم ہمتی کے زہر کا سدباب بھی کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے بغیر عملی اقدام ناممکن تھا ؂

جہاں کی دولت و حشمت کا اب خیال نہیں
امیر ہو کہ فقیر اس سے کچھ سوال نہیں
کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے
بزرگ صاحب زر تھے تو لے کے زر بیٹھے
یہاں تو مایہ ہمت میں جو زیادہ ہے
بزرگ امیر تھے اور خود امیرزادہ ہے

آپ نے محسوس کیا، آزاد تخیلاتی حصار کو کس طرح توڑتے ہوئے ہمت و عمل کی قدر و

لہ آگے چل کر اقبال نے بھی اسی موضوع کو دہرایا ہے، خصوصاً اس شعر میں ؂
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اہمیت کو واضح کررہے ہیں۔

آزاد اپنی نظموں کے ذریعے قوم میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنے کی بھی مسلسل کوششیں کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی طویل مثنوی "حبِ وطن" اس کی نمایاں مثال ہے۔ یہ نظم نہ صرف قومی موضوع کے لحاظ سے اہم ہے بلکہ نفسیاتی، تاریخی حتّٰی کہ سیاسی عناصر کی آمیزش کی بدولت ایک یادگار چیز بن گئی ہے۔

حبِ وطن کا جو تصور اس زمانے میں عام تھا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے آزاد یکلخت اس کی نفی کر دیتے ہیں ؎

حبِ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے
نکلے جو گل تو خاک ہو غربت کے داغ سے

حبِ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ دید
آرام جان و تن کو جو سمجھیں گھروں میں عید

حبِ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ ہوش
یادِ وطن میں ہووے گجے جوش و گہ خروش

حبِ وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں
بچوں کے منہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں

اس طرز کی حب الوطنی کو وہ پرخلوص دوستی پر محمول تصور نہیں کرتے ؎

اے دوست یہ تو دوستیٔ سنگ و خشت ہے
یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

بلکہ وہ اہلِ وطن کو حب الوطنی کے صحیح جذبے، صحیح حقائق اور صحیح عوامل سے آگاہ کرتے ہیں ؎

رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو

اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو

ہر حال میں رہیں اسے اہلِ وطن عزیز

اور ہو ویں نیک و بد روشِ جان و تن عزیز

الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم

اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہم درد ہوں بہم

محمد حسین آزاد حکومتِ برطانیہ کے ملازم تھے۔ ان کی قائم کردہ انجمن کا سرپرست ایک انگریز کرنل ہالرائڈ تھا[1]۔ اس کے باوجود انہوں نے اسی مذکورہ مثنوی میں فرخ سیر کی علالت کا حال بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح ایک مسیح دم نے اس جاں بلب بادشاہ کا علاج کیا کہ اسے "شفا ہو گئی"، اور جب انعام و اکرام دینے کا وقت آیا تو اس انگریز معالج نے نہ تو لعل و گہر پر نظر ڈالی نہ ہی "مال و زر کی ہوس کی" بلکہ اپنی اس آرزو کا اظہار کیا ؎

کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو

جس سے مرا تمام وطن شاد کام ہو

تھوڑی زمیں نواحیٔ دریا کنار میں

مجھ کو عطا ہو مملکتِ شہر یار میں

تا اس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں

اور ان میں تاجران ذو الامتیاز آئیں

کچھ ان پہ ہووے راہ نہ بیم و زوال کو

آرام سے اتاریں یہاں اپنے مال کو

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۴۰۸

اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دور سے
محصول سب معاف ہو اس کا حضور سے

کیا اس تاریخی واقعہ کے دہرانے سے آزاد کا مقصد محض یہی تھا کہ وہ انگریز معالج کے جذبۂ حب الوطنی کو دائرہ نور میں لے آئیں؟ ـــ کیا ہماری تاریخ کے اس فیصلہ کن موڑ کو ایسے وقت میں اجاگر کرنے سے جبکہ انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، شاعر کا یہ بتلانا مقصود نہیں کہ برطانوی قوم نے شاہ سخاوت مآب" فرخ سیر کے "بحر کرم" سے اپنے "دامن امید" کو بھرنے کے لئے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کی تھی ع

کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی

کیا آزاد اہل وطن کو یہ باور کرانا نہیں چاہتے کہ اس طرح موقع سے فائدہ اٹھا کر سفید فام قوم نہ صرف تھوڑی سی زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی، بلکہ محصول معاف تجارت کا پروانہ بھی اسے مل گیا۔ اور کیا شہید وطن مولوی محمد باقر کے بیٹے آزاد اس طرز گداگری کی طرف اشارہ کر کے قوم کو انگریزوں کی چاپلوسیوں، ان کی حکمت عملی اور طریقۂ حکمرانی سے آگاہ نہیں کر رہے ہیں؟ ـــ اور کیا وہ برعظیم کی تاریخ پر پڑے ہوئے ماہ و سال کے پردے کو یہ کہہ کر برملا چاک نہیں کر رہے ہیں ؎

پہلا علاج گرچہ بہت کارگر پڑا
یہ نسخہ لیکن اس سے سوا پر اثر پڑا

برٹش انڈیا کمپنی کے کارندوں نے فرخ سیر کی علالت کو موقع غنیمت جان کر ڈاکٹر ہملٹن کو دہلی بھیجا تھا کہ وہ نئے طریقۂ علاج سے بادشاہ کو رو بہ صحت کر دے[1]۔ اور اس کام کے عوض "تجارت کا پروانہ" حاصل کرنے کی جو مجوزہ اسکیم

---

[1] ملک، عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، ص ۲۱

تھی، اسے آزاد موقع و محل کے پیش نظر کھل کر بیان تو نہ کر سکے، مگر اتنا کہتے ہوئے کہ "یہ نسخہ لیکن اس سے سوا پُر اثر پڑا" ــــ یہ حقیقت طشت از بام کر ہی دی کہ ؎

دامن میں اک عطائے خداداد پڑ گئی
اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑ گئی

ہم یہاں یہ تسلیم کرنے میں بخل نہیں کریں گے کہ اس دور کے کسی شاعر نے برعظیم میں انگریزی سلطنت کے قیام کے ان اسباب و عوامل پر اس طرح کھل کر روشنی نہیں ڈالی ہے جس طرح آزاد نے ڈالی ہے۔ گویا تاریخی پہلو کو اجاگر کرنے کا یہ اعزاز بھی جدید اردو شاعری کے معمار کو ہی حاصل رہا ہے۔

آزاد نے جہاں مردہ قوم میں عزم و ہمّت کی جوت جگائی ہے، وہاں اسے آگے بڑھانے اور شاہراہِ زندگی پر رواں دواں رکھنے کے لئے ترانے بھی گائے ہیں۔ ذرا سنئے اور محسوس کیجئے کہ اس میں کیسی کڑاک، کیسی گمک، کیسا ولولہ اور کیا جوش پنہاں ہے ؎

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمّت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

یارو چلو چلو، نہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدانِ عزم و حزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤ گے اگر کروگے مار امار تم
چلّا رہی ہے ہمّتِ مرداں چلے چلو

افرادِ قوم کو "مری جان" کہہ کر پچکارنے اور خود سے قریب تر کرنے والے آزاد چپکے سے ان کے کانوں میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ آئیے ذرا ہم بھی سن لیں ؎

ہمت کہ شہسوار جو گھوڑے اٹھائیں گے
دشمن ملک بھی ہوں گے تو سر کو جھکائیں گے

آئینہ دل کا گردِ سفر سے اجال دو
پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو

عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
دو رخ کو آب فخر سے رنگ بہار تم

قسمت کہ یہ نوشتے ہیں جو نہ مٹ سکے
وہ گونجا طبل فتح کہ میدان لے لئے

آخر الذکر شعر میں آزاد نے جو پیش گوئی کی تھی وہ کتنی سچی ثابت ہوئی، اس کا اندازہ اسی سے لگا لیجیے کہ شہر لاہور[1] میں جہاں انہوں نے عزم و ہمت کے گیت گائے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو برعظیم کے مسلم زعما قسمت کے نوشتے کو مٹانے کے لئے یکجا ہوئے اور بالآخر فتح و کامرانی کا طبل فضائے دہر میں گونج ہی اٹھا۔

آزاد کے ہم عصر و ہم جلیس مولوی الطاف حسین حالی (م: ۱۹۱۴ء) جوار دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ناکام جنگ آزادی کے اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تباہی و بربادی کے مناظر ان کی دیکھی بھالی حسین و پر رونق دلی کی جو کیفیت پیش کر رہے تھے، اس سے وہ بے حد مغموم و دل گرفتہ نظر آتے ہیں ؎

---

[1] یہاں یہ لفظ لاہور کی تخیل شاعرہ کی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے۔ اس جگہ موقع ہے کہ مولوی عبد الحق کے اٹھائے ہوئے اس مسئلے پر بحث کی جائے کہ آزاد حالی سے پرخاش رکھتے تھے۔ توضیح کے لئے ملاحظہ ہو "چند ہم عصر"، ص ۱۷۶ - ۱۷۷ (م۔ر)

تذکرۂ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

حالی گوہرِ یکتا کے اس مدفن کو چھوڑ کر بہ سلسلۂ روزگار لاہور پہنچے[۱] اور وہیں انجمن پنجاب کے تحت رونما ہونے والی جدید شاعری سے متاثر ہوئے تھے[۲]۔ بادی النظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آزاد کی ادبی تحریک کے حامی و مقلد تھے۔ نقادوں کا یہ کہنا کہ حالی نے جو تغیر اردو شاعری میں لایا ہے وہ سراسر انگریزی کی رہین منت ہے[۳] حقیقت سے انحراف کے سوا کچھ نہیں۔ وہ انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا نہ ہو سکا[۴]۔ وہ خود بھی اس بات کا اعتراف یوں کر رہے ہیں:

"مجھے مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا

---

[۱] سروری، عبدالقادر: جدید اردو شاعری، ص ۹۲
[۲] سید احتشام حسین لکھتے ہیں: خود حالی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اس قسم کی نظم نگاری کی جانب اپنے قیام لاہور کے زمانے میں انجمن پنجاب کی تحریک پر راغب ہوئے۔
ملاحظہ ہو نگار، لکھنؤ، اصناف سخن نمبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۳۶
[۳] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۱۶۱
سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۴۰۷ و ۴۰۸
عبدالحی، حکیم: گل رعنا، ص ۴۷۵
[۴] عبدالحق: چند ہم عصر، ص ۱۸۰

پورا پورا تتبع ایک ایسی نا مکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغہ اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے ترک کرنے کا الزام عائد ہو۔"[1]

یہاں یہ بات سوچنے کی ہے کہ وہی حالی جو دلی کی ویرانی و بربادی کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں، یک بیک انقلابی شاعری کے طرفدار کیوں ہو جاتے ہیں جبکہ وہ اس امر کا اعتراف بھی کر رہے ہیں کہ ان کی شاعری انگریزی کا تتبع نہیں اور قدیم طریقے ترک بھی نہیں کئے گئے ہیں ــ یہ جواز کہ ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے توسط سے ان میں اتنا عظیم انقلاب رونما ہوا[2] غیر منطقی ہے۔ ہم کھلے دل سے یہ کیوں نہیں اعتراف کرتے ہیں کہ قوم کے نکبت و ادبار نے انہیں شاعری کے ذریعے انقلاب برپا کرنے پر مجبور کیا۔ ہم یہ کیوں نہیں محسوس کرتے ہیں کہ حالی بھی اسی نہج پر سوچنے لگے تھے جس پر آزاد سوچ رہے تھے۔ حالی کا مقصد اردو شاعری کو انگریزی ادب کا جامہ

---

[1] حالیؔ الطاف حسین: دیباچہ مجموعہ نظم حالیؔ ص ۲

[2] اس کی بنیاد حالی کے اس جملے پر رکھی گئی ہے کہ "انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نا معلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی" ــ لفظ مناسبت سے یہ کیوں کر باور کر لیا گیا کہ انہوں نے انگریزی شاعری کا تتبع کیا ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھا گیا کہ مشرقی اور فارسی لٹریچر سے حالی کی مراد حسن و عاشقی کے مضامین ہیں جن کی اس زوال پذیر معاشرے میں چنداں ضرورت نہیں تھی۔

پہنانا نہیں تھا بلکہ اس سے اصلاحی مقاصد بروئے کار لانے تھے' بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

"حالی نے یہ نظمیں ایک بدلتے ہوئے ماحول کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ایک مخصوص اصلاحی تحریک کے زیر اثر لکھی ہیں"۔[1]

اُس بدلے ہوئے سیاسی ماحول میں اصلاحی تحریک انگریزی ادب اور مغرب کلچر کی پیروی کی متقاضی نہ تھی بلکہ قوم کو خواب غفلت سے چونکانے کی طلب گار تھی۔

مولوی نذیر احمد جو اردو ادب میں ایک مجتہد کا مقام رکھتے ہیں' حالی کے مسدس پر جس رائے کا اظہار کرتے ہیں' وہ ہماری نظر میں ان کی مجموعی شاعری پر صادق آتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

"میں نہیں سمجھتا کہ مولوی الطاف حسین نے مسدس اس غرض سے لکھا تھا کہ ایشیائی شاعری میں ایک طرز جدید داخل کر دیں بلکہ ان کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوتی ہوئی قوم جاگے اور دیکھے کہ تباہی کا سیلاب ان کے سروں پر آ پہنچا ہے"۔[2]

آپ نے دیکھا مولوی نذیر احمد حالی کی شاعری کے مقصد و منتہا کو کتنی صداقت' کتنی دیانت داری اور کتنے خلوص سے پیش کر رہے ہیں۔ وہ جس ماحول میں یہ رائے دے

---

[1] بریلوی' ڈاکٹر عبادت: روایت کی اہمیت' ص ۱۸۳

[2] منقول قادری' حامد حسن: داستان تاریخ اردو' ص ۵۶۱

رہے تھے اس میں یہ بات بعید از قیاس نہ تھی اگر وہ حالی کی شاعری کو انگریزی کا چربہ قرار دے دیتے۔ برطانوی حکمرانوں کو خوش رکھنے اور اپنی متاثر کرنے کے لئے ایسا ہی کہا جا رہا تھا، اور مرعوب و محکوم افراد کی نفسیاتی کیفیت بھی یہی کچھ تھی۔

آج سوا سو سال کے فاصلے سے جب ہم اس دور، اس ماحول اور اس منظر کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ اقرار کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا کہ انقلاب عظیم کے نتیجے میں حالی کا ذہن خود بھی انقلاب ہو گیا تھا[1] اور جب ذہن میں انقلاب رونما ہوتا ہے تو انسانی حرکات و سکنات، افکار و خیالات اور تحریر و تقریر سبھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں ۔۔۔ پھر نہ چربے کی ضرورت پڑتی ہے نہ تتبع کی!۔

ان باتوں کے اظہار سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ برعظیم کی شکست و ریخت نے حالی جیسے نیک سیرت اور فرشتہ صفت انسان کو بھی اس امر پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شاعری کے ذریعے قوم میں انقلاب برپا کریں اور اس کے لئے انہیں "ان شاعروں سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی تھی"[2] چنانچہ انہوں نے اپنی نظم "نشاط امید" سے "ہندوستان کی عام زندگی پر عموماً اور مسلمانوں کی زندگی پر خصوصاً ناامیدی اور یاس کے چھائے ہوئے بادل کو"[3] چھانٹنے کی بروقت کوشش کی تھی۔ جب وہ یاس و حرماں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت کو پیش کرتے ہیں تو ہمیں قوم کے ایک نفسیاتی معالج سے کم نظر نہیں آتے۔ موجودہ نفسیاتی طریقۂ علاج میں پہلے مریض کی جملہ کیفیات کو دائرۂ

---

[1] واضح رہے کہ ان پر انقلاب کی پہلی چھاپ شیفتہ کی صحبت میں پڑ چکی تھی۔

[2] سروری، عبدالقادر: جدید اردو شاعری، ص ۹۳

[3] بریلوی، ڈاکٹر عبادت: روایت کی اہمیت، ص ۱۹۴

نور میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالی بھی یہی کچھ کرتے ہیں ؎

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے — حوصلے کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا — اڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا

کیفیتِ قلبی کے اظہار کے بعد جب مریض کا جی ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن و دل سے بوجھ اتر جاتا ہے تو حالی ایک کامیاب ماہرِ نفسیات کی طرح اسے "نشاطِ امید" کا نسخہ چپکے سے تھما دیتے ہیں ؎

کان میں پہنچی تری آہٹ جونہی — رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی — ہو گئی کافور سب افسردگی
تجھ میں چھپا راحتِ جاں کا ہے بھید — چھوڑ تو حالی کا نہ ساتھ اے امید

لاہور کے مذکورہ مشاعرے میں پڑھی جانے والی "حبِ وطن" ایک ایسی فکر انگیز نظم ہے جس کے پس منظر میں سیاسی بے چینی صاف جھلک رہی ہے۔ حالی ایک محتسب کی مانند وطن سے بھی، اہلِ وطن سے اس تغیر و تبدل پر باز پرس کر رہے ہیں ؎

اے وطن اے مرے بہشتِ بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد — نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے — قوم کا حالِ بد نہ دیکھ سکے

حالی محض محتسب ہی نہ تھے۔ ایک ہمدرد، ایک مخلص اور ایک بہی خواہ بھی تھے۔ اور جب احتساب و ہمدردی کا امتزاج ہو تو ڈانٹ ڈپٹ میں کتنا پیار رچا ہوا ہوتا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے لگایئے ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو	اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر	نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ملک ہیں اتفاق سے آزاد	شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر	کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی	اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

خطۂ لاہور سے یہی انقلاب رجحانات لئے ہوئے "وہ دہلی ۱۸۷۴ء کے آخر میں پہنچے تھے"[1]۔

جب سرسید نے ان سے دورانِ ملاقات اسلامی عروج و زوال کی داستان کو نظم میں پیش کرنے کی فرمائش کی[2] تو حالی بہ جان و دل راضی ہو گئے۔ یہاں یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سرسید مسلمانوں کی اصلاح کے لئے جس طرح سوچ رہے تھے اور جو کچھ کر رہے تھے حالی اس سے سراسر متفق نظر آتے ہیں۔ یہی ذہنی اتفاق و ہم خیالی ہے جس نے حالی کو سرسید کے قافلے میں شامل ہو جانے پر آمادہ کیا تھا۔ اور اس طرح وہ اس اولوالعزم آدمی اور "قوم کے سچے خیر خواہ" کی آواز باز گشت بن گئے۔

کچھ ہی دیر پہلے ہم محمد حسین آزاد کے تذکرے کے دوران یہ کہہ آئے ہیں کہ جب قوم تھک ہار کر بیٹھ جاتی ہے اور اس میں حال کی تلخیوں سے مقابلے کی تاب و توانائی باقی نہیں رہتی تو وہ "پدرم سلطان بود" کے تخیلاتی حصار میں پناہ لیتی ہے — حالی نے آزاد کی طرح براہ راست اس حصار کو توڑنے کا عمل نہیں دہرایا تھا' بلکہ ایک ماہر نفسیات معالج کی طرح قوم کی محبوب و پسندیدہ تصویر اس کے سامنے پیش کر دی تھی۔ وہ اہلِ وطن کو ماضی کی پر شکوہ وادیوں میں لے گئے تھے جہاں عزت بھی تھی اور شہرت بھی'

---

[1] خان' ڈاکٹر غلام مصطفےٰ: حالی کا ذہنی ارتقاء' ص ۴۴

[2] حالی' الطاف حسین: دیباچہ مسدس حالی' ص ۳ وبعدہ

شان بھی تھی اور شوکت بھی، اقتدار بھی تھا اور افتخار بھی، دولت بھی تھی اور ثروت بھی، علم بھی تھا اور ادب بھی! ـ

لئے علم و فن ان سے نصرانیوں نے ۔۔۔ کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفا ہانیوں نے ۔۔۔ کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں ۔۔۔ مہیا کئے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں ۔۔۔ انہیں کر دیا رشک صحن گلستاں

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفا ۔۔۔ دو طرفہ برابر درختوں کا سایہ
نشاں جا بجا میل و فرسنگ کے برپا ۔۔۔ سر رہ کوئیں اور سرائیں مہیا

انہیں کے ہیں سب نے یہ چربے اتارے
اسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے

ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت ان کی ۔۔۔ عیاں ہو بلنسیہ سے قدرت ان کی
بطلیوس کو یاد ہے عظمت ان کی ۔۔۔ ٹپکتی ہے قادس میں ہر حسرت ان کی

....

....

جب تاریخ کے ان رنگین اوراق کو دیکھنے کے بعد قوم کے دل میں ایک ہوک سی اٹھنے لگتی ہے ..... تو پھر حالی علاج شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ماضی سے یکلخت حال کی طرف مڑ جاتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے ۔۔۔ فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے

نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے　　چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم

ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

اس طرح حالی ایک کامیاب و تجربہ کار معالج کی حیثیت سے اپنے "ذہنی مریض" کو اس تخیلاتی حصار سے باہر نکال لاتے ہیں، اور پھر ایک دوست، ایک ہمدرد بن کر سمجھاتے ہیں ؎

تمہیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے　　تمہیں درد کا اپنے درماں کرو گے

تمہیں اپنی منزل کا ساماں کرو گے　　کرو گے تمہیں کچھ اگر یاں کرو گے

چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے

مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

الطاف حسین حالی نے سن ستاون کے بعد قوم کے نصیب خفتہ کو جگانے کے لئے اپنے مسدس سے جو کام لیا ہے، وہ ہماری جدّوجہد آزادی میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ سر سید احمد خاں کی تحریر و تقریر نے دلوں کے مقفل دروازے کو وا کرنے میں جتنا ہمہ گیر کام کیا تھا، مسدس حالی نے اس سے کچھ کم نہیں کیا تھا۔ بقول شیخ محمد اکرام:

"قومی اصلاح کے سلسلے میں مسدس نے جو کام کیا تھا وہ علیگڑھ کالج کے قیام سے کچھ کم نہیں ہے۔"[1]

مسدس حالی کا ایک ایک بند مسلمانان پاک و ہند کے در دل پر دستک دیتا رہا تھا۔ برعظیم کا کون سا شہر کون سا قریہ تھا جہاں حالی کی یہ درد بھری آواز نہ سنی

---

[1] اکرام شیخ محمد: موج کوثر، ص ۱۲۰

گئی ہو۔[1] انگریزوں کی عملداری میں کون ایسا مسلمان تھا جس نے اس "ابالی کھچڑی" کو من و سلویٰ" سمجھ کر حرزِ جاں نہ بنایا ہو۔ "نازک خیالی"، "رنگین بیانی"، "مبالغہ کی چاٹ" اور "تکلف کی چاشنی" سے بے نیاز یہ طویل نظم "عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لئے"[2] لکھی گئی تھی، سو اپنے مقصد میں پوری اتری، بقول رام بابو سکسینہ: "اس نے کاروانِ مسلم کے لئے بانگِ جرس کا کام کیا کہ اٹھیں اور آمادہ کار ہوں"۔[3]

ہماری جنگ آزادی کی شاعری میں مولوی الطاف حسین حالی صرف "نشاط امید" "حبِّ وطن" اور "مد و جزر اسلام" کے رشتے سے ہی جانے پہچانے نہیں جاتے ہیں، اپنے دیگر سیاسی افکار و خیالات کے توسط سے بھی متعارف ہیں۔ جیسا کہ قبل ذکر کیا جا چکا ہے، ناکام انقلاب کے بعد ہندوؤں نے اپنا الگ راستہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ انگریزوں کی طرفداری کر کے دنیاوی منفعت سے بہرہ مند ہو رہے تھے ـــ پھر سیاسی میدان میں بھی ان کا انفرادی جذبہ رنگ لانے لگا تھا۔ ان کی پہلی تحریک اردو کی بجائے ہندی کو مغربی صوبے میں سرکاری زبان تسلیم کرانے کے سلسلے میں تھی۔[4] ان کے اس اقدام نے سرسید کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی"۔[5] ادھر بال گنگادھر تلک ہندو قوم پرستی کی ٹھوس بنیادیں قائم کر رہا تھا،[6] پھر ذبیحہ

---

[1] صاحبِ "گلِ رعنا" لکھتے ہیں: "جس کے (مسدسِ حالی) اشعار ہر شخص کی زبان پر ہیں اور ہر قومی مجلس میں پڑھا جاتا ہے"۔ ص ۴۷۵

[2] حالی، الطاف حسین: دیباچہ مسدسِ حالی، ص ۵

[3] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادبِ اردو، ص ۴۱۰

[4] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ، ص ۳۲۰

[5] حالی، الطاف حسین: حیاتِ جاوید، ص ۱۹۴

[6] قریشی، اشتیاق حسین: ایضاً، ص ۳۲۴

گاندھی کے خلاف شورش بھی سر اٹھا رہی تھی۔[1] گویا سن ستاون کے ناکام انقلاب کے بعد مسلمانوں کو دو مختلف محاذ پر معرکہ آرا ہونا پڑ رہا تھا۔ ایک انگریز کہ انہوں نے آزادی سلب کر لی تھی، دوسرے ہندو کہ وہ ایک بار پھر برعظیم میں اپنے عروج و ارتقا کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان دو طرفہ حملوں سے سرسید اور ان کے ساتھی بے خبر نہ تھے۔

حالی جو اسلامی طرز فکر کی نمائندگی کر رہے تھے،[2] جو عرب کے ترکے اور مسلمانوں کے موروثی حصّے کو سینے سے لگائے ہوئے تھے،[3] کس طرح ہندوؤں کی متذکرہ تحریکات کے دور رس نتائج سے آنکھیں بند رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اشعار میں کھل کر مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کا اظہار کیا ؎

تھی ہماری قوم و ملّت رسم و عادت میں جدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا
بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ
تجھ سے ہم تھے اجنبی اور ہم سے تو نا آشنا
پر گلہ یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ
وہ بھی تو نے ہم سے لے کر کر دیا بالکل گدا
آدمیت کے تھے جوہر جو ہماری ذات میں
خاک میں آخر دیئے اے ہند سب تو نے ملا
(شکوۂ ہند)

---

[1] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ، ص ۳۲۵

[2] سعید، خالد بن: Pakistan, the Formative Phases، ص ۵۰۴

[3] حالی نے مسدس کے دیباچہ میں لکھا ہے: "نظم جو بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے، قوم کے بیدار کرنے کے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔" ص ۴

اپنے آخری دور کی ایک غزل میں تو انہوں نے برملا اعلان کر دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ نظریے کے حامل ہیں۔ ان دونوں کا باہم ملنا ناممکنات میں سے ہے۔ مذکورہ غزل کا ایک ہی شعر اس صداقت کو طشت ازبام کر رہا ہے ؎

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

ہمارے مورخین اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہی ٹھنی ہوئی جنگ برعظیم میں اسلامی مملکت کے قیام کا سبب بنی ہے اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اسی "بگاڑ" کو تقسیم ہند کا جزو لاینفک بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔

حالی کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں کہ وہ انگریزوں سے سخت متنفر نظر آتے ہیں۔ وہ کہیں اہل برطانیہ کی ناانصافیوں پر غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں، کہیں ان کے طرز عمل پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے ہیں اور کہیں ان کے ظلم و ستم پر چیخ اٹھتے ہیں۔ ان دعاوی کے لئے کسی حوالے کی چنداں ضرورت نہیں کہ خود کلام حالی ان کی تصدیق و توثیق کر رہا ہے ؎

پاس نہیں گر اپنا ذرا ہو جان اپنی بھی ان پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود ناانصافیاں اور کہتے ہیں نازاں ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

تدبیر یہ کہی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح

واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو

ناظرین! ۔ ذرا انصاف کیجئے ۔ کیا انگریزی ادب اور کلچر سے متاثر شخص اس نوع کا شعر کہہ سکتا ہے جس میں طرز حکمرانی پر کھل کر چوٹ کی گئی ہے ۔ طنز کی چھپی ہوئی تلخیاں حالی کے درج ذیل اشعار میں بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

پاؤ گے نہ کوئی قاف سے لے تا قاف

حق تلفیوں کے دل میں نہ ہوں جسکے شگاف

گر غور سے سنئے غل ہے یہی چار طرف

انصاف انصاف آہ انصاف انصاف

کہتے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس

یاں غلام آکر کرامت ہے یہ انگلستان کی

ہو چکی قوم مردہ پر جلّاد

ابھی درّے لگائے جاتا ہے

غرض حالی نے کہیں مثنوی کے انداز میں، کہیں مسدس کی شکل میں اور کہیں غزل کے روپ میں مایوس و مضمحل قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور اس میں عزم و ہمت کی جوت جگانے کی جو کوشش کی تھی، وہ دور رس نتائج کی حامل تھی ۔ اس سے جہاں سرسید کی تعلیمی تحریک کو تاب و توانائی ملی تھی، وہاں دوسرے شاعروں کے لئے منزل کا تعین بھی ہو گیا تھا ۔ آل احمد سرور کے الفاظ میں:

"حالی نے زمانے کی رفتار پر چلنا سکھایا تھا ۔ زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں کا احساس دلایا تھا ۔ شاعری کو انسانیت کا علمبردار بنانے کی کوشش کی تھی ۔ ان کی یہ کوشش بار آور ہو رہی تھی۔"[1]

---

[1] سرور، آل احمد: نئے اور پرانے چراغ، ص ۳۴۸

سرسید قوم کی اصلاح کی جو تحریک لے کر اٹھے تھے اس سے حالی کے علاوہ اور بھی متعدد شعرا متاثر نظر آتے ہیں۔ ان میں مولوی نذیر احمد (م: ۱۹۱۲ء) بھی تھے جن کی نثری تخلیقات کا تمام تر مقصد قوم کی تہذیب و اصلاح تھی۔ وہ سرسید کے بڑے گرویدہ تھے اور ان کے قومی کارناموں کے ہمیشہ مدح خواں رہے۔ اس بات کی تصدیق خود نذیر کے درج ذیل اشعار سے ہو رہی ہے ؎

بچایا ڈوبنے سے کشتیٔ دینِ محمدؐ کو

الٰہی نوح کی سی عمر دے سرسید احمد کو

خردمندوں کی صف میں سب موخر تھے وہ اول تھا

غرض اسلامیوں کی فوج کا لیڈر تھا جنرل تھا

اب اس کے بعد لشکر ہے مگر افسر نہیں کوئی

بھٹکتا پھر رہا ہے قافلہ رہبر نہیں کوئی

سرسید کی طرح نذیر احمد بھی یہی چاہتے تھے کہ قوم نئی تعلیم سے فیضیاب ہو کر زندگی کی دوڑ میں سبقت لے جائے۔ وہ موجودہ پستی اور ذلالت کو جہالت کا سبب قرار دیتے ہیں ؎

کھلی آخرش وجۂ پستیٔ حالت جہالت جہالت جہالت جہالت

لہٰذا وہ اس حالتِ پستی کو دور کرنے کے لئے حصولِ علم کا مشورہ دیتے ہیں ؎

حصولِ علم ہی انسان کو انساں بناتا ہے

یہی تو بادشاہ اور کنگ اور سلطاں بناتا ہے

یہی فرماں روا و حاکمِ دوراں بناتا ہے

یہی مفلس کو دولت مند باساماں بناتا ہے

مغرب کی جدید سائنسی تعلیم سے مولوی نذیر احمد بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔

یورپ میں نت نئی ایجادیں ظہور پذیر ہو رہی تھیں۔ ان کے اثرات برِ عظیم میں بھی پھیلتے جا رہے تھے۔ نذیر احمد ان کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا احساسِ کمتری چھپائے نہیں چھپتا۔ لیکن اس اظہار کے پس پردہ قوم کو غیرت دلانے کا جذبہ صاف طور پر جھلک رہا ہے ۔

یہ ریلیں، سٹیمر، کلیں، تار برقی
بھلا ان کو کیا جانیں ہم لوگ شرقی

کوئی روز شاید کہ جاتا ہو خالی
کہ یورپ کے لوگوں کے اذہانِ عالی

نہ کرتے ہوں اک تازہ ایجاد کوئی
پہ تم میں بھی اے قوم ناشاد کوئی

وہی جانور ہیں وہی ہیں صغیریں
مسلماں اور اپنی پرانی لکیریں

سر چشمۂ آبِ حیواں ہیں پیاسے
سبب کیا کہ لڑتے ہیں احمق خدا سے

نذیر احمد مغرب ایجاد و اختراع سے متاثر ہونے میں جو اس درجہ انتہا پسند دکھائی دیتے ہیں، وہ ان کی مغرب پرستی کی قطعاً دلیل نہیں، بلکہ اس رویے میں اصلاح و تہذیب کا قدیم طریقہ کارفرما نظر آتا ہے۔ پرانے مکتبۂ تعلیم کا یہ خاص وصف رہا ہے کہ مبتدی کو سرزنش، زد و کوب، لعن طعن اور سختی جیسے ذرائع سے تعلیم دی جاتی تھی[1]۔ خود نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم اسی نہج پر ہوئی تھی[2] اور انہیں تمام

---

[1] مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی نذیر احمد سے اپنی تعلیم حاصل کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ ہماری زبانی، ص ۶۶ و لبعدہ
[2] ایضاً، ص ۵۵ و لبعدہ

امتیاز تک پہنچنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے[1] اسی لئے ان کے مزاج میں درشتی آگئی تھی، اور یہی درشتی ان کی شاعری میں حلول کر گئی تھی۔ وہ ایک سخت اور جابر قسم کے معلم کی طرح "احمق" اور "جانور" جیسے الفاظ بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے حتیٰ کہ قوم کو خود قوم کے منہ پر برا کہنے سے بھی باز نہیں آتے[2] ـــــ لیکن یہ ذہن نشیں رہے کہ اس طرز تخاطب کے پس پردہ ان کا خلوص، ان کی نیک نیتی اور ان کا جذبۂ ہمدردی پوری طرح اجاگر ہے۔ وہ یورپ کی مصنوعات کا ذکر کر کے قوم کو غیرت تو دلاتے ہیں اور لعن طعن بھی کرتے ہیں، مگر یہ سبق بھی پڑھائے جاتے ہیں ؎

مخلوق ذی شعور ہے تو ہوشیار رہ　　مت مستمند زندگی مستعار رہ
دنیا کا کاروبار کر اور دیندار رہ　　امیدوار رحمت پروردگار رہ
کس نے کہا ہے تجھ سے کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھ
بس ایسی باتیں اپنی طرف سے نہ جوڑ بیٹھ

اگر غور کیا جائے تو نذیر احمد کی نظم "اتمام حجت" کے درج بالا بند میں ایک دنیائے معنی پنہاں ہے۔ قوم کو ذی شعور کا خطاب دے کر اس کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جا رہا ہے، دنیا میں رہ کر کاروبار حیات کو سر انجام دینے کی ہدایت بھی مل رہی ہے، دین و مذہب پر کاربند رہنے کی تلقین بھی شامل ہے اور مایوسی و ناکامی کے احساس کو زائل کرنے کے لئے رحمت خداوندی کی نوید بھی سنائی جا رہی ہے ـــ قوم اس وقت شکست و ریخت کے جس موڑ پر کھڑی تھی، وہاں سے ترقی و کامرانی کی نئی منزل تک اس کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے لئے جن سہاروں کی ضرورت تھی انہیں

---

[1] بیگ، مرزا فرحت اللہ: نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ص ۲۲
[2] کچھ نہ پوچھو آج ہم لیکچر میں کیا کہنے کو ہیں　　قوم کو خود قوم کے منہ پر برا کہنے کو ہیں

مولوی نذیر احمد نے اس بند میں بلا کم وکاست پیش کر دیا ہے۔

نذیر احمد کا مقصد و منشا وہی ہے جو سر سید کا تھا، یعنی ترقی کے جو اسباب مغربی روشنی کی بدولت مہیّا ہو گئے تھے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے لئے اپنے آپ میں طلب اور جدّ و جہد کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

باطمینان اسباب ترقی جمع ہیں سارے

اگر تم کام میں لاؤ طلب کو جہد کو جد کو

مغربی علم و ہنر کے حصول سے نذیر احمد کا یہ مقصد قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اہلِ وطن کی ذہنی و جسمانی غلامی کو اور بھی مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جہاں جدید تعلیم، نئی روشنی، نئی سائنس اور نئے افکار و خیالات سے استفادہ کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں، وہاں آزادی کا احساس بھی دلاتے ہیں اور لفظ "مقیّد" کو فرہنگ سے نکال دینے کا مشورہ بھی دیتے ہیں ؎

اب آزادی نے اپنا سکّہ عالم میں بٹھایا ہے

نکالو مطلقاً فرہنگ سے لفظ مقیّد کو

واضح رہے کہ لفظ مقید سے صرف قدیم و فرسودہ افکار و نظریات کی طرف ہی اشارہ مقصود نہ تھا، جسمانی قید و حراست کی وضاحت بھی مطلوب تھی۔

کسی بھی قوم کے لئے یہ آسان نہیں ہوتا کہ وہ اپنی دیرینہ روش، اپنے قدیم نظریے، اپنی پرانی روایات کو آنِ واحد میں بدل ڈالے۔ لیکن مولوی نذیر احمد تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول میں یہ ضروری سمجھتے تھے کہ قوم میں ذہنی انقلاب رونما ہو، وہ جلد سے جلد زمانے سے ہم آہنگ ہو جائے اور نئے علم و ہنر سے استفادہ کر کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو۔ اپنی یہ بات تسلیم کرانے کے لئے وہ کس قدر بے چین ہیں، اس کا اندازہ درج ذیل شعر سے لگا لیجئے ؎

کسی کی بات بھی مانا کرو ضد کی بھی اک حد ہے

خدارا چھوڑ دو اس جاہلانہ کاوش و کد کو

اور پھر ایک سخت مزاج استاد کی طرح وہ قوم کو نتائج بد سے اس طرح خبردار کرتے ہیں کہ اس میں خفگی بھی ہے برہمی بھی سرزنش بھی ہے اور تنبیہ بھی ؎

اگر اب بھی نہ تم نے قدر و قیمت وقت کی جانی

تو بس پتھر پہ کھدوا رکھنا اس قول موکد کو

کہ مٹ جاؤ گے اور برباد ہو جاؤ گے بالآخر

پکڑ پاؤ گے کیا تم ناتواں اس چودہویں صد کو

سخت مزاج نذیر کی گرج میں جو شفقت[1] پنہاں تھی، اس نے قوم کو وقت کی قدر و قیمت ماننے پر بالآخر مجبور کر دیا اور چودہویں صدی کو اپنی گرفت میں لے کر وہ اس درجہ خوش حال بن گئی کہ اس کا قومی وجود ایک ٹھوس حقیقت کی طرح ابھرنے لگا۔

آزاد و حالی کے ہم عصر مولوی اسمٰعیل میرٹھی (م: ۱۹۱۷ء) یوں تو بچوں کے ادب کے رشتے سے پہچانے جاتے ہیں[2] لیکن علیگڈھ تحریک کے زیر اثر نشو و نما پانے والی قومی شاعری میں ان کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔ وہ سرسید کے عقیدت مندوں میں تھے اور کالج کی امداد بھی کیا کرتے تھے[3]۔ ان کا مطمح نظر بھی وہی ہے جو اس دور کے دوسرے شاعروں کا رہا تھا، یعنی مسلمانوں کو ماضی کی جھلک دکھاتے ہوئے اور حال کی معاشی و معاشرتی بدحالی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے انہیں غیرت دلانا اور جدید علم و فن سے خود کو آراستہ کرنے کی تلقین کرنا ــــ مولوی اسمٰعیل بھی اسی راستے پر چلتے ہوئے دکھائی

---

[1] فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں: "آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ۔ کوئی دور سے سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں" ص ۳۸

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: محمود الرحمٰن: "اردو میں بچوں کا ادب" ص ۱۸۷ و ما بعدہ

[3] سیفی، محمد اسلم: مقدمہ حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی، ص ۸۲

دیتے ہیں جس کی جانب رہنمائی سرسید نے کی تھی۔ وہ قوم سے جس طرح خطاب کرتے ہیں اور اسے موجودہ صورتِ حال میں آگے بڑھنے کا سبق دیتے ہیں وہ سراسر حالی کی آوازِ باز گشت معلوم ہوتی ہے ؎

ہر چند کہ دعویٰ تھا تمھیں سیف و قلم کا
تھا فخر تمھیں نسلِ عرب اور عجم کا
لیکن نہ رہا طرز وہ عادات و شیم کا
سیکھا نہ وطیرہ کوئی اربابِ ہمم کا
ناچار ہر اک قوم نے تم کو لیا دھمکا
بے سعی کسی کا بھی ستارہ نہیں چمکا

تم راہِ طلب میں ہو اگر اب بھی شتاباں
ہو کوکبِ عزت افقِ دہر پہ تاباں

مولوی اسمٰعیل میرٹھی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عزت حاصل کرنے کے لئے تیغ و تبر والی جنگ کی نہیں' علم و فن کے معرکے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ نئے نظریے کی تحصیل میں کامیاب و کامراں ہو جاتے ہیں تو اس طرح انہیں نہ صرف معاشی آسودگی میسر ہوگی بلکہ ملک کی آزادی بھی ممکنہ شئے بن جائے گی۔ ان تمام امور کو وہ اپنی نظم "نیا کارزار" میں اس طرح اجاگر کر رہے ہیں ؎

یہ جنگ نہیں توپ کی یا تیغ و تبر کی
اس جنگ میں کچھ جان کی جوکھوں ہے نہ زر کی
یہ جنگ ہے اخلاق کی اور علم و ہنر کی
یہ جنگ ہے تحصیلِ عمل اور نظر کی
اس جنگ میں آسودگی ہے نوعِ بشر کی

آزادی ہے ملکوں کی تو آبادی ہے گھر کی

یہ جنگ نہیں وضع و مروّت کے منافی
اس جنگ سے مافات کی ممکن ہے تلافی

اس بند کے آخری دو مصرعے تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ مسلمان قدیم روایات کے پرستار ہونے کی وجہ سے اور ساتھ ہی انگریزوں سے دلی بغض رکھنے کی بدولت جدید علم و ہنر سے بہرہ مند ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے خیال میں اس طرح وضع پر بھی زد پڑتی تھی اور مروّت بھی ملیامیٹ ہوتی تھی ـــــ لیکن مولوی اسمٰعیل میرٹھی جو خود بھی قدیم روایات کے پرستار تھے[1]، جدید تعلیم کے حصول کو وضع و مروّت کے منافی قرار نہیں دیتے بلکہ اس پر مصر تھے کہ یہ میدان ضرور سر کیا جائے۔ ان کے خیال کے مطابق یہی وہ واحد ذریعہ تھا جس سے "تلافیِ مافات" ہو سکتی تھی۔ گویا اس طرح اسمٰعیل میرٹھی مغضوب و مقہور مسلمانوں کو نہ صرف حال کو بہتر بنانے کا گر بتا رہے تھے' بلکہ درخشاں مستقبل کی بشارت بھی دے رہے تھے۔ بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو تلافی مافات کی ترکیب میں دنیائے معنی پنہاں ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کی قومی شاعری کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے نئی نسل کو ذلت و تباہی سے بچانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ہمارے شاعروں نے اس بدلتے ہوئے ماحول میں اپنی توجہ مستقبل کے معماروں کی طرف بھی دی ہو ـــــ یہ خیال ظاہر کرنے سے یہ مراد نہیں کہ آزاد و حالی نے بچوں کے لئے نظمیں نہیں لکھیں ـ منشا دراصل یہ ہے کہ اسمٰعیل نے بڑوں اور بوڑھوں کی توجہ ان امور کی جانب مبذول کرائی ہے جن پر آئندہ نسل کی تعمیر و ترقی کا انحصار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے وقت اور ماحول سے کچھ آگے ہی سوچ رہے تھے ـــــ ان جیسے بوڑھوں اور عمر رسیدہ افراد کی زندگی مصائب و

---

[1] مولوی صاحب کو تصوف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدانِ خاص میں تھے۔" سکسینہ' رام بابو: تاریخ ادب اردو' ص ۴۲۴

آلام کا شکار تو ہو ہی چکی تھی اور اس منزل میں ان کی وضع و روش کا بدلنا محال تھا[1]، لیکن انہیں خوف تھا کہ اگر یہی صورت حال رہی تو "نئے پودے دھوپ سے جائیں گے جل"[2]۔ چنانچہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے مدبّر کی حیثیت سے اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

خیر جو گزرا سو گزرا یہ جو ہیں تازہ نہال

فکر ان کی چاہیئے شاید یہی جائیں سنبھل

نئی پود کے سلسلے میں اسمٰعیل جو اس قدر متفکر نظر آتے ہیں اس کا ایک منطقی پہلو اور ایک اہم جواز بھی ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں وہ پہلو اور وہ جواز کیا ہے جس سے قوم کے ذی شعور اور عمر رسیدہ افراد کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔

کبھی وقت فرصت میں سوچا بھی حضرت

کچھ اس درد جانکاہ قومی کا درماں

یہ بچے جو پھرتے ہیں آوارہ جاہل

گھسیٹے ہیں کانٹوں پہ گلہائے خنداں

یہی بننے والے ہیں ارکان قومی

جو ارکان بودے تو ایوان ویراں

ان ہی پر ہے موقوف اعزاز ملّت

بناؤ انہیں جلد زیب دبستاں

ہنر ہائے کسب معیشت سکھاؤ

کہ ان کو ستائیں سگ اور درباں

---

[1] اسمٰعیل: ہمیں پار کرنا ہے لیکن کریں کیا نہ کشتی نہ لنگر نہ خر ہے نہ پالاں
گئے قافلے سب مگر ہم کھڑے ہیں کنارہ پہ انگشت حیرت بدنداں

[2] ایضاً: کھیت میں پیدا ہوں پودے اور نہ سینچو وقت پر
ہے نتیجہ صاف ظاہر دھوپ میں جائیں گے جل

"تمغہ اور دربان" کے استعارے نے انگریزوں کے نظامِ زندگی اور انتظامِ سلطنت دونوں کی بخوبی وضاحت کر دی ہے۔

اسمٰعیل جدید علم و ہنر کی روشنی سے قوم کے نوخیز معماروں کو استفادہ کرنے کی تلقین اس لئے کر رہے تھے کہ وہ معاشی طور پر آسودہ حال ہو جائیں۔ لیکن ان کا مقصد کبھی یہ نہیں رہا کہ یہ لوگ مغربی تہذیب و روایات کا لبادہ اوڑھ لیں۔ واضح رہے کہ اسمٰعیل میرٹھی کو اپنی تہذیب و معاشرت عزیز تھی اور اسلامی اقدار کا پاس و لحاظ تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نئی پود جوان ہو کر "صاحب بہادر" کا طرزِ حیات اپنائے اور اس طرح اپنے قومی تشخص کا گلا گھونٹ دے ۔۔۔ وہ کیا چاہتے تھے، سنیے ؎

جہاں تک بنے اہلِ تقویٰ بناؤ	کہ تقویٰ ہے بیعانۂ باغِ رضواں
جو کوشش کرو تو انہی میں سے پیدا	ابوالفضل و فیضی ہوں اور خانخاناں
یہی شافعی ہوں یہی بوحنیفہ	سکھاؤ اگر شرعِ احکامِ فرقاں
خُمِ صبغۃ اللہ گر ہو میسّر	تو بن جائیں پیرِ لبطام فرقاں

آپ نے دیکھا، مولوی اسمٰعیل نے اس دور میں جبکہ بڑھتے ہوئے مغربی اثرات کے نتیجے میں پوری ملّت "مغرب زدہ" ہو رہی تھی، نئی پود کو بادِ سموم سے بچانے کی کیسی جدّ و جہد کر رہے ہیں ۔۔۔ وہ تقویٰ کے حصول پر بھی زور دے رہے ہیں، نئی نسل کو جہاں علم و دانش میں ابوالفضل، فیضی اور خانخاناں کا پیرو بننے کی تلقین کر رہے ہیں، وہاں قرآن مجید کے احکام سیکھ کر امام شافعی اور امام ابوحنیفہ بننے کی ترغیب بھی دے رہے ہیں ۔۔۔ پھر اس دورِ نقالی میں وہ مغرب کا نہیں "اللہ کا رنگ" اختیار کرنے کی

---

[1] مولوی عبدالحق سرسید کے دور کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں: "انگریزی تعلیم اور انگریزی طرزِ معاشرت کی وجہ سے ہماری قوم میں ایک نیا طبقہ بن گیا تھا جسے نقالوں کا طائفہ کہنا زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ ان میں نقل ہی نقل تھی"۔ ملاحظہ ہو چند ہم عصر، ص ۲۷۵

کی ہدایت کر رہے ہیں تاکہ ابھرنے والی پود کو بایزید بسطامیؒ[1] کا مقام و مرتبہ حاصل ہو۔

مولوی اسمٰعیل یہ سب کچھ صرف اس لئے چاہ رہے تھے کہ قوم کا تشخص، کرداری انفرادیت، مذہب کا رنگ اور روایات و اقدار کی چھاپ برقرار رہے۔ آج علم سیاسیات کا کوئی طالب علم یہ نہیں جانتا کہ آزادی کی بنیاد انہی عناصر پر استوار ہوتی ہے۔ اور اسمٰعیل آزادی کے پودے کو نشو و نما دینے کے لئے درسی کتابوں کے ذریعے چھوٹے چھوٹے بچوں سے نہیں ــــ پوری قوم سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں مخاطب تھے، جس کی صدارت ہماری آزادی کے نامور مجاہد سر آغا خاں کرنے والے تھے[2]۔ اور اسی جلسے میں جب وہ بہ بانگ دہل کہتے ہیں ؎

اٹھو قوم کی آبرو کو بچاؤ

نہ بننے دو ہرگز غلام غلاماں

تو اس کے پس پردہ طنز بھی ہے، تلقین بھی، نئی منزل کی نشان دہی بھی ہے، آئندہ کے لئے لائحہ عمل اختیار کرنے کا اشارہ بھی!۔

قوم کی آبرو کو بچانے اور غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کا عزم رکھنے والے اسمٰعیل میرٹھی قوم کو آنے والے حسین دور کی بشارت بھی دے رہے ہیں، اور یہ کہہ کر حوصلہ بڑھا رہے ہیں کہ رنج و تعب کے ماحول کو جبر و تحمل سے برداشت کر لیا جائے اور منزل کی طرف قدم رواں دواں رہیں، پھر محکوم حق دنیا کا طالب ہو جائے گا ؎

---

[1] سلوک و معرفت میں آپ کے مقام و مرتبے کا اندازہ حضرت جنید بغدادیؒ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے: "آپ ہم میں ایسے ہیں جیسے جبرئیل فرشتوں میں۔ تمام سالکان کی انتہا آپ کی ابتدا ہے"۔ منقول اردو انسائیکلوپیڈیا فیروز سنز، ص ۲۶۷

[2] یہ کانفرنس کا پچیسواں سالانہ اجلاس تھا جو ۱۹۱۱ء میں بمقام دہلی منعقد ہوا۔ اس کے صدر سر آغا خاں منتخب ہوئے تھے مگر بہ مجبوری شرکت نہ کر سکے۔ البتہ ان کا خطبۂ صدارت پڑھ کر سنایا گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سید الطاف علی بریلوی کی مرتب کردہ "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں"، ص ۲۷۸ و بعدہ

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ
بجے گا محبت کا نقارخانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن
چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن
رکے گا نہ عالم ترقی کیئے بن
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

زبان قلم سیف پر ہوگی غالب
دبیں گے نہ طاقت سے پھر حق کے طالب
کہ محکوم حق ہوگا دنیا کا طالب
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں روانی، لطافت، زبان کی سادگی، امنگ اور ابھار کی خاص کیفیتوں کے سبب دل و دماغ دونوں پر اثر انداز ہوتی ہیں[1]، اور محکوم و مضمحل اہلِ وطن کے لئے بانگِ جرس کا کام کرتی رہی ہیں۔

اب ہم قومی و ملّی شاعری کے اہم ستون، شبلی نعمانی (م: ۱۹۱۴ء) کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ایک مورخ اور نقّاد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔ وہ ابتدا میں فارسی اور اردو کے روایتی طرزِ سخن کی طرف مائل تھے[2]، لیکن علیگڈھ تحریک کے زیر اثر آنے کے بعد[3] نہ صرف ان کے ذہن میں انقلاب آیا[4] بلکہ ان کے اندازِ شاعری میں بھی تغیّر رونما ہوا۔

---

[1] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۱۶۳

[2] اکرام، شیخ محمد: یادگارِ شبلی، ص ۵۵

[3] یکم فروری ۱۸۸۲ء کو وہ کالج میں فارسی و عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ منقول شبلی، مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۲۴

[4] ندوی، سلیمان: حیاتِ شبلی، ص ۱۳۳

اپنے علیگڈھ کے دورانِ قیام میں حالی سے براہ راست روشناس ہوئے اور ان کے مدوجزر اسلام کا اِن پر گہرا اثر مرتب ہوا تھا[1]۔ چنانچہ سرسید و حالی کے اجتہاد کا اثر قبول کرتے ہوئے انہوں نے اپنی قوتِ شعر گوئی کو اصلاحِ قوم کے لئے وقف کر دیا۔ شبلی کا موضوع بھی وہی کچھ ہے جو حالی اور اسمٰعیل کا تھا، یعنی مسلمان ایامِ گذشتہ میں کیا تھے اور اب دورِ جدید میں کیا سے کیا ہو گئے۔ کمال و زوال کا یہ موازنہ اگرچہ روایتی بنتا جا رہا تھا، لیکن شبلی کے اندازِ نگارش نے اس میں حد درجہ سوز و گداز پیدا کر دیا۔ اس نوع کی پہلی تخلیق ان کی مثنوی "صبح امید" ہے جس کے متعلق مولانا سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

> "اس وقت تک مثنوی صرف قصّوں کہانیوں کے لئے تھی۔ ابھی تک اس کو قومی مقصد کے لئے کام میں نہیں لایا گیا تھا...... مولانا نے اس راہ میں پہل کی۔"[2]

جہاں تک قومی مقصد کے لئے اس صنفِ سخن کو کام میں لانے کا معاملہ ہے، شبلی نعمانی کو اس سلسلے میں اولیت نہیں دی جا سکتی۔ ہم "تحریکِ جہاد اور اردو شعرا" کے باب میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مولوی خرّم علی بلہوری نے ایک جہادیہ مثنوی لکھی تھی جس میں مجاہدین کا حوصلہ بڑھانے اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لئے جہاد کی فضیلت بیان کی گئی تھی۔ اس مثنوی کی قومی اہمیت کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ یہ لشکر میں جنگ کے وقت پڑھی جاتی تھی۔ پھر اسی قبیل کی مثنوی مومن کی بھی ہے جس میں وہ مسلمانوں کو جہاد میں شرکت کی ترغیب دیتے ہیں۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیرِ نظر باب کے شروع میں ہم آزاد و حالی کی مثنویوں کا ذکر کر چکے ہیں جو قومی مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں اور جنہوں نے قومی مزاج کو یکسر بدل ڈالا، بلکہ شاعری کو نیا

---

[1] ندوی، سلیمان: مولانا شبلی اردو شاعری کے لباس میں، مطبوعہ کلیاتِ شبلی، ص ۱

[2] ایضاً: ص ۸

رنگ و آہنگ عطا کیا تھا۔ لہٰذا مولانا سلیمان ندوی کی محولہ بالا رائے سے اتفاق کرنا تاریخی حقائق کو جھٹلانا ہوگا۔ آئیے اب ہم زیر بحث مثنوی کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ شبلی نعمانی نے قومی شاعری میں کیا رول ادا کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد قوم جس تنزل کا شکار ہوئی تھی اور جس ذہنی پس مردگی اور احساس کمتری کے زیر اثر آئی تھی، اس کے سدباب کے لئے شبلی نے وہی طریقہ اپنایا جو ان کے پیش رو اختیار کر چکے تھے، یعنی پُر شکوہ ماضی کی تصویر دکھائی جائے۔ چنانچہ وہ قوم سے یوں مخاطب ہیں ؎

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام	جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی	جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال	کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گُل کر دیئے تھے چراغ جس نے	قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر	ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیئے تھے	اٹلی کو کنویں جھنکا دیئے تھے

لیکن اب اسلام کا وہ جاہ و جلال، وہ اثر و اقتدار اور وہ پہلی سی حالت و کیفیت برقرار نہیں رہی تھی۔ مولانا شبلی اس حقیقت کو بروئے کار لاتے ہوئے یوں گویا ہیں ؎

جس چشمے سے اک جہاں تھا سیراب	وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پامال ہوا تھا بوستاں کیا؟	آئی تھی بہار پر خزاں کیا؟
پستی نے دبا لیا فلک کو	خورشید ترس گیا چمک کو
جو ابر کبھی برس گیا ہے	اک بوند کو اب ترس گیا ہے
اسلام کی جان پر بنی ہے	دم توڑ رہا ہے جان کنی ہے

برعظیم میں مسلمانوں کے زوال و انحطاط کی منظر کشی ملاحظہ ہو ؎

جس باغ کے برگ و ساز تھے ہم	یعنی کہ چمن طراز تھے ہم
جو دشت تھا سبزہ زار ہم سے	جس باغ پہ تھی بہار ہم سے
جس بزم کے میگسار تھے ہم	جس ملک کے تاجدار تھے ہم
جھونکے جو چلے نئی ہوا کے	آغوش میں آ گیا فنا کے

وہ بزم رہی — نہ جام و ساغر　　یک بار الٹ گیا وہ دفتر
از بسکہ ذلیل و خوار ہیں ہم　　افسانۂ روزگار ہیں ہم
ناچار ہیں خستہ حال ہیں ہم　　عبرت کدۂ زوال ہیں ہم

ماضی و حال کی منظر کشی کے بعد شبلی موجودہ حقائق کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے جو تغیر و تبدل دیکھ رہے تھے، اس سے قوم کو یوں آگاہ کر رہے ہیں ؎

ہیں چرخ کی اب نئی ادائیں　　چلنے لگیں اور ہی ہوائیں
چھیڑے جو گئے نئے فسانے　　نغمہ وہ رہا نہ وہ ترانے
پھونکا ہے فلک نے اور افسوں　　اب رنگ زمانہ ہے دگرگوں
سیارے ہیں اب نئی چمک کے　　وہ ٹھاٹھ بدل گئے فلک کے
اب صورت ملک و دیں نئی ہے　　افلاک نئے زمیں نئی ہے

اس بدلی ہوئی حالت و کیفیت میں قوم کی بقائے حیات اور فلاح و بہبود کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ وہ اس "پیر دیریں" کی آواز پر لبیک کہیں جو نئے راستے کا سراغ لگا چکا تھا۔ چنانچہ شبلی پہلے سر سید سے افراد قوم کو متعارف کراتے ہیں ؎

ماتم تھا یہی — کہ آئی ناگاہ　　اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر　　پہلو میں اثر — بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں　　نشتر سی اتر گئی جگر میں
دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں　　آیا نظر اک پیر دیریں
صورت سے عیاں جلال شاہی　　چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ملک پہ جان دینے والا　　وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

اس کے بعد شبلی اس رہبر قوم کا پیغام اپنے ہم وطنوں تک پہنچاتے ہیں تاکہ اس پر تیزی سے عمل درآمد ہو سکے۔ اس اظہار کے پس پردہ ان کا اپنا خیال بھی جاگزیں ہے کہ اب خواب غفلت سے بیدار ہونے کا وقت آ پہنچا ہے اور نئی سحر سے اپنے آپ کو مزین کرنے کی ساعت آ گئی ہے ؎

آخر کب تک یہ خواب غفلت　　اٹھو تو ذرا نقاب غفلت
تا چند رہو گے مست و سرشار　　اٹھو کہ سحر ہوئی نمودار

سوچو تو ذرا کہ حال کیا ہے — کس خواب میں ہو، خیال کیا ہے
دیکھو تو ذرا یہ حالتِ زار — کیوں قیدِ بلا میں ہو گرفتار
ہو گردِ رہِ ضعف پسیں کیوں — اس بزم میں خوار ہمتیں کیوں
کیوں بار ہو تم دلِ زمیں پر — کیوں برقِ بلا گری زمیں پر
ہر علم و ہنر سے بے خبر ہو — صنعت میں جو تم شکستہ پر ہو
اب وقتِ اخیر ہے خبر لو — جو کچھ کرنا ہے اب بھی کر لو

شبلی اپنی اس مثنوی میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ سرسید کے پیغام کو دور دور پہنچایا جائے۔ وہ اس آواز کے ساتھ اپنی آواز بھی بلند کرتے ہیں جو ان کے نظریئے ان کی فکر اور ان کی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ درد و اثر میں ڈوبی ہوئی یہ صدا اگر ایک طرف سرسید کی آواز بازگشت ہے تو دوسری جانب شبلی کی اپنی انفرادیت کا مظہر بھی ہے۔ آیئے اس عبوری دور کے پانچویں شاعر کے پیام جاں سوز کو بھی سن لیا جائے کہ اس کی آئندہ سیاسی شاعری کی بنیاد اسی پر استوار ہوئی تھی ؎

اے مدعیانِ حبِّ اسلام — حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ — ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
اندازِ عرب اگر ہے خو میں — باقی ہے وہ جوش اگر لہو میں
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ — جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ
کر دو جو گذشتہ کی تلافی — ثابت ہو زمانے پہ کہ اب بھی
گو دورِ فلک ہوا دگرگوں — پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے کچھ اثر ہیں اب بھی — اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے — دن ڈھل بھی گیا تپش وہی ہے
گو خوار ہیں، طرز خو وہی ہے — مرجھا گئے پھول، بو وہی ہے

ناظرین! ـ آپ نے بخوبی محسوس کیا ہوگا کہ شبلی نعمانی سرسید کی اصلاحی تحریک کے دھارے کے ساتھ بہنے کے باوجود اپنی شانِ انفرادیت بحال رکھتے ہیں۔ وہ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کی توجہ یورپی مراکز کی طرف نہیں، خطۂ عرب کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ وہ انگریزی تہذیب کا نہیں، عربوں کی تہذیب و

روایات کا واسطہ دے کر انہیں ابھرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ شبلی قوم کے تن مردہ میں جدید کلچر کا خون دوڑانے کی بجائے اسلاف کا لہو گرم رکھنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔

اسلامی روایات کی پاسداری کا یہی وہ رجحان ہے جو شبلی کے اس مسدس میں بھی اظہار کا ذریعہ بنا ہے جو علیگڈھ کے قومی تھیٹر میں پڑھا گیا تھا۔ یہاں وہ اس یورپ پر اسلامی پرچم کے لہرانے کا ذکر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے جس کا تتبع ہی علیگڈھ تحریک کا موحد اولی تھا ؎

تیرے حملوں سے دہل جاتا تھا سارا عالم ۔۔۔ تیرے قبضوں میں ترے دولت و اقبال و حشم

جا کے یورپ کے افق پر بھی اڑایا پرچم ۔۔۔ ایشیا کا جو کیا تو نے سر فتح و درہم

کر دیا ذمنیز تاتار کو ابتر تو نے

نیزہ گاڑا تھا جگر گاہ تینز پر تو نے

نئی تعلیم کی بدولت ذہن و دل جس طرح یورپ کی خیرہ کن چمک سے متاثر ہو رہا تھا اور جس کے نتیجے میں اسلاف کے تاریخ ساز کارنامے پس پشت ڈالے جا رہے تھے، شبلی اس سے بے حد دل گرفتہ تھے۔ ان کی جراتِ اظہار کی داد دیجئے کہ وہ علیگڈھ کے مذکورہ بالا تھیٹر میں اس "روشِ جدید" پر اپنے تاسف آمیز خیالات کا یوں ذکر کرتے ہیں ؎

یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے ۔۔۔ ہم نے مانا بھی کہ دل سے بھلا دیں قصے

دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے ۔۔۔ یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے

کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر

یادگاروں کو زمانہ سے مٹا دیں کیوں کر

غالباً یہی وہ احساس تاسف تھا جس نے شبلی کو اسلامی تاریخ کے مرتب و مدون کرنے پر آمادہ کیا اور جو آگے چل کر دار المصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد کا سبب ٹھہرا۔

اپنے ہم عصر شعرا میں شبلی کی آواز سب سے منفرد اور جداگانہ ہے۔ وہ سرسید سے جسمانی طور پر قریب رہ کر بھی ذہنی طور پر ان سے دور نظر آتے ہیں۔ یورپ کی وہ چمک جس سے سرسید اور ان کے رفقا مرعوب و مسحور تھے، شبلی کے لئے بے مایہ چیز تھی ۔۔۔ اس لئے کہ وہ تاریخی حقائق سے آگاہ تھے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مغرب نے اسلامی تہذیب اور روایات سے ہی خوشہ چینی کی تھی۔ اس کا ادب، اس کا علم و ہنر اپنا نہیں مانگے تانگے

کا تھا۔ شبلی کے لئے یہ بڑی حیرت ناک بات تھی کہ جس کاسۂ گدائی میں ان کے آباؤ اجداد کی دی ہوئی بھیک پڑی تھی، اس سے خود اپنے جیب و داماں کی تزئین کریں ۔ یہ احساس ان کی نظموں میں اس وقت بھی اجاگر تھا جب وہ علیگڈھ سے وابستہ تھے اور اس وقت تو اور بھی مستحکم ہوگیا جب اس علمی گہوارے سے علیحدہ ہوگئے۔ دور علیگڈھ کا احساس ملاحظہ ہو ۔

دیکھنا تجھ کو جو یورپ میں ہمارا ہو جلال — پوچھ اسپین سے تھا جلوۂ حمرا کیسا[1]
ذکر آتا ہے ترقی کا تو آنکھوں میں وہیں — صاف پھر جاتا ہے بغداد کا نقشہ کیسا
کچھ فقط تیغ و سناں ہی میں نہ تھے ہم مشہور — ہم نے ہر فن میں دکھایا ید بیضا کیسا
روشنی علم کی پھیلائی تھی پہلے ہم نے — ورنہ چھایا تھا زمانے میں اندھیرا کیسا
اب بھی لندن میں غزالی کی ہے شہرت کیسی — اب بھی جرمن میں ہے بونصر کا چرچا کیسا
روم و اٹلی کے مدرسے میں کئی صدیوں تک — تھا سند فلسفۂ بوعلی سینا کیسا

شبلی نعمانی کو اسلامی اقدار و روایات کا لحاظ، قومی تاب و توانائی کا احساس اور مسلمانوں کی انا و انفرادیت کا خیال اس حد تک تھا کہ وہ کسی بیرونی سہارے کے بغیر ترقی کی منزلیں طے کرنے کا دم خم رکھتے تھے۔ ان خیالات پر مبنی اشعار حریفوں کے لئے ایک کھلا چیلنج سے کم نہ تھے ۔

اپنے ہی ہاتھ میں ہے عقدہ کشائی اپنی — کیا زمانے کا گلہ چرخ کا شکوا کیسا
دیکھنا آپ کھڑے ہوں گے ہم اپنے بل پر — غیر سے چارہ نوازی کا تقاضا کیسا[2]
قوم کی رگ میں ہے اب تک وہی اسلاف کا خون — ہو گئے پژمردہ بھی ہیں یہ گل رعنا کیسا
اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر ہیں پنہاں — اب بھی فتنہ ہے یہ شاہد زیبا کیسا
دیکھنا ذرہ کا چمکے گا ستارہ اک دن — دیکھنا قطرہ یہ بن جاتا ہے دریا کیسا
تم بھی سن لوگے حریفو کبھی انشاء اللہ — قافلہ قوم کا منزل پہ وہ پہنچا کیسا

۱؎ یورپ کی عیسائی ریاستوں کے لحاظ سے یہ لفظ کیسا برمحل استعمال ہوا ہے۔

۲؎ برطانوی حکومت سے مراعات حاصل کرنے اور اس کے سہارے ترقی کرنے کے رجحان پر شدید طنز ہے۔

شبلی نعمانی نے اس عبوری دور میں قومی و ملّی نظمیں کچھ زیادہ نہیں لکھی تھیں، لیکن جو بھی چند ایک ہیں، ان میں بقول مولانا ماہرالقادری "رس ہے، گھلاوٹ ہے، مٹھاس ہے، اور جہاں ضرورت پڑتی ہے طوفان کا جوش اور زخمی شیر کا خروش بھی ہے"۔[۱]

علیگڑھ تحریک سے متاثر ہونے والوں میں مذکورہ بالا شاعروں کے علاوہ چند ایک نام اور بھی نظر آتے ہیں جن کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ انہوں نے پبلک پلیٹ فارم سے اپنی قومی اور ملّی نظمیں پیش کی تھیں۔ اس طرح عوام کے ذہن و دل کو متاثر کرنے اور ان کی توجہ کو زندگی کے اہم مقاصد کی طرف مبذول کرنے میں ان شاعروں کا نمایاں حصّہ رہا تھا۔ انہیں گرچہ دنیائے شاعری میں کوئی اعلیٰ مقام نہ مل سکا، لیکن اپنے دور میں انہوں نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کو فروغ دینے کی جو سعی کی تھی وہ ہمارے موضوع کے دائرے میں آجاتی ہے۔

فضل حق آزاد عظیم آبادی (م: ۱۹۴۲ء) بقول سلیمان ندوی ایک ہمہ داں شاعر تھے[۲] وہ نہ صرف سرسید، حالی اور شبلی کے ہم عصر تھے[۳] بلکہ علیگڑھ تحریک کے سرگرم مؤیدین میں سے تھے[۴] مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں وہ اپنی قومی نظمیں اس طرح سناتے تھے کہ سامعین "ان کے پڑھنے کے انداز سے لطف اندوز ہو جاتے تھے"۔[۵]

آزاد بھی مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال پر کڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی انہیں پرشکوہ ماضی کی یاد رہ رہ کر ستاتی ہے۔ چنانچہ وہ ان دونوں کیفیتوں کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ماضی و حال دونوں کی مختلف تصویریں ایک ہی شعر کے چوکھٹے میں سما جاتی ہیں ؎

اب تو اللہ کے ہاتھ ہے حرمت اس کی
کچھ بھی باقی نہ وہ حشمت ہے نہ شوکت اس کی

---

[۱] ماہرالقادری، مولانا: شبلی نعمانی کی ملّی شاعری، مطبوعہ صریر خامہ (قومی شاعری نمبر) سندھ یونی ورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۶۶ء، ص ۲۷

[۲] ندوی، سید سلیمان: نقوش سلیمانی، ص ۲۷۲

[۳] نیّر، پروفیسر علی حیدر: فضل حق آزاد بحیثیت نظم نگار، ص ۱

[۴] ایضاً

[۵] بیدل، پروفیسر عبدالمنان: سات ستارے، مطبوعہ صنم (بہار نمبر) جلد ۲، ۱۹۵۹ء، ص ۶۳

چھاؤنی چار طرف نکبت و افلاس کی ہے

خواب ہی خواب ہے وہ دولت و ثروت اس کی

سب کے منہ میں ہے زباں آج جو چاہیں کہ لیں

حکمت اس کی تھی کبھی اور حکومت اس کی

جب تک اس دہر میں ہیں علم و ہنر کے آثار

ثبت ہے صفحۂ گیتی پہ کرامت اس کی

وہ رہے یا نہ رہے یاد رہے گی بے شک

کبھی بھولے گا زمانہ نہ حکایت اس کی

دفعتہً دولت و اقبال نے منہ موڑ لیا

ساتھ اک رہ گئی پھوٹی ہوئی قسمت اس کی

فضل حق آزاد ماضی و حال کی متضاد کیفیتوں کا نقشہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے، وہ قافلۂ حرماں نصیب کو بانگ جرس سنا کر رواں دواں رکھنے کے آرزومند بھی ہیں۔ ملاحظہ ہوں ان کے ولولہ خیز اشعار ؎

سنو سنو کہ یہ حیرت فزا فسانہ ہے
اٹھو اٹھو کہ اٹھا خواب سے زمانا ہے

چلو چلو کہ ہر اک قافلہ روانہ ہے
بڑھو بڑھو کہ بہت دیکھنا دکھانا ہے

پھری ہے باغ جہاں کی ہوا چلو دیکھو

بہار آئی ہے تم بھی ذرا چلو دیکھو

شبلی و حالی کی طرح آزاد بھی اپنی قوم کو بدلتے ہوئے زمانے کا بغور جائزہ لینے، اسے سمجھنے اور اس کا ساتھ دینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے انداز تخاطب میں کتنی دلآویزی اور کس قدر شعریت ہے، اس کا اندازہ درج ذیل بند سے لگائیے ؎

جہاں کو دیکھو تو کیفیت جہاں کیا ہے
زمیں کی چال ہے کیا دور آسماں کیا ہے

بہار لائی ہے کیا رنگ گلستاں کیا ہے
غرض کہ شرق و غرب یہاں وہاں کیا ہے

جو دیکھنا ہو تو آجاؤ دیکھ لو تم بھی

چمن کا رنگ ہے کیا آؤ دیکھ لو تم بھی

برعظیم میں جہاں کچھ لوگ علیگڑھ تحریک کے حامیوں میں تھے، وہاں ایک حلقہ مخالفین کا بھی تھا۔ ان لوگوں کے ٹکراؤ سے قومی سالمیت کو نقصان پہنچنے کا احتمال

رہتا تھا۔ فضل حق آزاد چاہتے تھے کہ آپس کی نا اتفاقی ختم ہو اور سب لوگ متحد و متفق ہو کر
حالات کا مقابلہ کریں کہ اسی میں کامیابی ممکن تھی۔ اپنے اس خیال کو وہ یوں پیش کرتے
ہیں ؎

خیال چاہئے مشکل بھی ہو تو کٹ جائے
جو ہمت آن کھڑی ہو پہاڑ الٹ جائے
جگر کو شق کریں دریا، زمین پھٹ جائے
ہوا کا رخ بھی جو چاہیں ہم پلٹ جائے
یہ سب ہیں بس اسی صلح و وفاق سے ممکن
محال جتنے ہیں، ہیں اتفاق سے ممکن

آزاد نکبت و ادبار کی فضا سے نہ خود مایوس ہوتے ہیں، نہ قوم کو مایوس ہونے دیتے
ہیں۔ ان کے درج ذیل بند میں رجائیت کا پہلو مایوس و مضمحل قوم کے لئے مژدہ جاں
فزا سے کم نہیں ؎

عجب نہیں کہ وہی چہچہے کے دن پھر آئیں
یہ سوکھے سوکھے جو ہیں نخل پھر ہرے ہو جائیں
ہوا کا رخ پھرے ایسا کہ بادہ کش بل کھائیں
بہار آئے جوانانِ باغ دھوم مچائیں
وہ بزم عیش وہ عشرت نصیب ہو پھر بھی
دل ستم زدہ راحت نصیب ہو پھر بھی

مولوی فضل حق آزاد کے اشعار میں جو زور و شور اور طرز ادا میں جو جوش و خروش
ہے، اس نے تحریک علیگڈھ کے دور میں خاصا اثر قائم کیا ہوگا۔[1]

امجد علی اشہری (م: ۱۹۱۰ء) اگرچہ ابتدا میں علیگڈھ تحریک کے سخت مخالف
تھے[2] لیکن بعد میں ایسے موئید و ہم نوا بن گئے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے متعدد اجلاس

---

[1] سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں: اس تحریک کو فروغ بخشنے اور کامیاب بنانے کے لئے دامے درمے
قدمے، سخنے ہر طور مستعد رہے۔ اس سلسلے میں آپ حالی اور شبلی کے ساتھ حیدرآباد دکن بھی
گئے جہاں علیگڈھ تحریک کے لئے چندہ کی فراہمی میں ہمہ تن مشغول رہے۔ "علیگڈھ تحریک اور
قومی نظمیں" ص ۲۳۲

[2] ایضاً

میں اپنی قومی وملی نظمیں سنائیں[1] اور اپنی مخالفت کا بہ بانگِ دہل اعتراف کیا ؂

کیا جو اس نے وہ ہم نے نہ مانا | رہی تنقید سے گلچھپ اور تکرار
پھر آخر کو سمجھ آئی تو سمجھے | ہوئی جب اپنی حالت سر بسر زار

اشہری کو یہ احساس تو تھا کہ برعظیم کے مسلمان آزادی سے محروم کر دیے گئے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں اب زمامِ حکومت نہیں رہی۔ لیکن انہیں اس خطہ جنت نظیر کی اسلامی تاریخ یاد تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمان ہی اس ملک کے فرماں روا تھے۔ شعر و سخن میں ان کا مقام و مرتبہ بلند تھا۔ ان کا تجارتی کارواں ہر سو رواں تھا ـــــ اشہری ان ہی اہم نکات کو مسلمانوں کے گوش گزار کر کے در پردہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس وسیع و عریض ملک میں ان کا ماضی کتنا شاندار تھا اور ان کے اوج کا ستارہ کس بلندی پر فروزاں تھا۔ ماضی کی یہ روداد جہاں مسلمانانِ ہند کے تازہ زخموں کو اور ہرا کر رہی تھی، وہاں بادی النظر میں ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے اور ان کی رگوں میں جوش و ولولے کی لہر دوڑانے کا فریضہ بھی انجام دے رہی تھی۔ نفسیاتی تاثر سے مملو اشہری کا ترجیع بند ملاحظہ ہو ؂

زمانہ میں ہم ہی شاہِ جہاں تھے | ہم ہی کل مالکِ ہندوستاں تھے
ہم ہی اکبر، ہم ہی تھے شاہ عالم | ہمارے نام کے سکے رواں تھے
ہم ہی شعر و سخن کے تھے شناسا | ہم ہی علم و ہنر کے قدرداں تھے
تجارت کو ہم ہی جاتے تھے ہر سو | رواں ہر سو ہمارے کارواں تھے
ادیب نکتہ داں دنیا میں ہم تھے | طبیب دردِ قلبِ ناتواں تھے
ہمارے باغ تھے گلزارِ جنت | ہمارے دشت باغِ بے خزاں تھے

مگر افسوس جب پلٹا زمانہ
تو اب تاریخ اپنی ہے فسانہ

اشہری کے اس ترجیع بند کا وہی انداز ہے جو محمد حسین آزاد کی مثنوی "حب وطن" کا ہے۔ آخر الذکر نظم نے برعظیم کی اسلامی تاریخ کی جو تفصیل بیان کی ہے اول الذکر میں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بریلوی، سید الطاف علی: علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔

میں اس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اشہری اپنے ترجیع بند میں وہ
شاعرانہ محاسن نہ پیدا کر سکے جو آزاد کی مثنوی کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن اس ایجاز و
اختصار کے باوجود اس میں تاثر کی شدت اور صداقت کی گونج موجود ہے۔

اشہری کو اس امر کا احساس تھا کہ اتنے شاندار و پرشکوہ ماضی کے حامل ہونے
کے باوجود مسلمان اب زوال و انحطاط کا شکار ہو چکے ہیں۔ ترقی کی راہیں مسدود
ہو گئی ہیں۔ حال ابتر ہے اور مستقبل تیرہ و تار نظر آتا ہے۔ اس مایوسی کے عالم میں
شاعر کو اگر کسی سے مدد کی امید ہے تو وہ خدا کی ذات ہے۔ چنانچہ وہ ملک و قوم
کے لئے بارگاہ ایزدی میں صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں اور ایک نئے انداز کے ساتھ
——— جو اس دور کے کسی شاعر کے یہاں ہمیں نظر نہیں آتا ؎

خدایا تو علیم این و آں ہے ‏ ‏ ‏ الٰہی تو کریم و مہرباں ہے
ملا ہر قوم کو جو اس نے چاہا ‏ ‏ ‏ ترا فیضان دنیا پر عیاں ہے
وہ امریکہ جو تھا گمنام عالم ‏ ‏ ‏ وہ اب دنیا میں باغ بے خزاں ہے
نئے سر سے ملی جرمن کو طاقت ‏ ‏ ‏ جسے کہتے تھے بوڑھا وہ جواں ہے
وہ جاپاں جو تھا اک ناچیز دنیا ‏ ‏ ‏ وہ اب فغفور چیں کا ہم عناں ہے

ان ممالک کے تذکرے کے بعد اشہری سلطنت برطانیہ کا ذکر چھیڑتے ہیں جہاں کی
قوم ایک تاجر کے سوا کچھ اور کیا تھی۔ مگر اب ؎

ابھی جو قوم تھی کرتی تجارت ‏ ‏ ‏ وہی اب مالک ہندوستاں ہے

ملک چھن جانے کے بعد اہل وطن جب معاشی بدحالی میں مبتلا ہوئے اور اپنی ہی دولت و
ثروت کو ترستے رہے، اس کا تذکرہ وہ نہایت اثر انگیز طریقے سے کرتے ہیں ؎

خدایا کیا کہیں قسمت کو اپنی ‏ ‏ ‏ کھڑے پیاسے ہیں دریا رواں ہے

پھر اشہری اس بند کو دل سے نکلی ہوئی اس دعا پر ختم کرتے ہیں ؎

خدایا عفو کر جو ہوں خطائیں ‏ ‏ ‏ پہنچ جائیں اثر تک یہ دعائیں

امجد علی اشہری اپنے کلام کی انفرادیت، حالات کی صمیم عکاسی اور جذبے کی
صداقت کی بنا پر اس عبوری دور کی شاعری میں امتیازی مقام کے حامل نظر آتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کی تحریک سے براہ راست تعلق رکھنے اور قومی جلسوں کے لئے

منظومات لکھنے والے شعرا کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس مقالے میں ان سب کی شعری تخلیقات کا احاطہ کرنا خاصا مشکل ہے۔ تاہم ہم مجموعی طور پر یہ رائے ضرور دے سکتے ہیں کہ ان سبھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے قومی تعمیر کا وہ کام کیا ہے جو آنے والے شعرا کے لئے نشانِ راہ ثابت ہوا اور قوم میں سیاسی شعور کی بیداری کا موجب ٹھہرا۔

اب ہم اس طویل باب کو اختتام تک پہنچانے سے قبل ان شاعروں کی تخلیقات کا بھی جائزہ لیتے چلیں جو علیگڑھ تحریک سے براہ راست وابستہ تو نہ تھے مگر آزاد و حالی اور دیگر شعرا کے جدید طرزِ سخن سے متاثر ضرور ہوئے تھے اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے فکر و فن کا دھارا ملک و ملت کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی جیسے موضوعات کی طرف موڑ چکے تھے۔ جن کے دل میں بھی وطن کی عظمت کا احساس جاگزیں ہوا تھا اور جنہوں نے قوم کی زبوں حالی کا ازالہ قومی و ملی نظموں کے توسط سے کرنا چاہا تھا۔ ایسے شعرا میں سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، سورج نرائن مہر، چکبست اور اقبال خاصے نمایاں ہیں۔ آیئے ہم ان میں سے چند ایک کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ یہ کس طرح قوم میں وطنیت کا جذبہ ابھار رہے ہیں اور بدلے ہوئے سیاسی ماحول میں کس نوع کا پیام دے رہے ہیں۔

سرور جہاں آبادی (م: ۱۹۱۰ء) وطن کی محبت میں سرشار نظر آتے ہیں۔ وہ جب حال کی سیہ بختی کا نظارہ کرتے ہیں تو پر مسرت ماضی کی یاد ان کے دل میں بھی کچوکے لگانے لگتی ہے۔ وہ اپنے اس جذبے کی کچھ اس طرح ترجمانی کرتے ہیں کہ اشعار میں درد و اثر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز اس پنچھی کی آواز سے مماثلت رکھتی ہے جو قفس میں مقید ہو اور بال و پر بھی نہیں کہ کچھ حرکت دے کر تسکین جان حاصل کرے۔ البتہ آہ و بکا کر کے دلی رنج و تعب کا اظہار کرتا ہے۔ اس نوع کے احساسات سرور کے کلام میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں ؎

ہم ستائے ہوئے ہیں گردش ایام کے آہ — ہم کو یاروں سے نہیں شکوہ بیداد وطن
گیت گاتے تھے کبھی حب وطن کے ہم بھی — وہ بھی دن تھے کہ چمن میں تھے ہم آزاد وطن
رحم کر رحم کہ صیاد قفس میں افسوس — چیختا کب سے ہے اک مرغ چمن زاد وطن

ہم عصر شعرا کی طرح سرور بھی دورِ گذشتہ کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ اس قسم کے مضمون سے مملو اشعار عظمتِ رفتہ سے ان کی والہانہ شیفتگی اور دلی رغبت کے عمدہ ترجمان ہیں۔ ان میں انتہائی درجے کا کرب اور بلا کی تپش مضمر ہے ؎

اڑ گیا نورِ سحر تاریکیٔ غم چھا گئی　　نیرِ اقبال ڈوبا شامِ ماتم چھا گئی

اڑ رہا تھا پرچمِ شوکت ترا افلاک پر　　سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر

پروانوں کا تجھے غم اے شمعِ انجمن ہے　　قسمت میں آہ میری دلسوزیٔ وطن ہے

سرور جہاں آبادی گزرے ہوئے اچھے دنوں کا ماتم تو کرتے ہیں، لیکن حال کی تلخیوں کا مداوا بھی ڈھونڈتے ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کا لائحہ عمل بھی ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ ان کا دریافت شدہ نسخہ "حب الوطنی" کی ایک نادر مثال ہے۔ ذرا اس کی جھلک بھی دیکھتے چلیے ؎

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں

حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں

مل مل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں

بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

سرور اہلِ وطن کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی ابھارنے کے بعد اپنا پیغام بھی دیتے ہیں۔ اس میں ناصح کی کرختگی اور واعظ کی خشکی نہیں، ایک ہمدرد کی تڑپ اور غم خوار کی چبھن بھی شامل ہے۔ خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی قوم کے لئے سرور کا یہ پیغام عزم و ہمت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس کو سن کر تھکے ہارے اور مضمحل افراد میں تلخ حالات سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ فزوں ہوتا ہے۔ اس قسم کے پیام جانفزا سنانے والے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خوابِ گراں سے چونکو ہندوستان والو

پستی میں کیوں پڑے ہو اونچے نشان والو

کب تک یہ آہ و ذلت او عز و شان والو

کب تک یہ خوابِ غفلت سونے کی کان والو

اٹھ کر ذرا تو دیکھو دنیا کا رنگ کیا ہے

رفتار کیا جہاں کی قوموں کا ڈھنگ کیا ہے

بے حفظ وضع کیا شئے ناموس و ننگ کیا ہے

ایثار نفس کیا ہے قومی امنگ کیا ہے

قوموں کی ہے ترقی کا کچھ تو راز آخر

حب وطن میں کردو دل کو گداز آخر

پنڈت برج نرائن چکبست (م: ۱۹۲۶ء) بھی قومی و ملی شاعری کے مروجہ ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہیں اور ماضی کی تہذیبی روایات کے مٹنے پر نوحہ خواں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کا انداز نظر مسلم شعرا سے ذرا مختلف ہے۔ آخر الذکر اپنی تہذیب اور تمدن کا سرچشمہ سرزمین عرب کو قرار دیتے ہیں جبکہ چکبست اس کا رخ غیر منقسم ہندوستان کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اس خاک دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری

چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آب یاری

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری

چشم و چراغ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمع ادب نہ تھی جب یونان کی انجمن میں

تاباں تھا مہر دانش اس وادی کہن میں

سرور کی طرح ان کے یہاں بھی حب الوطنی کا احساس کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ بدلے ہوئے سیاسی ماحول میں حب وطن کا جذبہ ابھارنے کے شدید آرزومند تھے۔ ان کے نزدیک قوم کی غفلت و افسردگی کے علاج کے لئے یہی نسخہ تیر بہدف ثابت ہوسکتا تھا۔ ان کی یہ تمنائے دل درج ذیل اشعار کے قالب میں کچھ اس طرح ڈھلتی ہے ؎

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے

بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

مردہ طبیعتوں میں افسردگی مٹا دے

اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہوکر

سر میں خمار ہوکر دل میں سرور ہوکر

چکبست نے قومی جذبے کے اظہار کے لیے مروجہ اسلوب شاعری کے علاوہ نئی ہیئت کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس سے ان کی تخلیقات میں رنگ و آہنگ کی دلآویز آمیزش نظر آتی ہے۔ اس تجربے سے جدید شاعری کو نغمگی کا حسن بھی ملا ہے، عکاسیٔ جذبات کا پر اثر انداز بھی!۔ اس طرزِ سخن کا نمونہ ملاحظہ ہو:

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک — یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے — یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وطن دوستی کے جذبۂ صادق نے چکبست کو اس عبوری دور کے شعرا میں ایک امتیازی مقام عطا کیا ہے۔ آگے آنے والے حریت پسند شاعروں کے لئے ان کی منظومات مشعلِ راہ ثابت ہوئی ہیں۔

نادر کاکوروی (م: ۱۹۱۲ء) نے بھی حب الوطنی کے موضوع پر نظمیں لکھی تھیں۔ انھیں بقول رام بابو سکسینہ "اپنے وطن سے عشق تھا۔"[1] وہ برعظیم میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو یاد کرتے ہیں تو غم کے شدید احساس سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان کے دل کا کرب اشعار کے آئینے میں جھلک اٹھتا ہے:

آہ اے اسلام تو اور یہ غریبی بے کسی

رونا آتا ہے ہمیں تیری یہ حالت دیکھتے

جس میں تو صدہا برس اجلاس فرماتا رہا

کاش ہم پھر وہ ترا ایوانِ شوکت دیکھتے

نادر کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ ایوانِ شوکت کی تباہی و بربادی دراصل غیر ملکی تاجروں کی بدولت عمل میں آئی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شاہانِ مغلیہ کے درِ دولت پر کاسۂ گدائی لیے آئے تھے۔ اور آج ان کے جہاز اپنے ہی ملک کے سینے پر لنگر انداز ہیں۔ اس تلخ احساس نے ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کو جنم دیا ہے۔ ان کی یہ نفرت طنز کے پیرائے میں یوں اجاگر ہو رہی ہے:

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۴۵۱

تیری بندرگاہ پر یہ غیر ملکوں کے جہاز

جو اڑاتے ہیں پھریروں کی طرح سے اپنا مال

میری نظروں میں در دولت کے ہیں نزے فقیر

اور پھیلائے کھڑے ہیں اپنے دامانِ سوال

انگریزی زبان کے شعرا بائرن اور ٹامس مور کے دلدادہ[۱] ہونے کے باوجود نادر کاکوروی انگریز قوم کے سیاہ کارنامے کو بروئے کار لانے سے نہیں چوکتے۔ ناظرین آگے چل کر دیکھیں گے کہ نادر کے اس اندازِ تذلیل کو ترقی پسند شعرا کس چابکدستی سے اپنا رہے ہیں۔

قومی وملی تحریک کا دور آخر تھا جب اقبال (م: ۱۹۳۸ء) ایک نئے رنگ نئے آہنگ اور نئے تخیل کے ساتھ بساطِ شاعری پر ابھرے۔[۲] اگرچہ علیگڈھ تحریک سے وابستہ شاعروں کی آوازیں فضا میں اب بھی گونج رہی تھیں اور سرور و چکبست بڑے طنطنے کے ساتھ حب وطن کے نغمے الاپ رہے تھے، لیکن اقبال فکر و فن کی دنیائے دیگر لئے ہوئے جب وارد ہوئے تو "ان کی آواز سے یہ سب آوازیں دب کر رہ گئیں"۔[۳]

اقبال کی وطنی نظموں میں بھی ماضی کی عظمت کا احساس پایا جاتا ہے، لیکن اس کے اظہار کا انداز سب سے جداگانہ اور منفرد ہے۔ وہ جب دورِ گزشتہ کو یاد کرتے ہیں تو روایتی شاعری کا سہارا نہیں لیتے، بلکہ نئے آہنگ کے ساتھ جذبات دروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی مثال نظم "ہمالہ" کے آخری بند سے دی جا سکتی ہے ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا

مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا

داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

۱۔ سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۴۵۱

۲۔ "اقبال کے کلام کی شہرت ۱۹۰۱ء کے پہلے سے ہونے لگی تھی"۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، حرف خامہ ص ۲۳ ۱۹۶۶ء

۳۔ تبسم، صوفی غلام مصطفےٰ: اردو شاعری میں قومی تحریک اور اقبال، مطبوعہ مقالاتِ یوم اقبال ۶۷ء ص ۶۲

عظمتِ رفتہ کی اس یاد میں شانِ دلربائی بھی ہے، فخر و امتیاز کا احساس بھی ہے اور نئی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا نوحہ بھی ہے!۔ پیچھے کی طرف دوڑنے کی جو تمنا ہے وہ ماضی سے اقبال کی والہانہ وابستگی کا مظہر ہے۔ اسی وابستگی نے اپنے وطن کی عظمت و رفعت کو اجاگر کرنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ وہ جب وطن کے گیت گاتے ہیں تو ان کی اٹوٹ محبت، ان کے شدید قومی احساس اور ان کے گہرے خلوص کا پرتو صاف طور پر دکھائی دیتا ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

لیکن اقبال ماضی کے نہیں، حال کے شاعر تھے۔ دورِ جدید کی یہ ٹھوس حقیقت کہ اب وطن غیروں کے تصرف میں جا چکا ہے، ان کے روبرو تھی۔ وہ تاریخ کے اس زندہ ثبوت کو جھٹلا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے برعظیم کی یہ حالت دیکھ کر "پرندے کی فریاد" لکھی، جو گرچہ بچوں کے لئے تھی لیکن اس میں حالات کی تلخی، قوم کی بیکسی و لاچاری اور شدید رنج و غم کا احساس نمایاں ہے۔ جو سچ پوچھئے تو ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد کے دورِ غلامی کی صحیح کیفیت پرندے کی زبانی بیان کر دی گئی ہے، بقول پروفیسر علم الدین سالک:

"انہوں نے ہندوستان کی حالت دیکھتے ہوئے، بچوں کے لئے ایک نظم پرندے کی فریاد لکھی جس میں تمثیلاً ہندوستان کی غلامی کا ذکر درد انگیز پیرائے میں کیا ہے"۔[1]

---

[1] سالک، پروفیسر علم الدین: وطنیت اور اقبال، مطبوعہ مقالات یوم اقبال ۱۹۶۷ء، ص ۶۵

درج ذیل اشعار سے یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ قوم کی فریاد و فغاں کے اظہار
کے لئے اقبال نے نیا انداز و آہنگ اختیار کیا ہے ؎

آتا ہے یاد مجھکو گزرا ہوا زمانہ — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں — ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے — دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے — دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

دکھے ہوئے دلوں کی اس فریاد نے گرچہ اقبال کو خوب خوب رلایا ہے اور وہ اس نوع کے
اشعار کہہ گئے ہیں ؎

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

لیکن اقبال جیسے شاعر عزم و عمل کے لئے یہ رونا دھونا' یہ نوحہ خوانی اور "خوشی
رونق ہے جس کو میں وہ محروم مسرت ہوں" جیسا احساسِ پژمردگی محض عارضی تھا۔
وہ قنوطیت کے اس روایتی حصار کو آناً فاناً توڑ کر اس منزل سے آگے نکل گئے وہاں[1]
جہاں دیگر شعرائے عصر ڈیرا جمائے بیٹھے تھے۔ اقبال شکستہ پا قوم کو ۱۹۰۴ء[2] کے
اوائل ہی میں جبکہ سیاسی شعور ابھی بیدار بھی نہیں ہوا تھا' اس طرح حالات سے
باخبر کر رہے تھے ؎

---

[1] تبسم' صوفی غلام مصطفیٰ: اردو شاعری میں قومی تحریک اور اقبال' مطبوعہ مقالات یوم اقبال' ۱۹۶۶ء ص ۶۲
[2] بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں "نظم تصویر درد ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی تھی" بحوالہ صریر خامہ' سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۶ء ص ۲۳

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال نے اس دور میں سیاسی منزل کی نہ صرف نشان دہی کی تھی' بلکہ وہاں تک پہنچنے کے لئے زاد راہ بھی تجویز کیا تھا۔ ایک طرف تو وہ قوم کو عمل کا پیغام جاں فزا سنا رہے تھے۔

یہی آئین قدرت ہے' یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

اور دوسری جانب آپس کی نااتفاقی کو ختم کرکے محبت کا جذبہ پیدا کرنے کا درس بھی دے رہے تھے۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیمار قوم کی شفایابی اور اس کے نصیب خفتہ کی بیداری کے لئے اقبال اس عبوری دور میں جو کام کر رہے تھے' وہ دراصل ابتدا تھی' اُن عظیم و جلیل کارنامے نمایاں کی جنہیں وہ مستقبل قریب میں انجام دینے والے تھے ۔۔ گویا اس طرح انہوں نے اپنے شاعرانہ سفر کے آغاز میں بھی خود کو سب سے ممتاز و منفرد رکھا اور اپنے ارتقائی دور میں بھی وہ مقام حاصل کیا جو "دیگر اردو شعرا میں بہت بلند ہے"۔[1]

---

[1] سکسینہ' رام بابو: تاریخ ادب اردو' ص ۲۰۲

ناظرین! ۔ زیرِ نظر باب میں ہم نے اپنے سفر کا آغاز محمد حسین آزاد کی قومی و ملی نظموں سے کیا
تھا اور حالی، اسمٰعیل، نذیر، شبلی اور دوسرے شعرا کے کلام میں اصلاحی تحریک کی روایات کا
جائزہ لیتے ہوئے سرور، چکبست اور اقبال کے جذبۂ حب الوطنی تک آ پہنچے ہیں۔ اس تیس
پینتیس سالہ دور نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ناکام جنگِ آزادی کے نتیجے میں حزن و
یاس کی جو لہر اردو شاعری میں ابھری تھی، اگر اسے انجمن پنجاب اور علیگڈھ تحریک کی
انقلاب انگیز موجیں اپنے آپ میں ضم نہ کرتیں تو نہ صرف شعرائے اردو ماتم یک شہر آرزو
میں مصروف و منہمک رہتے بلکہ قوم کو عزم و عمل کی نئی منزل کا سراغ بھی نہیں ملتا۔
ایسے وقت میں جبکہ حکمراں طبقہ اہلِ وطن کے جسم و جاں کو پابجولاں کرنے کے بعد ان کی
فکر و نظر کو بھی اسیری کی زنجیریں پہنا رہا تھا، ان شاعروں نے ماضی کی عظمت رفتہ
کو اجاگر کر کے، اسلامی اقدار و روایات کو زندہ و تابندہ کر کے، حب الوطنی کے جذبے کو
ابھار کر، علم و فن کے حصول کی ترغیب دے کر، اتحاد و اتفاق کے گن گا کر اور عمل
کا پیغام جاں فزا سنا کر جو خدمات انجام دی ہیں، انہیں نہ صرف قومی تاریخ میں نمایاں
جگہ ملے گی، بلکہ تاریخ ادبِ اردو میں بھی وہ حرفِ زر سے لکھی جانے کی مستحق ٹھہریں
گی۔ ان نہتے شاعروں نے انگریزوں کی آنکھوں میں ڈالی ہیں اور مفتوح و محکوم قوم کو
ان کے خلاف صف آرا کیا ہے۔ برطانوی جبر و استبداد کے سائے میں رہ کر بھی انہوں
نے اہلِ وطن کے تنِ مردہ میں عزم و ہمت کی برق پاش لہر دوڑا دی ہے۔ شعورِ خفتہ
کی بیداری کا جو کام بڑے بڑے مصلح اور ریفارمر نہ کر سکے، وہ حسن و عشق اور گل و بلبل
کی مدح خوانی کرنے والے انہی شاعروں کے ہاتھوں انجام پایا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں
گے کہ ان کی جلائی ہوئی امنگ و حوصلے کی شمعیں حصولِ آزادی کی راہ کو کس طرح
اجال رہی ہیں۔

چلتے چلتے ایک بات کا ذکر ناگزیر ہے۔ اس دور کے تقریباً سبھی ممتاز شعرا زیر
بحث آئے ہیں۔ لیکن ناظرینِ گرامی کو ایک نام کی کمی یقیناً کھٹک رہی ہوگی۔ ہماری
مراد اکبر الٰہ آبادی سے ہے۔ اس اصلاحی دور میں اکبر نے جس طرح انگریزوں کا کھل کر
اور جم کر مقابلہ کیا تھا، ان کی لائی ہوئی تہذیب کے تباہ کن سمندر کے آگے جو مضبوط

بند باندھا تھا اور سرسید کی مغرب پرستی کے پُر زور گھوڑے کو مشرق کی جو لگام دی تھی ـــــ ان تمام باتوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اپنی ایک علیحدہ باب میں زیر بحث لائیں اور یہ دیکھیں کہ ان کی ردّ عمل کی تحریک آیا ملک و ملّت کے لئے مفید تھی یا مضر! ـ سو ناظرین! آیئے اگلے باب کی طرف جو صرف اکبر الٰہ آبادی کے لئے مخصوص ہے۔

آٹھواں باب

رَدِّ عمل کی تحریک: اکبر الہ آبادی

اردو ادب کی تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ جب اکبر الہ آبادی کے حوالے سے سرسید کا جائزہ لیا جاتا ہے تو آخر الذکر کو "انگریزی تعلیم کا دلدادہ"[۱] "مغربی تہذیب کے فوائد سے بہت متاثر"[۲] اور ان کی تحریک کو "ملت کے حق میں زہر قاتل"[۳] سمجھا جاتا ہے۔ اور جب سرسید کے تعلق سے شاعر اکبر کا محاسبہ کیا جاتا ہے تو وہ "تنگ نظر"[۴]، خود غرض[۵]، ماضی پرست[۶] اور مشرقیت کے عاشق[۷] جیسے خطابات سے نوازے جاتے ہیں۔ سرسید اور اکبر دونوں کا طرفدار ہر دو طبقہ اپنی رائے میں انتہا پسند نظر آتا ہے۔ اگر ایک نے سرسید کی قومی و ملی خدمات کو سراہا ہے تو اکبر کے مخالفانہ رویے کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ دوسرے نے اکبر کا ساتھ دیا ہے تو سرسید کا دامن جھٹک کر الگ کھڑا ہو گیا ہے ــــــ مگر کسی ایک نے بھی یہ محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی کہ سید و اکبر دونوں اپنی جگہ درست اور صحیح خیال کے حامل تھے۔ دونوں قوم و وطن کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد تھے۔ فرق صرف نظریے کا تھا اور اسی کے سمجھنے میں ہم نے بارہا غلطی کی اور ہماری انتہا پسندی متوازن خیال و رائے پر غالب آ گئی۔

سرسید کے کارہائے نمایاں کے متعلق ہم گذشتہ باب میں بحث کر آئے ہیں۔ یہاں انہیں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر نے ردِّ عمل کی جو تحریک شروع کی، اس کی غرض و غایت کیا تھی اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ اکبر جو "منشی گیری سے شروع ہو کر محض اپنی ذہانت اور ذاتی قابلیت کی بنا پر ججی کے عہدے تک پہنچے"[۸] علم و ہنر کے حصول کے سراسر خلاف تھے،

---

[۱] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۴۳۹

[۲] ایضاً، ص ۴۴۸

[۳] دریابادی، مولانا عبدالماجد: مقالات ماجد، ص ۴۱

[۴] سرور، آل احمد: نئے اور پرانے چراغ، ص ۲۲۲

[۵] ایضاً، ص، ۱۱۲

[۶] ایضاً: اکبر کا المیہ مطبوعہ بہترین ادب ۱۹۴۹ء، ص ۹۷

[۷] ایضاً

[۸] ایضاً: نئے اور پرانے چراغ، ص ۲۱۷

اور جو نئی تعلیم سے خود کو تو آراستہ کر گئے اور اپنے لڑکے کو بھی مغربی تعلیم دلائی[1]، اہلِ وطن کو اس روشنی سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ عصبیت کی عینک اتار کر واقعات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ اکبر کا مطمحِ نظر ایسا ہرگز نہ تھا۔ اس معاملے میں وہ بالکل رجعت پسند نہ تھے۔ وہ علم و ہنر سے استفادہ کر کے ترقی کی منزلیں طے کرنے کے بھی مخالف نہیں رہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ہرگز یہ نہ کہتے ؎

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو

خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

نوجوانانِ وطن کو جوش میں لانا اور انہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرنا اکبر کا عین مقصدِ حیات تھا۔ لیکن وہ اس معاملے میں تہذیب و ثقافت کی حدیں پھلانگ کر آگے بڑھنے کے قائل نہ تھے۔ ان کا نظریہ محض اتنا تھا کہ "تعلیم اور ترقی حاصل کرنے کے بعد جو قوم بنے وہ مشرقی ہو اور مسلمان!"[2] اس نوع کے خیالات اکبر کے درج ذیل اشعار سے بخوبی واضح ہو رہے ہیں ؎

تکمیل میں ان علوم کی ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

نیچر کی طاقت کو مکشوف کرنے کی ترغیب دینے کے ساتھ اللہ کی کبریائی اور اپنی حقیقت کو ذہن نشیں رکھنے کا درس دینا کس طور پر تنگ نظری اور ماضی پرستی کہلائے گی؟ واضح رہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں زندگی کی دوڑ میں اپنی انفرادیت کو کبھی فنا نہیں کرتیں۔

---

[1] سرور، آل احمد: نئے اور پرانے چراغ، ص ۲۴۲

[2] حلیم، پروفیسر ابوبکر احمد: اکبر الہ آبادی، خطبۂ صدارت بہ تقریب یومِ اکبر، کراچی، مارچ ۱۹۵۸ء، نیز مطبوعہ "برگِ گل" مجلہ اردو کالج، کراچی، ۱۹۵۷-۵۸ء، ص ۳

اکبر الہ آبادی کے دل میں علم کی جو وقعت تھی، اس کا احساس مندرجہ ذیل شعر کو پڑھ کر بھی ہوتا ہے:

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے — دنیا تو گئی، دین بھی برباد کریں گے

واضح رہے کہ اکبر علم کے بغیر اس "دین" کی بربادی کی پیش گوئی کر رہے ہیں جو انہیں بے حد عزیز تھا اور جس کی بدولت ان سے جھگڑے اور عناد کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ آج تک جاری ہے۔

اکبر پر سب سے بڑا الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ وہ سرسید کی ذات سے سخت متنفر تھے، علیگڑھ کالج سے انہیں للہی البغض تھا اور جدید تعلیم سے وہ بے حد نالاں تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد سرسید احمد جو شن لے کر آگے بڑھے تھے، اس کے متعلق اکبر کیا رائے رکھتے تھے ــــ سو اس کا پتہ خود ان کے ایک قطعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو اس موقع پر لکھا گیا تھا "جب نظام دکن نے کالج کی امداد ایک ہزار ماہانہ سے بڑھا کر دو ہزار کر دی تھی"[1] اسے پڑھ کر درج بالا تمام الزامات کی خود بخود تلافی ہو جاتی ہے:

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناتمام
بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسب حال
پھر کیا امید دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہوا اس کا خیال
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے، رنج سہے، گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانہ کو زورِ دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام

---

[1] حلیم، پروفیسر ابوبکر احمد: اکبر الہ آبادی، خطبۂ صدارت بہ تقریب یوم اکبر، کراچی، مارچ ۱۹۵۲ء، نیز برگ گل، اردو کالج، ۱۹۵۷-۵۸ء۔ یہ ایک ایسے شخص کی شہادت ہے جو اس تعلیمی ادارے سے برسوں تک وابستہ بھی رہا اور کلیدی عہدوں پر فائز بھی! (م۔ ر)

نیت جو تھی بہ خیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بہ صد شان و احترام
سرمایہ میں کمی تھی سہارا کوئی نہ تھا
سید کا دل تھا درپئے تکمیل انتظام
آخر اٹھا سفر کو وہ فرد خجستہ پے
احباب چند ساتھ تھے ذی علم و خوش کلام
حالت دکھائی اور ضرورت بیان کی
خوب سے التماس کیا قوم کا پیام
رحم آگیا حضور کو حالت پہ قوم کی
پھر کیا تھا موجزن ہوا دریائے فیض عام
مانا نہ دو ہزار کیا اک ہزار سے
امید سے زیادہ عطا تھی یہ لا کلام[1]

ناظرین! اقتباس طویل ہوگیا ہے، لیکن یہاں ان اشعار کی نقل ناگزیر تھی! انہیں پڑھ جائیے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرماں روائے دکن سے کالج کی تعمیر و ترقی کے لئے چندہ طلب کرنے والے وفد میں خود اکبر الہ آبادی بھی شامل ہیں۔ ان کے دل میں بھی علم و ہنر کے فروغ کے لئے وہی جذبہ کارفرما ہے جو سرسید اور ان کے دوسرے "ذی علم و خوش کلام" احباب کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ اس قطعے میں اکبر جس طرح علم کی فضیلت کو اجاگر کررہے ہیں، سرسید کی نیک نیتی اور ان کے کام کرنے کی صلاحیت کو بروئے کار لا رہے ہیں اور خدا کی برکت سے کالج کے "بہ صد شان و احترام" قائم ہوجانے پر اطمینان کا اظہار کررہے ہیں ـــــ یہ سب باتیں ان کے کھلے ہوئے دماغ، ان کی وسیع القلبی، ان کی روشن نظری اور سب سے بڑھ کر ان کی علم دوستی کا ثبوت ہیں۔ اکبر الہ آبادی سرسید کو قوم کا خادم اور "فرد خجستہ پے" کہہ کر، ان کے متعلق "خوب سے التماس کیا قوم کا پیام" جیسا مصرع موزوں کرکے، ان کے جلے پایاں عزم ان کے بیکراں

---

[1] منقول حلیم پروفیسر ابوبکر احمد: اکبر الہ آبادی، خطبۂ صدارت بہ تقریب یوم اکبر، کراچی، مارچ ۱۹۵۸ء، نیز برگ گل، اردو کالج، کراچی ۵۷-۱۹۵۶ء، ص ۴-۵

جذبے، ان کے حسنِ عمل اور قوم کے ساتھ ان کی بے لوث ہمدردی کو ظاہر کر کے خود بھی اسی صف میں کھڑے ہوگئے ہیں جہاں حالی، نذیر اور اسمٰعیل کھڑے دکھائی دے رہے ہیں۔

سرسید، ان کے مشن، ان کی تعلیمی تحریک اور ان کے کالج سے والہانہ شیفتگی، بے پناہ عقیدت اور حد درجہ انسیت کے بعد ـــــ الہ آباد کے اکبر کا یہ ہنگامہ، یہ چیخ و پکار اور یہ صدائے احتجاج کیوں؟

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں
باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

راہِ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے
واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

مسلمانوں کا وہ آئینِ طبعِ مستقل بدلا
چھٹی عربی، گیا قرآں، زباں بدلی تو دل بدلا

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں یہ قوم بیکس پگھل رہی ہے
نہ مشرقی ہے نہ مغربی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

وہ دل کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑیں گے
اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے

درج بالا اشعار میں پیش کیے ہوئے خیالات کو اکبر کی تضادِ طبیعت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے پس پردہ تاریخی حقائق ہیں، ٹھوس بنیادیں ہیں، ان مٹ نقوش ہیں جنہوں نے اکبر جیسے شاید محی کو ظرافت کا لباس اوڑھا کر چپکے چپکے طنز و تشنیع کے تیر چلانے پر مجبور کر دیا۔ آئیے دیکھیں کہ وہ تاریخی حقائق وہ ٹھوس بنیادیں اور وہ ان مٹ نقوش کیا تھے جن کی بنا پر اکبر الہ آبادی سرسید

تحریک کے سامنے اس کے ردّ عمل کی صورت میں نمایاں ہوئے۔

جیسا کہ گذشتہ باب میں تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے، سرسید بدلتے ہوئے ماحول میں مسلمانوں کے لئے جو کچھ سوچ رہے تھے، جو کچھ کر رہے تھے، وہ مقتضائے زمانہ تھا۔ "ایسے پرآشوب وقت میں دور اندیشی یہی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے شکست کا غصہ اور انگریزوں کے دماغوں سے فتح کا نشہ بیک وقت دور کرنے کی کوشش کی جائے"[1] اور ساتھ ہی انہیں علم و ہنر سے آراستہ ہونے کا مشورہ دیا جائے ـــــ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی اور اکبر بھی اس راہ میں سید کے ساتھ ساتھ تھے۔ لیکن وہ موڑ جہاں اختلافات[2] شروع ہوتے ہیں، سرسید کی انتہا پسندی اور غلو کا تھا ـــــ یہ ایک ایسا موڑ تھا جہاں سے ایک جانب مغربی تہذیب و تمدن کا سیل بلاخیز رواں تھا، اور دوسری جانب مشرقی اقدار و روایات کا معتدل و متوازن دریا بہہ رہا تھا۔ اس موڑ پر سرسید اور ان کے رفقا نے یک طرفہ انداز اختیار کیا اور اس سیل بلاخیز کے ساتھ بہہ نکلے۔ اس عصری فیصلے اور مغرب پرستی میں غلو کے جو اثرات واضح طور پر سامنے آئے، انہیں نہ تو سرسید کے حواریوں سے، نہ ہی اکبر کے طرفداروں سے، بلکہ ایک بالکل ہی غیر جانبدار شخصیت کی زبانی سنئے:

> "(انگریزی تعلیم نے) ایک حد تک ہماری دنیا تو بنا دی مگر ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں کالے فرنگی پیدا کئے۔ اس نے ہم میں اینگلو محمڈن پیدا کئے۔ اس نے ہماری قوم کے طبقہ علیا اور طبقہ متوسط کو یوروپ کی مادّی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے، چند خطاب، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں"۔[3]

---

[1] صدیقی، ڈاکٹر آفتاب احمد: اکبر کا نظریۂ تعلیم، مطبوعہ صریر خامہ (قومی شاعری نمبر)، ص ۳۹

[2] یہ اختلافات بربنائے شخصیت نہ تھے بلکہ بربنائے ملک و ملت تھے۔ بقول اکبر:

شیخ و سید سے تو خالی نہیں ذکر شاعر ۔۔۔ ذات سے انکی مخاطب ہیں مگر شاعر

[3] مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ: تعلیمات، ص ۱۸

تہذیب و تمدن، اقدار و روایات اور شرقیت و مذہبیت کی پاسداری کا یہی وہ جذبہ تھا جس نے اکبر کو سرسید سے علیحدہ کر دیا۔ یہ جذبہ کسی حال میں بھی نہ سطحی تھا نہ رجائیت پسند بلکہ اپنی انفرادیت، اپنے رنگ روپ، اپنے خط و خال اور اپنے مقاصد و نظریات کو برقرار رکھنے کا بڑا ہی جاندار اور وقیع جذبہ تھا۔
انگریزی زبان کا مشہور شاعر ورڈز ورتھ بھی ابتدا میں فرانس کے انقلاب پسندوں کا زبردست حامی تھا۔ لیکن جب ان میں بھی انتہا پسندی آگئی اور وہ جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے تو یہی ورڈز ورتھ ان کا سخت مخالف بن گیا اور ان کے خلاف نظمیں لکھنے لگا۔[1] بعینہٖ کیفیت اکبرالہ آبادی کی بھی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ورڈز ورتھ انگریزی زبان و ادب کا عظیم شاعر تھا اور مغرب سے خوشہ چینی کرنے والے نقاد اس کی اس حرکت پر انگلی نہیں اٹھاتے۔ اکبر سرسید کے یہ نہیں، مغربی تہذیب و تمدن اور فکر و نظر کے مخالف تھے، مگر ایک ایسی ابھرتی ہوئی زبان و ادب کے شاعر تھے جس کی ترقی کے لئے مغربی اقدار کو "بیساکھی" بنانا ضروری تصور کیا جا رہا ہے ـــــ اسی لئے وہ تنگ نظر اور قدامت پرست قرار دیئے گئے۔
سرسید کا مقصد تو دراصل یہ تھا کہ زبوں حال اور غفلت شعار قوم کو راہِ راست پر لایا جائے اور اسے مزید تباہ ہونے سے بچایا جائے۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے وہ مغربی دنیا سے روشنی مستعار لے رہے تھے۔ دوسروں سے روشنی مستعار لینے کی روایت ہمارے مذہب و کلچر میں صدیوں پرانی ہے۔[2] اس فعل کی افادیت سے انکار نہ پہلے کبھی تھا، نہ اب ہو سکتا ہے ـــــ مگر وہ بیرونی روشنی انہیں کچھ ایسی بھائی کہ وہ اسی سے جسم و جان، دیدۂ و دل اور قلب و روح کو منور کرنے کے گرویدہ ہو گئے، اور اپنے اس ارادۂ و خیال کو پوری قوم کے فکر و نظر پر مسلط

---

[1] ویسٹ، اے جی: *History of English Literature*، ص ۱۵۳
[2] حدیث نبویؐ: اطلبوا العلم ولو کان فی الصین
قول علیؓ: انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال

کرنے کے لیے بے چین نظر آنے لگے۔ مغربی تہذیب سے والہانہ لگاؤ کا جو فوری نتیجہ سامنے آیا اسے سرسید ہی کے سوانح نگار کی زبانی سنیئے:

"یورپین طریقہ پر بود و باش رکھنا، کوٹھی بنگلوں میں آبادی سے الگ رہنا، میز کرسی لگا کر کھانا کھانا انہوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی اختیار کر لیا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ طریقہ انگریزوں کے میل جول کا ایک ذریعہ تھا، بڑا فائدہ اس سے یہ تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں رہ کر کوئی بڑا کام ہرگز انجام نہ کر سکتے تھے۔"[1]

اس سلسلے کی دوسری مثال علیگڑھ کالج کے طالب علم مولوی عبدالحق پیش کرتے ہیں:

"فرمایا (سرسید نے) کہ طالب علموں سے نام بنام دریافت کرو کہ وہ اس لباس (کوٹ پتلون) کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ میں نے بھی ایک ایک سے پوچھا اور پوری فہرست بنا ڈالی۔ سب نے اسے پسند کیا۔ صرف دو چار ایسے تھے جنہوں نے کہا ہمیں اس سے اختلاف تو نہیں، البتہ کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔ ایک روز ...... پوچھا کیا ہوا؟ میں نے کہا سب طالب علم اس لباس کو پسند کرتے ہیں۔ صرف دو چار ایسے ہیں جنہیں اختلاف تو نہیں، لیکن یہ کہتے ہیں کہ اگر کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔ اس پر بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے ان کو نکال دو۔"[2]

مغرب کے اثرات کو قبول کرنے کا یہ رجحان صرف سید کا رواں ہی میں نہ تھا، ان کے ہم جلیسوں اور ہم نواؤں میں بھی تھا۔ ذرا اس کی بھی ایک جھلک سرسید ہی کے تربیت یافتہ مولوی عبدالحق کی مندرجہ ذیل تحریر میں دیکھئے:

---

[1] حالی، الطاف حسین: حیات جاوید، ص ۱۸۷

[2] عبدالحق، مولوی ڈاکٹر: چند ہم عصر، ص ۲۶۰

"ان کے بعض پیروؤں نے اس معاملے میں بڑا غلو کیا۔ اس میں
پیش پیش نواب محسن الملک تھے۔ حیدرآباد میں کوئی ان
کا ٹھاٹھ دیکھتا۔ فرنیچر انگلینڈ سے لائے تو اس کے رکھ رکھاؤ
اور صفائی کے لئے ایک انگریز بھی ساتھ لیتے آئے۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ بہت سے سولین اور بیرسٹر وغیرہ اپنی طرز معاشرت
میں صاحب بہادر تھے۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرز
معاشرت کی وجہ سے ہماری قوم میں ایک نیا طبقہ بن گیا
تھا جسے نقالوں کا طائفہ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ ان
میں نقل ہی نقل تھی"۔[1]

کسی بھی اچھی چیز کی نقل بری نہیں ہوتی۔ مگر جب نقالی سے خود اپنی انفرادیت
مجروح ہوتی ہو ذہنی صلاحیتوں کا دھارا غلط سمت اختیار کرتا ہو اور قومی تشخص کا
امتیازی مٹتا نظر آئے تو یہ بلاشبہ فکر و تردد کی بات ہوتی ہے — اور جب اس
قلبی ماہیت کے تغیر کا ڈانڈا برطانوی حکمراں کی درج ذیل پالیسی سے مل رہا ہو
تو اس کے تباہ کن اثرات سے چشم پوشی رہبران قوم کو کیوں کر زیب دے سکتی ہے:

"انگریزی کی تعلیم حکومت کا ایک مستقل فرض ہے۔ انگریزی
ہندوستانیوں کے لئے مغرب کے ترقی یافتہ اور وسعت پذیر
علوم کا دروازہ کھول دے گی اور ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ
ہندوستان مغربیت کا جادہ اختیار کرے گا۔ اس طریقے سے
امید ہے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو خون اور رنگ کے
اعتبار سے ہندوستانی ہوگا مگر خیالات اور تمدن میں
انگریز ہوگا"۔[2]

---

[1] عبدالحق، ڈاکٹر مولوی: چند ہم عصر ص ۲۷۵

[2] انگریزی تعلیم کے متعلق میکالے کی رپورٹ، منقول ٹامپسن و گیریٹ: Rise and Fulfilment of British Rule in India، ص ۲۷۲

حکمراں طبقے کے علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا سیلاب بلاخیز برعظیم کی دیرینہ روایات و اقدار کے چھتنا ور درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑ رہا تھا اور اس کی جگہ نقالوں کا طائفہ خودرو گھاس کی طرح اگتا جا رہا تھا۔ اس درآمدہ برقی رو کی لپیٹ میں سرسید اور محسن الملک تو آہی چکے تھے، پوری قوم کی ماہئیت بدل جانے کا خطرہ لاحق تھا ـــــــ اسی سیلاب بلاخیز کو، اسی برقی رو کو اور اسی خطرۂ جانکاہ کو روکنے کا نام اکبر الہ آبادی ہے۔

علیگڈھ تحریک جس شد و مد کے ساتھ آگے بڑھی تھی اور اس کے کار پرداز جس ذوق و جذبے کو لے کر مغربی تہذیب و تعلیم کے دھارے کے ساتھ بہنے لگے تھے، اگر اس وقت یہی تنگ نظر شاعر مشرقیت اور مذہبیت کی مضبوط دیوار نہ کھڑی کرتا تو سارے اہلِ وطن اس طبقے میں شامل ہو جاتے جو رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوتا مگر خیالات اور طرز معاشرت میں انگریز! ـــــــ لیکن اکبر نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اور ان کا یہ کام بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "ضروری بھی تھا اور قابل تعریف بھی"[۱]۔ آئیے اکبر کے اس ضروری اور قابل تعریف کام پر نظر ڈالیں ؎

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے | بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی | یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر | چلتا نہیں کام حرف نقالی سے

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر | اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

میرا اقبال ہو تو مذہب غربی | بھول جاؤں زبان بھی اپنی
اے خدا کر دے مجھ کو صاحب لوگ | دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں | سب یہ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

درج بالا اشعار میں اکبر نے قوم کے اس کردار کو طنز کا نشانہ بنایا ہے "جس نے

---

[۱] صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث : اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، ص ۱۱۵

معاملہ صرف مغربی تہذیب کا ہی نہیں' تعلیم کا بھی تھا۔ انگریز عیاری مکر و فطر کو اجال کر ہماری ہیں' اپنی بھلائی چاہتے تھے۔ اس تعلیمی اشاعت کے دور رس نتائج کو زیر نظر دور میں کسی نے بھی معلوم اور محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ درآمد شدہ علم و ادب کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ہر ایک فرد بشر اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا ـــــ انجام سے بے پروا' اثرات سے بے خبر اور نتیجے سے بے نیاز ۔ لیکن اکبر نے اس لمحے ہنسی ہنسی میں وہ سب کچھ کہہ دیا جسے بڑے بڑے علمی ادارے بھی باور نہ کرا سکے۔

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاءاللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

کسی محفل میں تم اکبر اگر چمکے تو کیا چمکے
سند جب ہے کہ بھرے ذکر حق نام خدا چمکے

دلوں پر چھائے جاتے ہیں چھاپہ شیکسپیئر اکبر
پڑھو گے حضرت سعدی کی گلستاں کب تک

غزالی و رومی کو بھلا کون سنے گا
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

رخصت ہو جو علم دین تو پھر دین بھی جائے
گل ہو جو چراغ' ابھی ہو پگڑی غائب

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

لارڈ میکالے کی مذکورہ بالا تعلیمی پالیسی کو ناظرین ایک مرتبہ پھر پڑھ لیں' اور اس کے بعد اکبرالہ آبادی کا درج ذیل شعر پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ مغربی تعلیم کے نتائج بد سے کون واقف تھا' سرسید یا اکبر[1]

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

یہ اکبر حسین ہی تھے جنہوں نے انگریزوں کے ماضی و حال دونوں زمانے کے پردے چاک کر کے قوم کو صحیح حالات و کوائف سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس تاریخی حقیقت کے اظہار کے لئے کہ انگریزوں نے سب سے پہلے اس برعظیم کو توپ و تفنگ کے ذریعے اپنے قبضے میں کیا اور اب دلوں اور دماغوں اور روحوں کو غلامی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اسکول اور کالج اور خدا جانے کیسی کیسی تعلیم گاہیں کھول رہے ہیں' اکبر نے نہ کوئی

---

[1] دریابادی' مولانا عبدالماجد: مقالات ماجد' ص ۴۹

طویل مثنوی لکھی اور نہ کوئی لمبا چوڑا قطعہ قلمبند کیا بلکہ ایک سیدھے سادے مختصر سی بحر کے شعر میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو ان کے سوا کوئی اور کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

لارڈ میکالے کے ہلاکت خیز تعلیمی نظریے کو سرسید جس جذبے کے ساتھ سینے سے لگائے آگے بڑھ رہے تھے، اگر اس رفتار پر اکبر کی گرفت مضبوط نہ ہوتی تو گمان اغلب تھا، برعظیم کی تمام کلاسیکی کتابیں دریا برد ہو جاتیں[1] اور قلب و نظر کے سادے صفحات پر مغرب افکار و نظریات کی چھاپ پڑنے لگتی۔[2]

اکبر کے اس ردعمل کی تحریک کو اجاگر کرنے کا مقصد و منشا یہ نہیں ہے کہ سرسید کی قومی خدمات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے اور مسلمانوں کی بروقت اصلاح کی جو کوششیں انہوں نے کی تھیں، ان کی اہمیت و وقعت گھٹا دی جائے۔ آل احمد سرور کا سرسید کے بارے میں یہ کہنا کہ جو "ان کی نیک نیتی، ان کے خلوص، ان کی بے لوث خدمت میں شبہ کرے وہ کافر"[3] حد درجہ حقیقت آمیز ہے۔ معاملہ صرف "فرخجستہ پے" کے اس غلو اور انتہا پسندی کا ہے جس کے سبب قومی کردار کے بگڑنے کا احتمال تھا، انفرادی رنگ کے اڑ جانے کا خطرہ درپیش تھا اور تہذیب و تمدن کے ملیامیٹ ہو جانے کے آثار ہویدا تھے۔

وہ موڑ ــــــ جہاں سے اکبر و سید کی راہیں جدا ہوئیں، تاریخی بصیرت کا حامل ہے۔ آخر الذکر مغرب دھارے کے ساتھ ساتھ بہہ نکلے جبکہ اول الذکر نے مشرقی روایات، مشرقی تہذیب و تمدن، مشرقی مزاج و مذاق، مشرقی ماحول اور سب سے بڑھ کر مشرقی عظمت و سربلندی کا پاس و لحاظ رکھا۔ گویا دونوں دو مختلف دھاروں پر بہہ رہے تھے۔ ایک کا رخ مغرب کی طرف تھا تو دوسرے کا مشرق کی طرف۔

یہاں سید احتشام حسین کے اس خیال کا اعتراف ضروری ہے کہ "اس وقت تاریخی طور پر سرسید کا ہی راستہ سب سے مناسب تھا۔ لیکن اس راستے میں جو گڑھے، جو

---

[1] ملاحظہ ہو زیر نظر مقالے کے ساتویں باب کا صفحہ نمبر ۲۰۳۔ حاشیے پر میکالے کی پالیسی پر ایک نوٹ درج ہے۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جناح، قائد اعظم محمد علی: Speeches، ص ۳۶، ۹۶

[3] سرور، آل احمد: نئے اور پرانے چراغ، ص ۲۱۹

جو کنویں پڑ رہے تھے، ان کی طرف اکبر الہ آبادی کا اشارہ کرنا لازمی تھا۔[1] اور ایسا اس لئے ممکن تھا کہ اکبر دور، مشرقی کنارے پر کھڑے ہو کر ان گڑھوں اور کنوؤں کو صاف طور پر دیکھ رہے تھے جو مغرب کی راہ میں حائل تھے۔ اور کون نہیں جانتا کہ غلو اور انتہا پسندی کے شوق میں دوڑنے والوں کے لئے راستے کے یہ گڑھے اور یہ کنویں کس درجہ خطرناک تھے۔ ناظرین، واضح رہے کہ اکبر نے دوڑنے سے منع نہیں کیا تھا، راستے کے انہی خطرناک مقامات سے باخبر کیا تھا۔ اشعار کی سرخ روشنی جلا کر گزرنے والوں کو ہوشیار کیا تھا۔

سرسید کو خطرات سے آگاہ کرنے اور ان کی شدت شوق کو کم کرنے کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ اکبر سن ستاون کی ناکام جنگ آزادی کے بعد تباہ و برباد ہونے والی قوم کو مزید شکست و ریخت کے گڑھوں اور کنوؤں میں گرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ قومی وجود کے "قطرے" کو مغربی تہذیب کے سمندر میں ضم کرنے کے روادار نہ تھے۔ وہ ہر حال میں ملک و قوم کی سالمیت چاہتے تھے ـــــ ویسے انہیں سرسید کی ذات سے کوئی پرخاش نہ تھی، ورنہ ان کے انتقال پر یوں اظہار عقیدت نہ کرتے ـ

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی، میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

---

[1] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۲۲۵ - ۲۲۶

نواں باب

سیاسی شعور کا احیا

(۱۹۰۱ء — ۱۹۱۹ء)

انیسویں صدی کے نصف آخر دور کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد جو دو اہم تاریخی حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں ایک تو ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی ہے جس کے نتیجے میں اہل وطن کے دلوں میں پابہ زنجیر ہونے کا صدمہ شکست و ریخت کا گہرا احساس اور ہمہ گیر مایوسی کی لہر نمودار ہوتی ہے۔ انقلاب کے بعد کی شاعری ان تمام کیفیات کا مظہر ہے۔ دوسری اہم حقیقت اصلاح کی تحریک ہے جس نے قومیت اور وطنیت کے شعور کو ابھارا۔ ہماری قومی و ملی شاعری اس تحریک کے دوش بدوش آگے بڑھی ہے اور اس کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں حد درجہ فعال رہی ہے۔

درج بالا دو حقائق کے امتزاج سے جو منطقی نتیجہ برآمد ہوا وہ سیاسی شعور کا احیا تھا۔ اس ٹھوس حقیقت کا اظہار بیسویں صدی کے آغاز سے ہی ہونے لگا تھا۔ یوں تو ایک برطانوی عہدیدار مسٹر ہیوم کی کوششوں سے انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو عمل میں آچکا تھا جس کا تمام تر مقصد یہی تھا کہ ہندوستانی اہل سیاست سال میں ایک مرتبہ جمع ہوں اور حکومت کو یہ بتائیں کہ انتظامات میں کیا خرابیاں ہیں اور ان کی کیوں کر اصلاح ہو سکتی ہے[۱]۔

سرسید نے مسلمانوں کو اس میں شمولیت اختیار کرنے سے منع کر دیا تھا[۲] اور جب حکومت کو صلاح مشورہ دینے والی یہی جماعت اردو کے خلاف صف آرا ہوئی تو مسلمانوں کا شعور بھی کروٹیں لینے لگا۔ چنانچہ سرسید نے ۱۹۰۱ء میں مسلم قوم کی شکایات کے اظہار کے لئے "محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن" کے نام سے ایک جماعت کا قیام ضروری سمجھا[۳]۔ جب ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا قانون نافذ ہوا تو ہندو بنگالیوں نے محض اس بنا پر اس کی شدید مخالفت کی کہ اس طرح مشرقی بنگال اور آسام کے نئے صوبے میں مسلمان بہ لحاظ تعداد غالب اکثریت کے حامل تھے[۴]۔ کانگریس بھی اپنے ریزولیشنوں میں بڑی

۱۔ سیتارامیا، پٹابھائی: The History of the Indian National Congress، جلد اول، ص ۸ و بعدہ
۲۔ قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۲۲
۳۔ ایضاً، ص ۳۲۸
۴۔ فریزر، لوویٹ: India Under Curzon and After، ص ۳۸۵

بے باکی سے اس کی مخالفت کرتی رہی اور مسلمانوں کے پاس کوئی سیاسی انجمن نہیں تھی جو کانگریس کی مخالفت کا جواب دیتی۔"[۱] چنانچہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ معرض وجود میں آئی[۲]۔ اس طرح بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں دو سیاسی جماعتیں اپنے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے سرگرم عمل ہو گئیں۔ ان سے لامحالہ عوام میں سیاسی شعور کا فروغ ہوا اور ہر اس جگہ جہاں ان کے قومی تشخص، ان کے مذہبی جذبے اور ان کی مجموعی افادیت کو دھچکا لگا ـــــ وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے عملی قدم اٹھانے سے انہوں نے قطعاً گریز نہیں کیا۔

اسی سیاسی کروٹ نے ۱۹۰۶ء میں سودیشی تحریک شروع کی اور غیر ملکی خصوصاً انگلستانی مال کا بائیکاٹ کیا گیا[۳]۔ اس تحریک نے بہت زور پکڑا اور اس کی شدت اس قدر بڑھی کہ حکومت کو ان دکانوں پر پہرے بٹھانے پڑے جہاں انگلستانی مال فروخت ہوتا تھا[۴]۔ مولانا حسرت موہانی نے اس تحریک میں عملاً حصہ لیا اور اس کے مبلغ بن گئے[۵]۔ انہوں نے "سودیشی اسٹور" کے نام سے دیسی کپڑوں کی دکان قائم کی اور اس کی شاخیں ملک میں جا بجا قائم کرنے کا منصوبہ بنایا[۶]۔ مولانا شبلی اور نواب وقار الملک نے اس تحریک کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس کام میں مدد بھی کی[۷]۔

انگریزوں کی اس یقین دہانی کے باوجود کہ تقسیم بنگال ایک طے شدہ قانون ہے حکومت برطانیہ نے ہندوؤں کے دباؤ میں آکر ۱۹۱۱ء میں اسے منسوخ کر دیا[۸]۔ اس سے

---

[۱] ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۵۰

[۲] طوسی، ایم ایس: The Muslim League and Pakistan Movement، ص ۱۴

[۳] ٹامپسن و گیریٹ: Rise and Fulfilment of British Rule in India، ص ۵۹۲

[۴] ایضاً

[۵] مقدمہ کلیات حسرت، ص ۱۲

[۶] عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۴۰۳

[۷] ندوی، سلیمان: یاد رفتگاں، ص ۴۸۲

[۸] نہرو، پنڈت جواہر لال: An Autobiography، ص ۷۶-۷۷

ملّت کے وفادار طبقے کو بڑا دھچکا لگا۔[۱] اب مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کی دغا بازی کھل کر سامنے آگئی۔ حکومتِ برطانیہ کے اس رویے پر نہ صرف مولانا محمد علی جوہر نے نکتہ چینی کر کے[۲] مسلمانوں کے رنج و غم کا اظہار کیا بلکہ نواب وقار الملک نے تنسیخ قانون پر ان کے ردِ عمل کو اس طرح واضح کیا:

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ تقسیم بنگال کی تنسیخ نہایت ناپسندیدہ فعل ہے۔ ان وعدوں کی روشنی میں جو کہ تاج کے مالکوں نے مسلمانوں سے بار بار کئے تھے اور تقسیم بنگال کو ایک طے شدہ حقیقت بتلایا تھا۔ اتحاد بنگال حکومتِ انگریز کی کمزوری کا مظہر ہے اور آئندہ اس سبب اس کے اقوال و افعال پر اعتماد نہ کیا جا سکے گا۔"[۳]

تقسیم بنگال کو منسوخ کر کے حکومتِ برطانیہ جہاں ایک جانب کانگریس کے آگے جھک گئی تھی، وہاں دوسری طرف اس نے مسلمانوں میں اپنے لئے عدم اعتماد کا جذبہ ابھار دیا تھا۔ ناانصافی کے اس عمل نے مسلم طبقے کو آئندہ کے لئے نئی راہ دکھلا دی تھی۔

بنگال کے سلسلے میں انگریزوں کے طرزِ عمل پر مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر ابھی دھیمی بھی نہیں پڑی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔[۴] وہاں کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی داستان جب برعظیم پاک و ہند میں پہنچی تو یہاں ملّتِ اسلامیہ میں اٹلی کے خلاف سخت جوش و خروش پیدا ہو گیا۔[۵] وہاں کے مال کا بائیکاٹ[۶] کیا جانے لگا۔ مجاہدینِ طرابلس کی امداد کے لئے چندے جمع کئے گئے۔[۷]

۱۔ قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ص ۳۴۹

۲۔ ایضاً: ص ۳۵۰

۳۔ منقول ہاشمی، انوار: تاریخ پاک و ہند، ص ۵۰۷

۴۔ ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۶۱

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً: ص ۶۲

ابھی اٹلی اور طرابلس کی جنگ جاری ہی تھی کہ دولِ یورپ نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ بھی اس سازش میں شریک تھا۔[1] اس واقعہ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ برعظیم کے مسلمانوں میں یورپ اور خصوصاً برطانیہ کے خلاف غم و غصے کے جذبات نمایاں ہو گئے۔ اہل ترکی کی امداد کے لئے یہاں سے رقمیں بھیجی گئیں اور وفود روانہ کئے گئے۔ یہی وہ موقع تھا کہ "اسلام کے ملی تصورات کو اپنانے اور تمام مسلم ممالک کے باہمی تعاون سے ایک مضبوط اسلامی اتحاد کی تحریک شروع ہو گئی"۔[2]

اتحادِ اسلامی کے اس جذبے کو فروغ دینے کے لئے مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار"[3]، مولانا محمد علی جوہر نے "کامریڈ"[4] اور مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال"[5] کا سہارا لیا۔ مولانا شوکت علی نے مولانا عبدالباری کے ساتھ مل کر "انجمن خدام کعبہ" قائم کی تاکہ مقامات مقدسہ کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں جانے سے بچایا جائے اور وقتِ ضرورت ہر طرح کی قربانیاں پیش کر کے مسلمانانِ عالم کو متحد کیا جائے۔[6]

ترکی کے واقعات سے برعظیم کے "مسلمانوں پر بہت گہرا اثر پڑا اور برطانیہ پر بھی اس کے طرزِ عمل کی وجہ سے بہت نکتہ چینی ہوئی"۔[7] یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جو "ملتِ اسلامیہ کچھ ہی دن پہلے اپنے شاندار ماضی پر نوحہ خواں تھی اور حال کی زبوں حالی پر تن بہ تقدیر بیٹھی تھی، اس نے نصف صدی گزرنے سے پہلے ہی ترکوں کی تائید میں ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ جن لوگوں نے اس وقت کے حالات دیکھے ہیں، اب بھی ان کے تصور سے ان کے دلوں میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے"۔[8]

ابھی بلقان کا "شور محشر برپا ہی تھا"[9] اور "مسلمانوں کے دل برطانوی وزارتِ خارجہ کی سیاسی روش سے سخت مشتعل تھے"[10] کہ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کے محلّہ

---

۱ ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۶۱
۲ عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۴۰۴
۳ ندوی، سلیمان: مولانا شبلی اردو شاعری کے لباس میں، مطبوعہ کلیات شبلی، ص ۱۴
۴ اقبال، ڈاکٹر افضل: Life and Times of Mohammad Ali، ص ۶۱ و بعدہ
۵ قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۳۶
۶ جوہر، محمد علی: My Life - A Fragment، ص ۵۱-۵۲
۷ قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین: ایضاً، ص ۳۵۰
۸ ریاض، سید حسن: ایضاً، ص ۶۲
۹ ندوی، سید سلیمان: حیات شبلی، ص ۶۰۲
۱۰ ایضاً، ص ۶۰۳

مچھلی بازار میں سرراہ آنے والی مسجد کے ایک حصّے کو منہدم کر کے سڑک تعمیر کی گئی۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا اور ۱۳ تاریخ کو ایک پر جوش مجمع نے جس میں بچے بھی تھے، مسجد کا رخ کیا اور منہدم کی ہوئی دیوار تعمیر کرنے لگا۔ انگریز کمشنر کے ایما پر فوج نے گولی چلادی۔ کئی مسلمان مرد اور بچے شہید ہوئے اور متعدد زخمی ہو گئے۔ "اس خونی سانحہ نے" بقول سید سلیمان ندوی "تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا۔ آتش بیاں مقرّروں، شعلہ افشاں محرروں اور شعلہ نفس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدّوجہد اور آزادی پرستی کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے"۔[1]

اس واقعہ کے اگلے ہی سال پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ برعظیم پاک و ہند نے برطانیہ کے باج گزار کی حیثیت سے اس کی مدد کی اور اسے اپنی مرضی کے خلاف ملکی وسائل کو جنگ میں جھونک دینا پڑا۔ لاکھوں افراد جبریہ بھرتی کے تحت محاذ پر بھیجے گئے۔ اس جذبۂ جاں نثاری کے عوض حکومت نے بہت کچھ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔[2]

برطانوی حکومت کے شوقِ رزم آرائی کی تسکین تو ہو گئی لیکن عوام میں انگریزوں کے خلاف بیزاری اور نفرت کے جذبات نمایاں ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ میثاقِ لکھنؤ نے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کو آزادی حاصل کرنے کی مشترکہ جدّوجہد میں شریک کر لیا۔[3] سارے ملک میں حکومت خود اختیاری (ہوم رول) کی تحریک چل پڑی۔[4]

ادھر عالمی جنگ کے خاتمے پر مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ (۱۹۱۸ء) کی اشاعت اور رولٹ ایکٹ (۱۹۱۹ء) کے نفاذ نے اہلِ ملک کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔[5] اس قانون کے تحت حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ جن لوگوں پر دہشت انگیز سرگرمیوں میں حصّہ لینے پر شبہ ہو ان کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے گرفتار کر لیا جائے۔[6]

---

[1] ندوی، سید سلیمان: حیاتِ شبلی، ص ۶۰۳

[2] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ص ۳۵۵

[3] ہاشمی، انوار: تاریخ پاک و ہند، ص ۵۱۱

[4] سیتارامیا، پٹا بھائی: The History of the Indian National Congress، جلد اول، ص ۱۳۰

[5] قریشی، اشتیاق حسین: ایضاً، ص ۳۵۵

[6] ایضاً

۱۳ راپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں منعقد ہونے والے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے ایک مشترکہ اجلاس پر جنرل ڈائر کے حکم سے فوج نے گولی چلادی۔[1] سینکڑوں نہتے عوام فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ اس واقعہ نے برعظیم میں حصول آزادی کے جذبے کو تیز تر کردیا اور "عوام نے انگریزوں سے گلو خلاصی کے لئے سر توڑ کوشش شروع کردی"۔[2]

آٹھ ماہ بعد اسی شہر امرتسر میں کانگریس، مسلم لیگ اور تازہ قائم شدہ خلافت کانفرنس کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا[3] جس میں "ہندو اور مسلم رہنماؤں کے درمیان ایک مفاہمت ہوگئی جس نے انہیں اس قابل بنادیا کہ وہ برطانیہ کے خلاف ایک عام تحریک منظم کرنے میں باہم تعاون کرسکیں"۔[4]

ناظرین!۔ یہ رہی سیاسی شعور کے احیا کی مختصر سی تاریخ جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۹ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اردو شعرا ہر موڑ پر سیاسی رہنماؤں اور باشعور عوام کے "دوش بدوش ہم نوائی اور رفاقت کے فرض ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں"۔[5] آیئے، ہم ان شاعروں کی انقلابی منظومات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس متحرک اور فعال دور کو یہ کس طرح اپنے فکر و فن کے ذریعے اجاگر کر رہے ہیں اور مجاہدین آزادی کے دلوں میں نغمہ ہائے پرخروش سے کیسا جذبہ پیدا کر رہے ہیں۔

اس دور میں سب سے پہلے ہماری نظر اکبر الہ آبادی پر پڑتی ہے جن کا "ردعمل کی تحریک" کے زیر عنوان ہم ابھی ابھی جائزہ لے چکے ہیں۔ اکبر جہاں ایک طرف مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو پوری شدت و توانائی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے، وہاں برطانوی سیاست پر بھی کاری ضرب لگا رہے تھے۔ یہاں ایک تاریخی حقیقت کی وضاحت ضروری ہے۔ انگریزوں نے برعظیم کے خام مال کو انگلستان میں درآمد کرکے جو مصنوعات بنائیں، ان کی کھپت اسی پاک و ہند میں نہایت آسانی کے ساتھ ہوتی تھی۔[6] اس کی نمایاں وجہ یہ بھی تھی کہ ملک کا مغرب زدہ طبقہ انگریزی مال و

---

۱ قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۵۶
۲ انسائیکلوپیڈیا، اردو، فیروز سنز، ص ۵۱۷
۳ ۲۹ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پیرزادہ شریف الدین، Foundations of Pakistan، جلد اول، ص ۵۰۲ تا ۵۱۰
۴ قریشی، اشتیاق حسین: ایضاً، ص ۳۵۷
۵ حسنی، ڈاکٹر یونس: اختر شیرانی کا عہد، مطبوعہ اردو، کراچی، شمارہ ۱/۱، ۱۹۷۵ء، ص ۹۵
۶ ملک، عبداللہ: بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، ص ۶۱ و بعدہ

اسباب پر جان چھڑکتا اور اس حقیقت کو قطعاً نظر انداز کر دیتا تھا کہ ملکی صنعت و حرفت کے لئے یہ غیر ملکی درآمدات کس درجہ تباہ کن ثابت ہو رہی تھیں۔ اکبر الہ آبادی نے اس رویے اور رجحان پر نہایت پر مغز انداز میں چوٹ کی ہے ؎

چیز وہ ہے جو بنے یورپ میں ___ بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

طرح طرح کے بنا لو لباس رنگا رنگ ___ علاوہ روئی کے ریشم بھی اور وول بھی ہے

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی ___ کہ آنکھ محو ہے، خاطر اگر ملول بھی ہے

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی ___ اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

عزیزانِ چمن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس

چرخہ اور چائے کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے

جب ۱۹۰۶ء میں سودیشی تحریک چلی تو اکبر نے اس کا پوری طرح ساتھ دیا اور اس کے روح رواں حسرت موہانی کو درج ذیل قطعہ لکھ بھیجا ؎

تھا دل حسرت بھرا ارمان میں ___ ہم نے لکھ بھیجا انہیں موہان میں

بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم ___ ہاتھ میں لو اب تجارت کا علم

ہو چکی غیروں سے خوشی کی بہار ___ بس دکھاؤ اب سودیشی کی بہار

کام کو اٹھو چڑھا کر آستین ___ لا یضیع اللہ اجر المحسنین

انہوں نے طنز و ظرافت کے پردے میں مزید ایسی باتیں کہیں جن سے دیسی مال و اسباب کی وقعت و اہمیت اجاگر ہوتی ہے ؎

داخل میری دانست میں یہ کام ہے پُن میں

پہنچائے گا قوت شجر ملک کی بُن میں

تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر

کیا خوب یہ نغمہ چھڑا دیس کی دھن میں

مغرب زدہ افراد اور خود حکومتِ وقت کی نظر میں یہ تحریک خواہ کیسی ہی ہلاکت خیز رہی ہو لیکن اکبر الہ آبادی کو نیکی و خیر کا یہ کام ملکی صنعت و حرفت اور معیشت و بیوپار کو فروغ دینے کا باعث تھی، اور وہ اس پر اپنے دلی اطمینان کا اظہار کرتے ہیں ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی

لبکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

اکبر اگرچہ سودیشی تحریک کے پرزور حامی و مؤید نظر آتے ہیں، لیکن انہیں اس امر کا احساس تھا کہ برطانوی جبر و استبداد کے آگے چند بھیروں کی یہ جرأت کامرانی کی دلیل نہیں بن سکتی۔ نہ صرف حکومت اور اس کے کارندے اس تحریک میں سدّ راہ بنے ہوئے تھے بلکہ ولایتی مال کا شائق طبقہ بھی سودیشی لن ترانی سے خوش نہ تھا۔ اس صورت و کیفیت کی کیسی صحیح ترجمانی اکبر کے اس شعر میں ہوئی ہے ؂

کامیابی کا سودیشی پر پر اک در بستہ ہے

چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

اکبر الہ آبادی کو بقول مولانا عبدالماجد دریابادی یہ احساس تھا کہ "جب تک قوت ہاتھ میں نہیں، زبانی چیخ و پکار، شور و غل، تقریر و محفل طرازی، سب بیکار ہے" [1] ان کے خیال میں سیاسی استحکام کا حصول صرف اپنی قوتِ بازو پر منحصر تھا۔ دیکھئے، اردو کا طنز و مزاح نگار اس سیاسی نکتے کو کتنی سادگی کے ساتھ واضح کر رہا ہے ؂

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ　　　ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

اسی ذہنی رجحان کا نتیجہ ہے کہ جب جنگِ عظیم کے دوران ترکی کے ایک علاقے.... سالونیکا پر حریفوں کا قبضہ ہو گیا تو اکبر الہ آبادی نے نہ صفِ ماتم بچھائی، نہ آہ و فغاں بلند کی، بلکہ ہنسی ہنسی میں ترکوں کو جرأت و عزم کا سبق دے گئے ؂

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں

ملحوظ رکھے دنیا اس رشتۂ بہم کو

پھر کر کے اس پہ قبضہ کہدیں یہ ترک ان سے

سالونیکا سے اب تو سالو نکالو ہم کو

تیسرے مصرعے میں کھوئے ہوئے علاقے پر دوبارہ قبضہ کرنے کا جذبہ اور چوتھے میں

---

[1] دریابادی، مولانا عبدالماجد: مقالات ماجد، ص ۵۱

"تسالو انکالو ہم کو" کے ذریعے بلند حوصلگی اور جرأت و بے باکی کا اظہار — یہ دونوں خصوصیات اکبر کی سیاسی بصیرت کی دلیل ہیں۔

جب قوم دامے درمے سخنے ممالک اسلامیہ کا تحفظ چاہ رہی تھی — اکبر کچھ اور ہی مشورہ دے رہے تھے ؎

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ

کچھ بھی نہیں تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

اکبر قوم میں عزم و عمل کے فقدان پر سخت نالاں اور برہم تھے۔ وہ مسائل کا حل تحریر و تقریر اور ریزولیشن کو قطعاً نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے سامنے مسجد کانپور کا واقعہ تھا۔ مولانا آزاد سبحانی اپنی ولولہ انگیز تقریر کی وجہ سے حوالات میں بند کر دیے گئے تھے[1] مجاہدین کی ایک جماعت منہدم دیوار کی دوبارہ تعمیر کے دوران شہید کر دی گئی — اور ادھر برعظیم کے جملہ سیاسی زعما ریزولیشن کے ذریعے حکومت برطانیہ کو راہ راست پر لانے میں مصروف ہو گئے[2] اس واقعہ کے اظہار میں اکبر کا زعمائے ملت پر گہرا طنز بھی پوشیدہ ہے اور انگریزوں کے ظلم و جور کی حقیقت بھی مضمر ہے ؎

بھائی صاحب تو ادھر فکر مساوات میں ہیں

شیخ صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں

قوم کے حق میں انجمن کے سوا کچھ بھی نہیں

حرف آخر کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں

سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف

اک ہمیں اس ریزولیشن کے خرافات میں ہیں[3]

اردو شعر و ادب میں اکبر الہ آبادی کو محض سرسید کا ایک مخالف بنا کر پیش کیا

---

[1] ریاض سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۶۲

[2] وائسرائے کونسل کے ممبر اور پٹنہ کے مشہور بیرسٹر مظہر علی امام اس معاملے میں پیش پیش تھے۔
بحوالہ ندوی، سید سلیمان: حیات شبلی، ص ۶۰۷

[3] مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ "حضرت اکبر نے یہ اشعار ۱۹۱۳ء میں حادثہ مسجد کانپور کے بعد ہی موزوں کیے تھے اور فوراً ایک گرامی نامے میں بھی تحریر فرمائے تھے"۔ مقالات ماجد ص ۵۱

گیا ہے، اور ان کی اس صلاحیت و خصوصیت کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی جس کی جانب سید احتشام حسین یوں اشارہ کر گئے ہیں:

"جس طرح اکبر نے سیاسی حالات کو سمجھا تھا اس طرح
کم لوگ سمجھتے ہیں اور جس طرح انہوں نے ان مسائل کو اپنی
شاعری کا جزو بنایا، اس طرح اور کوئی نہ بنا سکا۔"[1]

اب آئیے مولانا شبلی نعمانی کی طرف! — ان کی سیاسی شاعری بیسویں صدی کے سیاسی شعور کے احیا کے ساتھ ساتھ ابھرتی ہے۔ برعظیم اور دیگر اسلامی ممالک میں رونما ہونے والے واقعات سے وہ بے حد متاثر تھے اور "ہر ہفتہ جو واقعہ پیش آتا تھا، اس پر وہ اس طرح اشعار میں اظہار خیال کرتے تھے کہ اس زمانے کے بچہ بچہ کی زبان پر وہ اشعار چڑھ جاتے تھے"[2] اس نوع کی نظموں میں بلا کا درد و اثر، غضب کا جوش بیان اور بے پناہ صداقت و واقعیت کی آمیزش ہے۔ ہنگامۂ طرابلس و بلقان سے متاثر ہو کر انہوں نے "شہر آشوب اسلام" لکھا اور اسے "لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں جو ٹرکی کی فراہمی چندہ کے لئے ہوا تھا، پڑھی تھی۔ خود بھی روئے، دوسروں کو بھی رلایا"[3] چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

شبلی نے اس طویل نظم میں اہل یورپ سے بیداد و بلا اور یورش و حملہ کے سلسلے میں باز پرس کر کے بڑی جرأت و بے باکی کا اظہار کیا ہے۔ اس میں طنز کی گہرائی اور

---

[1] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۱۹۰
[2] ندوی، سید سلیمان: مولانا شبلی اردو شاعری کے لباس میں، مطبوعہ کلیات شبلی، ص ۱۴
[3] ایضاً: حیات شبلی، ص ۵۹۴ - ۵۹۵

اور نشتر کی تیزی قابل غور ہے ؎

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوش انگیزیٔ طوفانِ بیداد و بلا تا کے
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

بلاد یورپ (اس میں برطانیہ بھی شامل ہے) اپنے معیشی استحکام اور فروغ اقتدار کے لئے ممالک اسلامیہ کو جس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھے' اس پر شبلی یوں تلملا کر چوٹ کرتے ہیں ؎

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خوں سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہونگے زرفشاں کب تک

مولانا کو اس جنگ کے در پردہ عیاش اقوام کا وہ رجحان صاف نظر آرہا تھا کہ وہ ترکی کے خاتمے کو اسلام کا خاتمہ سمجھتے تھے۔ مذکورہ شہر آشوب میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے دنیا بھر کے مسلمانوں کو یوں خبردار اور متنبہ کیا ہے ؎

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک
زوالِ دولتِ عثمان زوال شرع و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ طیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کب تک

واضح رہے کہ حکومت برطانیہ برعظیم پاک و ہند میں نہ صرف اپنی تہذیب و روایات کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی بلکہ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعے کلیسا کا ناقوس بھی پھونک رہی تھی۔ شبلی نے زیر سایۂ برطانیہ رہ کر انگریزوں کی اس مخفی اسکیم کو طشت از بام کر دیا ہے جس کا اطلاق ترکی کے علاوہ پاک و ہند پر بھی ہو رہا تھا۔ اس نوع کے خیال کے اظہار کے لئے سیاسی بصیرت اور جذبۂ آزادی ہی درکار تھا۔

شبلی کی مذکورہ نظم کے اثر و مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے خواجہ کمال الدین کو لندن میں تڑپایا اور اسلامک ریویو کے نکالنے کے محرکات میں یہ بھی تھی[1]۔

بلقان کی جنگ میں زخمی ہونے والے مسلمانوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے ایک طبی وفد ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں بھیجا گیا تھا[2]۔ جب یہ واپس آیا تو بمبئی میں ایک استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا گیا[3]۔ مولانا نے اس موقع پر نہایت پر درد نظم پڑھی تھی۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف ترکی کی المناک داستان سامنے آتی ہے، بلکہ برعظیم کے مسلمانوں کے دلی جذبات و احساسات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں سہ

تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغرب کے یہ نئے قانون بھی دیکھے ہیں
مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں

---

[1] ندوی، سید سلیمان: حیاتِ شبلی، ص ۵۹۵
[2] ایضاً، ص ۵۹۶
[3] ایضاً، ص ۵۹۸

تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں

شہیدانِ وفا کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر

زمیں پر پارہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

اس داستانِ خونچکاں کو سنانے کے بعد بھی شاعر ترکی کے مستقبل سے مایوس نہیں دکھائی دیتا اور وہ ۱۹۲۰ء میں اس اسلامی ملک کے متعلق جو پیش گوئی کر رہا ہے، وہ چند ہی سال بعد کمال اتاترک کی بدولت سچی ثابت ہوئی۔ روشن مستقبل پر مبنی یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی

تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

شبلی نعمانی مسجد کانپور کے حادثے سے بے حد دل گرفتہ ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے دلی رنج و تعجب کا اظہار مختلف نظموں میں کیا ہے۔ یہ شہیدوں کا نوحہ ہی نہیں، انگریزوں کے خلاف غم و غصے کا اظہار بھی ہے۔ مزید براں، شبلی نے مسلمانوں کے جذبۂ دروں کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ یہ تاریخی واقعہ تاریخ ادب اردو کا بھی ایک بابِ جاں گداز بن گیا ہے۔ یہ نظمیں شاعر کی اسلام دوستی اور وطن پروری کو واضح کر رہی ہیں۔ ان کے پس پردہ اس کے سیاسی افکار متحرک نظر آ رہے ہیں ؎

پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں

یہ زیور سیدِ سجادِ عالی کی وراثت ہے

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے

عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں

کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

حادثہ کانپور میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے جاں بحق ہو جانے کی کیفیت کو شبلی نے درج بالا تیسرے شعر میں جس فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے، یہ ان کے شاعرانہ کمال کی دلیل ہے۔

ایک ہی سال کے عرصے میں ترکی اور کانپور کے اہم واقعات کچھ اس طرح ظاہر ہوئے کہ برعظیم کے مسلمانوں کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ ایک طرف اتحادِ اسلامی کو پارہ پارہ کرنے کی یورپی سازش سرگرم عمل تھی تو دوسری جانب مسلمانانِ ہند کے اسلامی جذبے کو کچل کر حکومتِ برطانیہ کے وقار کو سربلند رکھنے کا رجحان کارفرما تھا۔ شبلی نے ان دونوں واقعات کو درج ذیل دو شعر میں کچھ اس طرح سمیٹا ہے کہ درد و اثر کی لہر آج بھی ذہن کے تاروں کو مرتعش کر رہی ہے ؎

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقاں سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں
کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

شبلی نے بلقان و کانپور کے واقعات پر اپنے دلی تاثرات کا اظہار کرنے کے علاوہ ملک کے سیاسی حالات و کوائف پر بھی وقتاً فوقتاً نظمیں لکھی تھیں اور حکومتِ وقت کے متعدد افعال و احکام پر سخت لہجے میں طنز کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مثلاً کانپور کے مسلمانوں پر فائرنگ کا حکم اور شبلی کا یہ اندازِ احتجاج ؎

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
کہ ہر اک شہر میں آپ کے انصاف کی ہے دھوم
یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بھر گیا ہجوم
پابہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی
اور پولیس کو یہ تھا عذر کہ "ہم ہیں محکوم"
واقعہ یہ ہے غرض کوئی نہ مانے نہ سہی
آپ ظالم نہیں زنہار یہ ہم ہیں مظلوم

کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ ہی وہ جماعت تھی جو مسلمانوں کے درد و غم کا مداوا کر سکتی تھی اور ان کے مطالبات حکومتِ انگلشیہ کے سامنے پیش کرنے کی اہل تھی۔ شبلی اس جماعت سے خطاب کر کے سیاسی رہنمائی کا حق ادا کر رہے ہیں ؎

معاملاتِ حکومت میں دیجئے کچھ دخل
یہ کیا کہ قصۂ یار بنۂ وفا کہیے

عدالتوں کی پریشانیاں بیاں کیجیے

فسانۂ ستم و جورِ ناروا کہیے

درازدستیٔ پولیس کا کیجیے اظہار

مقدمات کے حالات غم فزا کہیے

گزر رہی ہے یہ جو کچھ کہ کاشتکاروں پر

یہ داستانِ الم ناک و غم فزا کہیے

سنائیے انہیں کچھ بحر قہر و جبر کا حال

پھر اس کے بعد ستمہائے ناخدا کہیے

درج بالا اشعار کو پڑھنے کے بعد ناظرین نے محسوس کر لیا ہوگا کہ غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ برطانوی حکومت کا رویہ کیسا تھا، وہ کیسے کیسے ظلم و جور کا نشانہ بن رہے تھے اور ان کے کاشتکاروں پر کیا کچھ بیت رہی تھی۔ شبلی نے یہ اشعار لکھ کر نہ صرف انتظامیہ کی قلعی کھول دی ہے، بلکہ مسلم لیگ کو حوصلہ بخشا ہے کہ وہ مسلم طبقے کا تحفظ کرے۔ سیاسیات کے موضوع پر مبنی یہ نظم جو بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے دوران کہی گئی" اردو شاعری کو حددرجہ فعال بنا رہی ہے۔

مولانا شبلی کی آخری سیاسی نظم "جنگ یورپ اور ہندوستان" ہے جو جنگ عظیم کے موقع پر اگست ۱۹۱۴ء میں کہی گئی تھی[۱] اسے یہاں پیش کرنے سے قبل مشہور فرانسیسی مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کا ایک جملہ نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"ایک یورپی قوم اپنے ایک ہزار اعلیٰ منتخب افسروں اور تقریباً اسّی ہزار سپاہیوں کے ذریعے سے ایک ایسے وسیع و دور دراز ملک پر کامیابی سے حکومت کر رہی ہے جس کی آبادی تیس کروڑ تک پہنچتی ہے"۔[۲]

بیرونی مورخ کی اس رائے کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم شبلی نعمانی کی مذکورہ

---

[۱] نعمانی، شبلی: کلیاتِ شبلی اردو، ص ۱۰۳

[۲] بان، ڈاکٹر گستاؤلی: تمدنِ ہند، اردو ترجمہ سید علی بلگرامی، ص ۹

نظم پڑھتے ہیں تو ان کے سیاسی فہم و ادراک کا قائل ہو جانا پڑتا ہے ؎

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور
آساں نہیں فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل
آئین نشناسیِ شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعوے غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں

یہ تیر جو شبلی کی کمان سے نکلا تھا، ٹھیک نشانے پر جا کر بیٹھا۔ یہ نظم لکھنے پر حکومت برطانیہ نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا[1] جب تک کہ حکم کی تعمیل ہو، وہ خود زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے[2]

اب آیئے اقبال کی طرف جو اگرچہ ابتدا میں ایک وطن پرست شاعر کی حیثیت سے ابھرے تھے، لیکن ان کا یہ رنگ عارضی تھا۔ یورپ کے دورانِ قیام انہوں نے مغربی تہذیب و افکار کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی تھی کہ وطنیت کے نظریے کو فروغ دینے میں یورپ کا زبردست ہاتھ ہے۔ اس امر کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں:

"مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ

---

[1] ندوی، سید سلیمان: حیاتِ شبلی، ص ۶۳۷
[2] ایضاً

ہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت
کی جائے۔"[1]

"اہل مغرب کی یہ تحریک دراصل ایشیائی قوموں میں امتیاز رنگ ونسل پیدا کرنے کے مترادف تھی۔" اس قومی و وطنی جذبے میں حق و باطل کی تفریق باقی نہیں رہی تھی"[2] اقبال اسی قیام یورپ کے زمانے میں پان اسلامک سوسائٹی کے زیر اثر آئے اور اس کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔[3]

یورپ سے واپسی پر وہ بین الاسلامی تحریک کے ممتاز قائد جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد علامہ علی بروہی سے اکثر ملتے رہے اور ان کے خیالات سے متاثر ہوئے۔[4] مزید براں، انہوں نے جمال الدین افغانی کے نقطہ نظر کے مطابق مکہ معظمہ کو دارالاسلام کے مرکز کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔[5] چنانچہ جب طرابلس پر اٹلی کا حملہ ہوا تو اقبال بھی اس سے متاثر ہوئے — مگر انہیں "ان مظالم کے چڑھتے ہوئے دریا کا اترنا ضرور نظر آ رہا تھا"[6] اور انہوں نے اس کا اظہار اسی دور میں لکھی جانے والی نظم "شمع و شاعر" میں اس طرح کیا تھا۔

دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

اس شعر کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی رائے تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جنگ عظیم کی تباہی کے بعد
جب ترکوں نے اپنی حالت درست کی اور فرنگیوں کے

---

۱ اقبال: حرف اقبال، مرتبہ لطیف احمد شیروانی، ص ۲۲۶
۲ قریشی، شفاء الملک محمد حسن: اقبال اور تحریک اتحاد اسلامی، مطبوعہ مقالات یوم اقبال ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۲
۳ ایضاً، ص ۱۰۳
۴ ایضاً، ص ۱۰۴
۵ عبدالحکیم خلیفہ: فکر اقبال، ص ۵۷ وبعدہ
۶ خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر، مطبوعہ صریر خامہ، ص ۲۴

مظالم ختم ہونے لگے تو فرمایا ؎

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ"[1]

جنگ طرابلس سے متاثر ہو کر اقبال نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "حضورِ رسالتمآب میں" لکھی اور اسے شاہی مسجد لاہور میں پڑھی تھی[2] چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں ۔۔۔ وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں ۔۔۔ جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں ۔۔۔ طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مسلمانانِ ہند پر اس نظم کا جو ردِ عمل ہوا اسے شفاء الملک محمد حسن قرشی کی زبانی سنیئے:

"ہزاروں اشخاص بے قرار و اشکبار تھے۔ سب کی آرزو
یہ تھی کہ اس پیش کش میں ان کا خونِ گرم بھی شامل ہو۔"[2]

مسلمانوں کے منجمد خون کو گرم کر دینا ہی دراصل اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔

اقبال کی دوسری نظم فاطمہ بنت عبد اللہ کے متعلق تھی جو طرابلس کے مجاہدوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی۔ اس چودہ سالہ عرب لڑکی کو خراج عقیدت پیش کر کے اقبال نے فی الواقع مسلمانوں کو اس امر کا احساس دلایا ہے کہ ان کی خاکستر میں ایسی چنگاری اب بھی فروزاں ہے جو دشمنوں کی قوت و توانائی کو جلا کر ختم کر سکتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

---

1. خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: کلام اقبال کا تاریخی و سیاسی پس منظر، مطبوعہ صریر خامہ، ص ۲۴
2. قرشی، شفاء الملک محمد حسن: اقبال اور تحریک اتحاد اسلامی، مطبوعہ مقالات یوم اقبال، ص ۱۰۶

اس شہادت کے پس منظر میں ابھرنے والی عزم و حوصلے کی نئی تحریک اقبال کو صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کی بشارت تمام عالمِ اسلام کو ان اشعار کے ذریعے دے رہے ہیں ؂

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

یہ قومِ تازہ بلادِ اسلامیہ میں عموماً اور برعظیم پاک و ہند میں خصوصاً جو کارہائے نمایاں مستقبل قریب میں انجام دینے والی تھی، وہاں تک نظرِ اقبال کے سوا کسی اور کی کیوں کر پہنچ سکتی تھی۔

ممالکِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے کی جو سازش بلادِ مغرب میں ہو رہی تھی، اس سے اقبال مطلق ہراساں نہ تھے۔ ظلم و ستم کا یہ منظر ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی نظر میں سلسلۂ جور و جفا محض عارضی تھا۔ انہیں تو ملّت کے مقدر کا ستارہ چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جوشِ کارزار ان کو فتحِ کامل کی یوں خبر سنا رہا تھا ؂

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملّت کے مقدّر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

لیکن اقبال صرف شاندار اور روشن مستقبل کی بشارت ہی نہیں دیتے، وہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور ان میں جہد و عمل کا جذبہ ابھارنے کے آرزومند بھی تھے۔ ان کے خیال میں یہی وہ تاب و توانائی تھی جس کے فروغ میں ملّتِ اسلامیہ کی بقا و سالمیت مضمر تھی اور وہ اسی کے سہارے استعماری قوتوں

سے نبرد آزما ہو سکتے تھے۔ اقبال کے اس دور کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جو اس نوع کے خیالات پر مبنی ہیں۔ مثلاً ؎

مسلم خوابیدہ اٹھ! ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق، گرم تقاضا تو بھی ہو
ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جنگ ہائے طرابلس و بلقان کے حوادث سے متاثر ہو کر کہی گئی ان نظموں میں بیداری کا پیام ہے، جہد و عمل کا درس ہے اور مستقبلِ حسین کی بشارت ہے۔ "ان کا ایک ایک مصرع مسلمانانِ ہند کے ان جذبات کا آئینہ دار ہے جو اس زمانے میں جوش و خروش کے کمال تک پہنچ گئے تھے"۔[۱] اقبال نے اس پر آشوب وقت میں قوم کے حوصلے کو بلند رکھا ہے اور اسے "مضبوط بن کر ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جانے کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں"۔[۲]

---

[۱] سالک، عبدالمجید: ذکرِ اقبال، ص ۱۰۱
[۲] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۱۹۳

اقبال کے تذکرے کے اختتام پر ان کی دو نظموں کا ذکر ناگزیر ہے جن کا براہ راست تعلق مولانا محمد علی جوہر سے ہے۔ واضح رہے کہ مولانا نے قوم میں سیاسی شعور کو بیدار کرنے کے لئے صحافت کا راستہ بھی اختیار کیا تھا۔ ان کے انگریزی اخبار "کامریڈ" نے اپنے مسلسل پرجوش مقالات سے مسلمانوں کے علم طبقے میں پہلی مرتبہ بیداری اور خودداری کا احساس پیدا کیا تھا۔[1]

سیاسی بیداری کا یہی احساس وہ اردو اخبار "ہمدرد" کے ذریعے بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔[2] یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ "اخبار نکالتے وقت تجارتی پہلو نام کو بھی پیش نظر نہ تھا"۔[3] علامہ اقبال جوہر کے ان صحافتی عزائم سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ جب "ہمدرد" کے اجرا کے موقع پر ان سے پیغام کے لئے کہا گیا تو اقبال نے سات اشعار پر مشتمل ایک نظم[4] مولانا کو بھیج دی جو تاخیر سے موصول ہونے کے سبب ۲۵ فروری ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔[5] شاعرانہ حسن و دلآویزی سے مرصع یہ نظم قوم کے لئے پیغام رحیل سے کم نہیں۔ اس میں زندگی کے مصائب کو برداشت کرتے ہوئے اور جملہ رکاوٹوں سے برد آزما ہوتے ہوئے آزادی حاصل کرنے کی جو تلقین رمز و کنایے کے انداز میں کی گئی ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اقبال "ہمدرد" کے توسط سے اپنا یہ پیغام اس قوم کو دے رہے تھے جو جنگ ہائے طرابلس و بلقان کے صدموں سے چور چور تھی اور ملک کے ناساعد حالات نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ چند اشعار کے مطالعے سے ہی اس نظم کی قدر و قیمت واضح ہو جاتی ہے ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں	تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی	انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو	کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

---

[1] عبدالماجد دریابادی: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۱۱
[2] برنی، ضیاء الدین احمد: عظمت رفتہ، ص ۴۹ - ۵۰
[3] عبدالماجد دریابادی: ایضاً، ص ۱۶۱
[4] یہ نظم پھول کے عنوان سے بانگ درا میں درج ہے۔ ص ۲۸۱
[5] برنی، ضیاء الدین: ایضاً، ص ۵۰

چمن میں غنچہ وگل سے یہ کہہ گئی شبنم   مذاقِ جور گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے

اقبال کی دوسری نظم کا تعلق اس موقع سے ہے جب دسمبر ۱۹۱۹ء میں پانچ سال قید سے رہائی پانے کے بعد مولانا محمد علی جوہر سیدھے امرتسر پہنچے تھے[1] تاکہ مسلم لیگ، کانگریس اور خلافت کے مشترکہ اجلاس میں شریک ہوں۔ علامہ اقبال بھی اس جلسے میں شرکت کے لئے لاہور سے امرتسر روانہ ہوئے اور دورانِ سفر چند اشعار موزوں کئے جنہیں وہاں جا کر سنائے[2]۔ اقبال نے اپنی اس مختصر سی تاریخی نظم میں "اسیری" کے فلسفے پر روشنی ڈال کر اس کی قدر و اہمیت کو واضح کیا ہے۔ بادی النظر میں وہ مولانا محمد علی جوہر کے مقام و مرتبے کو اجاگر کر رہے ہیں۔ اشعار درج ذیل ہیں ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند[3]

مولانا ظفر علی خاں (م: ۱۹۵۶ء) اس دور میں ایک سرگرم مجاہد کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اخبار "زمیندار" کے توسط سے ہر سیاسی واقعہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ "ان کے دل میں قوم کا سچا درد تھا۔ مسلمانوں کی ہر مصیبت میں کام آتے، ہر آگ میں کود پڑتے اور اپنی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے سے بے شمار ساکن فضاؤں میں تلاطم برپا کر دیتے"[4]۔

ظفر علی خاں کی نثری تخلیقات کے ساتھ ساتھ ان کی شعری تخلیقات بھی

---

[1] مولانا شوکت علی بھی ان کے ہمراہ وہاں پہنچے تھے۔
[2] سالک، عبد المجید: ذکر اقبال، ص ۱۰۶
[3] منقول ایضاً، ایضاً
[4] قریشی، محمد عبداللہ: اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر، مطبوعہ "نقوش" لاہور (طنز و مزاح نمبر) ص ۷۷۸

قوم کے مجموعی جذبات و محسوسات کی ترجمان ہیں۔ ان کے زورِ قلم سے ہر روداد سیاست تاریخی اہمیت کی حامل بنتی چلی گئی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگ سے متاثر ہو کر مولانا نے جو کچھ بھی لکھا، اس میں ان کے جذبۂ ایمانی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ یورپ کی استعماری قوتوں سے اسلامی ممالک کا جو حشر ہو رہا تھا، اس کا نقشہ وہ جس طرح پیش کرتے ہیں، وہ بے حد اثر انگیز ہے۔ ظفر علی خاں کی نظمیں جب آج ہمارے دیدہ و دل پر کیف و اثر کی فضا طاری کر دیتی ہیں تو اس دور میں ان کی اثر انگیزی کی کیا حد رہی ہوگی جب واقعۂ خونچکاں مسلمانانِ ہند کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا ہوگا۔ یورپ کے خلاف ان کے دلوں میں غم و غصے کے جذبات کو مشتعل کرنے میں مولانا کے کلام نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ آئیے ان کی شعلہ بار نظموں کے کچھ حصے پڑھ کر احیائے شعور کے دور کو تازہ کر لیا جائے ؎

ترک کے طرّۂ طرار کا جھک جھک جانا
چاک دامانِ عرب تا بہ گریباں ہونا
خاک کا ورنہ وطرودق کے سر پر اڑانا
خوں میں مشہد و تبریز کا غلطاں ہونا
مصر کے سینۂ صد چاک کے پرزے اڑانا
ہند کے دیدۂ نمناک کا طوفاں ہونا
صفِ ماتم ادھر ایران کے اندر بچھنا
اور مراکش میں ادھر حشر کا ساماں ہونا
یہ مسلماں ہیں اس جرم میں گردن زدنی قتل
دست بلقان میں یورپ کا یہ فرماں ہونا

ظفر علی خاں ایک سچے مومن کی حیثیت سے اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ اگر مسلمانوں میں وہی جذبۂ ایمانی پیدا ہو جائے اور ان کے جسم و جان میں جہاد کی برق پاش لہریں موجزن ہو جائیں تو پھر فضائے بدر کی شان نمایاں ہو سکتی ہے اور غیبی امداد کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے۔ اس اسلامی جنگ کی یاد دلا کر انہوں نے باری النظر میں مسلمانوں کو اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی پر ہراساں ہونے سے بچایا ہے اور ان کی قوتِ عمل کو تیز تر کر دیا ہے۔ ان خیالات پر مبنی مندرجہ ذیل دو اشعار مسلمانوں

کے لئے رجز کا درجہ رکھتے ہیں ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی
وہی ہے رشتہ جس نے ترک کا افغان سے جوڑا
وہی ہے ان کے اعداء کو جو کر سکتا ہے خوار اب بھی

ہم نے زیر نظر باب کی ابتدا میں جلیانوالہ باغ کے خونیں سانحہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس واقعہ سے سارے برعظیم میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ظفر علی خاں نے اس واقعہ کو انقلاب سے تعبیر کیا ہے جس کے جلو میں آزادی کا کاروان بعزم و حوصلہ رواں دواں ہوتا ہے۔ اس موضوع پر لکھی ہوئی ان کی نظم ہماری جدّوجہد آزادی کی شاعری میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے اہل وطن کو ان کی بے مثال قربانی پر نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ بہنے والے خون کے قطروں کو قصر آزادی کی آرائش کا سامان قرار دیا ہے۔ اس ولولہ انگیز نظم "عزتِ قومی" کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

زندہ باد اے انقلاب اے شعلۂ فانوس ہند
گرمیاں جس کی فروغ محفلِ جاں ہو گئیں
بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی تاریکیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہو گئیں
جن ملاؤں سے گھرے رہتے تھے صبح و شام ہم
تیرے آتے ہی وہ انگریزوں کی درباں ہو گئیں
جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی
قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں
مرحبا اے نوگرفتارانِ بیدادِ فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں

جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعے کے بعد پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا جس

میں عوام اور طالب علموں سے نہایت وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا[1] مولانا نے انگریز جنرل اوڈائر کے گوناگوں مظالم کو طنزیہ و مزاحیہ انداز میں پیش کر کے اپنی جرأت و بے باکی کا ثبوت دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے "سانحاتِ پنجاب" کے عنوان سے مولانا کی نظم کے منتخب اشعار؎

ایک تو آماس کی ناک بھی پر جائے چڑھ
کھائیے ہر روز صبح و شام ہنٹر آپ بھی
ناک سے کچھ دن زمیں پر کھینچتے رہیے لکیر
پھیرئیے کوچی سفیدی کی بدن پر آپ بھی
بعد مغرب جائیے مسجد کو اور اس جرم میں
پیٹھ پر کھنچوائیے چابک سے سطر آپ بھی
چلئے سولہ میل دن میں ہانپتے اور کانپتے
پاؤں میں کچھ روز ڈالے رہیے چکر آپ بھی
بسئے جا کر جیل میں اور کھائیے ارہر کی دال
میہمان رہیے ذرا سرکار کے گھر آپ بھی
پھر یہ کہیے مارشل لا حشر تک قائم رہے
ورنہ ہوں گے منکر جنرل اوڈائر آپ بھی

اپنی ایک دوسری نظم میں ظفر علی خاں جنرل اوڈائر کو ہلاکو سے بھی زیادہ ظالم اور ستمگر قرار دے رہے ہیں؎

ہلاکو کو عبث تاریخ میں بدنام کرتے ہیں
بچارے نے نہتے پر دیا کب حکم فائر کا
مسلماں اور ہندو کو بھی ہے ناز اپنے سینے پر
اسے گر غرہ ہے بارود گولی کے ذخائر کا

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جنرل اوڈائر کے وحشیانہ سلوک سے پورے

---

[1] سالک، عبدالمجید: ذکر اقبال، ص ۱۰۳

ملک میں بلا امتیاز مذہب و ملت احتجاج اور تنفر کا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔[۱] دسمبر ۱۹۱۹ء کے اجلاس امرتسر میں ہندو اور مسلمان قائدین نے مشترکہ طور پر مطالبہ کیا تھا کہ اس خونیں حادثے اور مارشل لا کے نفاذ کے سلسلے میں جو افسران مرتکب ہوئے تھے اور جو قتل و خون ریزی اور ظلم و جفا کے ذمہ دار تھے، انہیں قرار واقعی سزائیں دی جائیں۔[۲] لیکن اس مطالبے کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور برطانوی حکومت نے متعلقہ افسروں کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی تو ملک بھر میں بددلی پھیل گئی اور ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون یا ترک موالات کی تحریک کا اعلان کر دیا گیا۔[۳]

سیاسی بیداری کا یہ دور اپنے جلو میں عظیم المرتبت اور ہمہ گیر شخصیتوں کو لے کر آگے بڑھا ہے۔ ان ہی میں مولانا محمد علی جوہر (م: ۱۹۳۱ء) بھی تھے جو ایک طرف مجاہدوں کے قافلہ سالار تھے تو دوسری جانب جنگ آزادی کے شعلہ نوا شاعر بھی۔ انگریزی علم و ادب میں ید طولیٰ رکھنے کے باوجود وہ انگریزوں سے اس قدر بیزار و متنفر ہوئے کہ ان کی تمام زندگی برطانوی استبداد سے معرکہ آرائی میں گزر گئی۔[۴]

اگرچہ مولانا کی سیاسی شاعری کے جوہر چھنڈواڑہ کی پانچ سالہ نظربندی کے دوران چمکے[۵]، لیکن اس طرز سخن کا آغاز ۱۹۰۷ء میں ہو چکا تھا۔ علیگڈھ کے طلبا نے اسی سال انگریز اساتذہ کے خلاف اسٹرائک کر رکھی تھی۔ ادارہ بند تھا اور اس کے سربراہان حیران و پریشان تھے۔[۶] اس موقع پر مولانا نے سرسید کی روح سے مخاطب ہو کر جو نظم پڑھی تھی، وہ علیگڈھ کے بدلے ہوئے ماحول، قومی شعور کے

---

[۱] سالک، عبد المجید: ذکر اقبال، ص ۱۰۳ و بعدہ

[۲] ایضاً، ص ۱۰۴ نیز پیرزادہ، شریف الدین: Foundations of Pakistan جلد اول ص ۵۳۷

[۳] ایضاً، ص ۱۰۶

[۴] تفصیل کے لئے: اقبال، افضل: Life and Times of Mohammad Ali

نیز دریابادی، عبد الماجد: محمد علی ذاتی ڈائری

[۵] دریابادی، عبد الماجد: مقالات ماجد، ص ۱۹۷

[۶] ایضاً، ص ۲۰۲

احیا اور نئی نسل کے انقلابی رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ اس کے پس پردہ جوہر[1] کا انقلابی شعور بھی کارفرما ہے۔ اس یادگار نظم پر ایک نظر ڈال کر ہم ان کے ۱۹۱۲ء کے کلام کا جائزہ لیں گے ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی، گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڈھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جابجا تم ہو
سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اسکی ابتدا تم ہو
تمہیں ہو زندۂ جاوید باقی جانے والے ہیں
نمونہ ہیں فنا کا ہم تو تمثیل بقا تم ہو

اس نظم میں بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "ناز بھی ہے اور نیاز بھی، شوخی اور مستی بھی ہے اور درد و گداز بھی"[2] اسے ہم جوہر کی سیاسی شاعری کا پیش خیمہ قرار دے سکتے ہیں۔

مولانا کی عملی سیاست کا آغاز صحیح معنوں میں ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کی تاریخ سے ہی ہوتا ہے جب کامریڈ کا پہلا پرچہ شائع ہوا[3] تقسیم بنگال کی تنسیخ پر نکتہ چینی کرکے وہ حکومت کی نظر میں غیر مقبول ہو گئے تھے[4] دوسرے ہی سال طرابلس اور بلقان کی جنگ چھڑ گئی اور مولانا "ترکی کی ہمدردی میں اس قدر پیش پیش تھے"[5] کہ چندے

---

[1] مولانا اسی کالج کے گریجویٹ تھے۔ دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۲

[2] دریابادی، عبدالماجد: مقالات ماجد، ص ۱۰۳

[3] برنی، ضیاءالدین احمد: مولانا محمد علی، مطبوعہ نقوش (شخصیات نمبر ۲) لاہور ۱۹۵۶ء ص ۱۱۵۹

[4] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۵۰

[5] دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۱۸

کی فراہمی سے لے کر طبی وفد روانہ کرنے کی مہم[1] میں یہی نمایاں نظر آتے ہیں۔

جب ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کا واقعہ پیش آیا تو مولانا نے یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس میسٹن کے مشورے کو نظرانداز کرتے ہوئے اس قضیے میں سرگرمی سے حصہ لیا،[2] اور اپنے اخبار "کامریڈ" میں نہ صرف برطانوی حکومت کے خلاف احتجاجی اور تنقیدی مضامین لکھے بلکہ مذکورہ گورنر کی بھی خوب خبر لی[3]۔ یہ بات اسے ناگوار گزری اور وہ ان کے خلاف ہوگیا۔ گویا محمد علی جوہر کی "بڑھتی ہوئی سیاسی آزادخیالی اور ترکوں سے روزافزوں ہمدردی دیکھ کر انگریز کھٹک گئے تھے"[4]۔

محمد علی سے انگریز حکمران کی ناراضگی کا یہی وہ پس منظر تھا کہ ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ شروع ہوگئی اور ترکی جرمنی کا حلیف بن کر برطانیہ کے مدمقابل آگیا۔ اس موقع پر لندن "ٹائمس" میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں ترکی کے اس رویے پر سخت برہمی کا اظہار کیا گیا تھا[5]۔ مولانا نے اس کے جواب میں اپنا زوردار مضمون "ترکوں کا انتخاب"[6] "کامریڈ" میں شائع کیا[7]۔ "یہ شرارہ غضب کا تھا۔ حکام انگریز اب کیسے اور کب تک درگزر سے کام لیتے"[8]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا غصہ ان پر اترا اور وہ قید کردیئے گئے اور اپنے پریس اور اخبار دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے[9]۔ یہ قید ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک رہی[10]۔ اور جب دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر میں رہا کیے گئے تو سیدھے امرتسر پہنچے

---

۱ ندوی، سید سلیمان: حیات شبلی، ص ۵۹۶

۲ برق، ضیاءالدین احمد: مولانا محمد علی، مطبوعہ نقوش (شخصیات نمبر ۲) لاہور ۱۹۵۶ء، ص ۱۱۶۱

۳ دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۱۸

۴ ایضاً، ص ۱۷

۵ ایضاً، ص ۱۸

۶ Choice of the Turks

۷ دریابادی، عبدالماجد: ایضاً، ص ۱۸

۸ ایضاً

۹ علی، محمد: My Life - A Fragment، ص ۴۲ و بعدہ

۱۰ برق، ضیاءالدین احمد: ایضاً، ص ۱۱۶۱

جہاں مسلم لیگ کے بارہویں سالانہ اجلاس میں ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔[۱]

جوہر نے اپنی پانچ سالہ قید تنہائی میں کچھ غزلیں کہی تھیں جو چھندواڑے سے ۲۵ر جولائی ۱۹۱۶ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ان کے بھیجے ہوئے خط میں نقل کی گئی تھیں[۲] اور ان کے متعلق یہ لکھا گیا تھا:

"یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بہ غایت مجبوری کہہ لیتا ہوں"۔[۳]

بیرونی تحریک کے غلبے کے زیر اثر لکھی ہوئی غزلیں حساس شاعر کے جذبات دروں کی ہی غماز نہیں ہیں، اس دور کے سیاسی ماحول، عوام کی بے چینی و اضطراب، حکومت کے ظلم و جور اور قومیت کے فروغ و بقا کے جذبے کی ترجمان بھی ہیں۔ چونکہ شاعر محض ایک مجاہد ہی نہیں، قوم کا رہبر بھی تھا، اسی لئے اس کی روایتی انداز کی غزلوں میں امید و یاس کی کارفرمائی بھی ہے، حسین و خوشگوار مستقبل کی بشارت بھی ہے اور پرفتن دور میں عزم و حوصلے کو جواں رکھنے کی ترغیب و تلقین بھی۔ "جیل کی چار دیواری اور پابندی توڑتی ہوئی، پاسبانوں اور پہرہ داروں کی آنکھوں میں خاک جھونکتی ہوئی"[۴] جب یہ غزلیں ظلم و جفا سہتی ہوئی قوم تک پہنچی ہوں گی تو ان سے وہ مقصد بہ حسن و خوبی پورا ہوا ہوگا جس کی طرف جوہر نے مذکورہ بالا خط کے آخر میں اشارہ کیا تھا کہ "میری امت ان سے کچھ تسکین پائے"۔[۵]

۱۔ پیرزادہ شریف الدین: Foundations of Pakistan جلد اول ص ۵۳۴

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری حصہ اول، ص ۲۸ تا ۵۶

۳۔ ایضاً، ص ۵۲

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۵۔ ایضاً، ص ۵۶

تاریخی نوعیت کی حامل ان غزلوں کے منتخب اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ غالب کی طرح جوہر نے بھی اس صنفِ سخن کو حسن و عشق کی روایات کے مروجہ ڈھانچے سے نکال کر متحرک اور فعال زندگی کی شاہراہ پر لا کھڑا کیا اور اسے بیرونی اثرات و عوامل کا ترجمان بنایا۔ مزید برآں ہمیں ان کے یہاں درد و اثر کی جلوہ گری بھی نظر آئے گی، وہ اس لئے کہ "ان کی شاعری ساری کی ساری آمد تھی اور اس میں آورد کو مطلق دخل نہ تھا"[۱] اور شعر و ادب کا ہر طالب علم آمد و آورد کے فرق کو بخوبی جانتا ہے۔ سو آیئے کلامِ جوہر کا مطالعہ کر لیں ؎

خوگرِ جور یہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا، اور سہی
خوفِ غمّاز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور[۲]
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور
گر بوئے گل نہیں یہ سہی، یادِ گل تو ہے
صیّاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور
پاداشِ جرمِ عشق سے ہر کب تلک مفر
مانا کہ تم رہا کئے دار و رسن سے دور
یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں
مارو دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور[۳]
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

---

[۱] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۳۵۱

[۲] مولانا کی قیدِ تنہائی کے لئے انگریز حکومت نے چھنڈواڑے کا انتخاب کیا تھا جو اس وقت سی پی میں کسی گاؤں یا دیہات کی طرح گمنام تھا۔

[۳] مولانا جوہر کا یہ شعر ان کے لئے صحیح پیش گوئی ثابت ہوا اور وہ ۴ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کو لندن میں جہاں برطانیہ کے سامنے ہندوستان کا مطالبۂ آزادی پیش کرنے کے لئے گئے تھے، انتقال کر گئے۔

یہ نورِ خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا — کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ
سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل — رنگِ فلکِ پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ
ہے سنتِ اربابِ وفا صبر و توکل — چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ
تو طیرِ ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور — بے چارگی پہ اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ
ہوں لاکھ نظربند دعا بند نہیں ہوں — اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

سینہ ہمارا فگار دیکھئے کب تک رہے — چشم یہ خوں نابہ بار دیکھئے کب تک رہے
حق کی کمک ایک دن آ ہی رہے گی و لے — گرد میں پنہاں سوار[1] دیکھئے کب تک رہے
ماتمِ شبیر ہے آمدِ مہدی تلک[2] — قوم ابھی سوگوار دیکھئے کب تک رہے

مستحق دار کو حکمِ نظربندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

ہے بدترین عذاب یہی اک شریف پر — یارب کرائیو نہ اطاعت کمین کی

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو — خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

ناظرین! ۔ شعری اقتباسات طویل ہو گئے ہیں، لیکن یہ طوالت ناگزیر تھی۔ آپ نے بخوبی محسوس کیا ہوگا کہ ہر شعر مذہبی، سیاسی اور تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔ تحریکِ اتحادِ اسلامی کے اس دور میں انگریز حکام نے اسلام کے ایک بے باک سپاہی کو مقید کر کے حفظِ ماتقدم کا سامان تو کر لیا ہوگا ــــ لیکن روزنِ زنداں سے پھوٹنے والی اس روشنی پر وہ سایہ نہیں کر سکے ہوں گے جو برِ عظیم کے مغموم و مضمحل مسلمانوں کے

---

[1] گرد میں پنہاں سوار کی طرف واضح اشارہ اقبال نے اپنے اس مصرع میں کر دیا ہے ؎
یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

[2] قوم کی سوگواری دور کرنے کے لئے جب مہدی کی ضرورت تھی، اس سلسلے میں پہل بھی مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۱۳ء میں لندن کے دورانِ قیام کیا تھا جبکہ محمد علی جناح کو ترغیب دی تھی کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں۔ بحوالہ قریشی، اشتیاق حسین: پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ ص ۳۷۲ ۔ نیز قریشی: 'The Muslim League & Pakistan Movement' ص ۱۸

دلوں سے یاس و حرماں کی تاریکیوں کو مٹا رہی تھی اور اپنی یہ پیغام جاں فزا سنا رہی تھی ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اردو ادب میں ضرب المثل بن جانے والے یہ دو اشعار برطانوی جبر و استبداد کے دائمی خاتمے کی پیش گوئی تھے جسے صحیح ثابت ہونے میں بہت عرصہ نہیں لگا۔

محمد علی جوہر کی طرح حسرت موہانی (م: ۱۹۵۱ء) بھی ایک ایسے سخنور تھے جن کی تمام زندگی سیاست ہی سے عبارت تھی۔ سیاست ہی ان کا مطمحِ نظر تھا، یہی ان کا مقصدِ حیات تھا، یہی ان کی ابتدا تھی اور یہی ان کی انتہا!۔ مولوی عبد الحق نے ان کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے صحیح لکھا تھا:

آزادی کا ایسا شیدائی کوئی کم ہوگا۔ اس کی خاطر انہوں نے طرح طرح کی مصیبتیں، ایذائیں، عقوبتیں جھیلیں۔ لیکن ان کے قدم میں کبھی لغزش نہ آئی۔ اپنے خیال کے اظہار میں نہایت بے باک، جس طرح انہوں نے کانگریس میں کامل آزادی کی آواز اٹھائی، اسی طرح مسلم لیگ میں بھی نعرہ حق بلند کیا۔[۱]

حسرت نے صرف سیاسی پلیٹ فارم ہی سے آزادیٔ کامل کی آواز نہیں اٹھائی تھی، دنیائے شاعری میں بھی حق کا نعرہ بلند کرتے رہے تھے —— مگر ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ غزل کے شاعر تھے، غزل کی جملہ روایات کے شاعر تھے۔ حسن و عشق کا موضوع بھی انہیں عزیز تھا، لکھنؤ کی زبان بھی انہیں پسند تھی اور وہ دلی کی نمود بھی چاہتے تھے۔ طرزِ سخن کی اسی دو رنگی نے صنفِ غزل کے نامور نقاد

---

[۱] عبد الحق، مولوی: چند ہم عصر، ص ۳۶۱

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا:

"معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کو وجدانی طور پر اس کا احساس تھا کہ اگرچہ انہوں نے اپنی ساری عمر سیاست کے پاپڑ بیلنے میں گزاری، لیکن آئندہ نسلیں انہیں ان کے سیاسی کارناموں کے سبب سے یاد نہیں رکھیں گی بلکہ شعر و سخن کے ضمن میں اہلِ ذوق ان کے نام کو زندہ رکھیں گے......

......آج دیارِ سیاست میں حسرت کا نام لینے والا تک کوئی نہیں، لیکن جتنا زمانہ گزرے گا، ان کے شعر و سخن کی قدر افزائی بڑھتی جائے گی"۔[1]

ایک یوسف حسین خاں ہی پر موقوف نہیں، ہر ایک نقّادِ سخن نے حسرت کو "ساقی و پیمانہ، شمع و پروانہ، گل و بلبل"[2]، "حسن و عشق کے نازک و لطیف معاملات"[3] اور "رسیلی شاعری"[4] کے حوالے سے ہی پہچانا ہے۔ حسرت کے کلام کے یک طرفہ جائزے نے ان کے دوسرے رنگِ سخن کو بے توجہی کے سرد خانے میں ڈال کر رکھ دیا۔ اور اگر کلیم الدین احمد کی نگاہ اتفاقاً اٹھی بھی تو یہ کہہ کر کہ "حسرت اپنے ماحول، سیاسی و قومی ہی نہیں، اپنے کل ماحول سے گویا متاثر نہیں ہوئے"[5] ان کے کلام کی رہی سہی وقعت بھی کم کر دی۔

ناظرین!۔ ہم اس حقیقت سے کبھی نظر نہیں چرا سکتے کہ حسرت موہانی حسن و عشق کے منفرد شاعر ہونے کے علاوہ ایک "عظیم سیاست داں بھی تھے"[6] جنہوں

---

[1] خان، ڈاکٹر یوسف حسین: حسرت کی عشقیہ شاعری، منقول بہترین ادب سنہ ۱۹۵۱ء، ص ۱۸۷-۱۸۸

[2] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۱۹۴

[3] سرور، آل احمد: نئے اور پرانے چراغ، ص ۲۰۹

[4] گورکھپوری، فراق: اندازے، ص ۸۲۴

[5] احمد، کلیم الدین: اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، ص ۲۱۲

[6] نشتر، سردار عبدالرب: منقول احمد، خواجہ جمیل: Hundred Great Muslims، ص ۴۹۳

نے بیسویں صدی کے آغاز میں سودیشی تحریک کا آغاز کیا تھا۔[1] جنہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ احمد آباد (دسمبر ۱۹۲۱ء) کی صدارت کرتے ہوئے پہلی مرتبہ برعظیم کی کامل آزادی کا نعرہ بلند کیا اور ترکی کے تعلق سے فرنگیوں کو سخت سست کہنے سے بھی گریز نہیں کیا۔[2] اور اسی جلسے میں پڑھے جانے والے خطبۂ صدارت میں حسرت نے ہم وطنوں کو برطانوی حکومت کے مقابلے کے لئے "گوریلا وار فیئر" کے اقدام پر آمادہ کیا۔[3] یہ خطبۂ صدارت ضبط ہوا[4] اور اس شعلہ نوا تقریر کی پاداش میں اس غزل گو شاعر کو تین سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔[5]

یہ حسرت موہانی تھے جنہوں نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کی صدارت کی۔[6] آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ منعقدہ لاہور (۱۹۲۴ء) میں جب علامہ اقبال کو اس جماعت کا سکریٹری مقرر کیا گیا تو جوائنٹ سکریٹری کے عہدے کے لئے بھی حسرت منتخب ہوئے تھے۔[7] یہی رسیلا شاعر تھا جس نے آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل میٹنگ (منعقدہ بمبئی، جولائی ۱۹۲۶ء) میں بڑے دھڑلے سے یہ تجویز پیش کی تھی:

> "اب انقلاب عمل کا وقت آ پہنچا ہے۔ مسلم لیگ کو مطالبۂ پاکستان کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دینی چاہیے اور اس کے حصول کے لئے مناسب اقدامات اختیار کرنے چاہئیں۔ اگر قائد اعظم صرف ہاں کہہ دیں تو برعظیم کے سارے مسلمان ایک لمحے میں انقلاب کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔"[8]

درج بالا تاریخی حقائق کے اظہار سے ناظرین کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ حسرت

---

[1] کلیات حسرت، ص ۱۲
[2] پیرزادہ، شریف الدین: Foundations of Pakistan، جلد اول، ص ۵۵۶ وبعدہ
[3] ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۲۱
[4] کلیات حسرت، ص ۲۶
[5] ریاض، سید حسن: ایضاً، ص ۱۲۱ وبعدہ
یہ سزا بعد میں گھٹا کر دو سال کر دی گئی تھی۔
[6] احمد، خواجہ جمیل: Hundred Great Muslims، ص ۴۸۹
[7] پیرزادہ، شریف الدین: ایضاً، جلد دوم، ص ۱۳۶
[8] ایضاً، ایضاً، ص ۵۵۱-۵۵۲

دنیائے شاعری کی طرح دنیائے سیاست میں بھی ممتاز و منفرد مقام کے حامل ہیں اور ان کے اس رنگ کو حسن وعشق، فراق و وصال اور کیف و سرمستی کے موضوعات پر مبنی غزلوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں رنگوں سے مل کر ہی ایک تیسرا رنگ ابھرتا ہے اور وہی شاعر حسرت کا اصلی رنگ ہے۔ اور یہ کوئی ایسی کم مایہ بات نہیں کہ اس پر شرمایا جائے اور ان کے اس آفاقی رنگ کو یہ سوچ کر مدھم کیا جائے کہ اس سے اردو کی روایتی عشقیہ شاعری پر ضرب پڑتی ہے۔

مولانا حسرت اپنی سودیشی تحریک اور دوسری سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے فرنگی حکام کی نظروں میں پہلے ہی آ چکے تھے، لیکن جب ۱۹۰۸ء میں انہوں نے "اردوئے معلیٰ" میں ایک مضمون "مصر میں انگریزی سیاست"[1] شائع کیا جس میں مصر کے متعلق برطانوی حکمت عملی پر کڑی تنقید کی گئی تھی، تو انہیں قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ اس زمانے میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا جاتا تھا، اس کی طرف اشارہ اس شعر میں ملتا ہے ؎

حادثے سنہ آٹھ میں گزرے بہت اب دیکھئے
کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار اب کی برس[2]

ناظرین! یہاں اس حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ بیسویں صدی کے آغاز میں "حسرت پہلے مسلمان تھے جنہوں نے سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل کو زینت بخشی"[3] اور زینت بخشنے کا یہ سلسلہ ۱۹۲۳ء تک جاری رہا۔

زیر بحث دور میں حسرت نے اپنا بیشتر کلام سیاسی حالات و واقعات سے متاثر ہو کر کہا ہے۔ چونکہ اس نوع کے اشعار عاشقانہ مضامین پر مشتمل شعروں کے ساتھ پیوستہ ہیں، اس لئے یہ مسئلہ ہنوز تصفیہ طلب ہے کہ "آیا وہ سیاسی پابندیوں اور غلامی کے احساس سے محبوب کی ذات میں گریز جاتے تھے اور یہ گریز پائی پریشان ذہن کے لئے ان کی پناہ گاہ کی تلاش تھی"[4] یا "سیاست کو انہوں نے شاعری کا آئنا

---

[1] بقول علامہ سلیمان ندوی، مضمون نگار اقبال سہیل تھے۔ منقول مقدمہ کلیات حسرت، ص ۱۳

[2] واضح رہے کہ یہ دیوان حسرت حصۂ اول کی غزل کا ایک شعر ہے۔

[3] برنی ضیاء الدین احمد: عظمت رفتہ، ص ۱۸۷، نیز احمد خواجہ جمیل: Hundred Great Muslims ص ۴۸۷

[4] عقیل، ڈاکٹر معین الدین: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۴۵۲

اہل نہیں سمجھا کہ مستقل عنوان بنا کر کچھ کہتے"[1] بہر حال اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ وہ رئیس المتغزلین ہی نہیں، رئیس الاحرار بھی تھے، حسرت ہی نہیں فضل الحسن بھی تھے ؎

جب سے کہا عشق نے حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

یہ اور بات ہے کہ حسرت ہی کی طرف نظر اٹھتی رہی، فضل الحسن کو ایک دوسرا آدمی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ آیئے اس دوسرے آدمی کے نعرۂ حق کو بھی سن لیا جائے۔

حسرت موہانی تمام زندگی عملی اور تحریری دونوں طریقے سے انگریز حکام سے معرکہ آرا رہے۔ حصولِ آزادی کا جذبہ ان کے دل میں اس ابتدائی دور میں موجزن تھا اور وہ وطن کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے جبکہ کوئی بھی سربرآوردہ لیڈر میدان میں اترا نہ تھا۔ وہ تن تنہا سامراجی قوتوں سے ٹکر لیتے رہے اور اس کے وجود سے سخت نالاں و بیزار تھے۔ ایک حریت پسند شاعر کا جذبۂ دروں درج ذیل اشعار میں بخوبی نمایاں ہو رہا ہے ؎

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمتِ انگریز نہ کرتے

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

غیر ممکن ہے ہم سے طاعتِ غیر
اے جفا کار اے غریب آزار

حسرت موہانی کے جذبۂ حریت سے انگریز ہمیشہ خائف رہے۔ وہ حکومت کی نظر میں خطرناک ترین دشمن قرار دیے جاتے تھے۔ چنانچہ اس "مشہور شورش پسند"[2] کے شوقِ آزادی کو ختم کرنے کے لئے اسے مسلسل پا بہ زنجیر رکھا جاتا اور طرح طرح کے مصائب اس پر ڈھائے جاتے۔ لیکن مولانا ان سختیوں سے قطعی نہیں گھبرائے۔ بلکہ وہ تو اس بات سے خوش نظر آتے ہیں کہ فرنگی حکومت کی اس جفاکشی، ایذا رسانی

---

[1] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۱۹۶
[2] مقدمہ کلیات حسرت، ص ۱۹

اور ستم کیشی سے حبِ وطن کی شورش پھیلتی چلی جائے گی۔ اسے جتنا بھی دبایا جائے گا' یہ اور ابھرے گی۔ جدّ و جہدِ آزادی کی اس ٹھوس حقیقت کو حسرت موہانی غزل کے شعر میں بڑی خوبصورتی سے پیش کر رہے ہیں ؎

اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حبِّ وطن تمام

قیدِ افرنگ سے آزادیٔ کامل کے اس متوالے کا حوصلہ و عزم' جرأت و ہمت اور قوتِ برداشت کم نہیں ہوتی۔ وہ اپنی خود اعتمادی سے سارے جور و جفا کو سہہ لیتا ہے۔ دیکھئے ایک شاعرِ تغزل پابندِ سلاسل رہ کر بھی خود کو آزاد و با اختیار سمجھ رہا ہے ؎

آزاد ہیں قید میں بھی حسرت — ہم دل شدگانِ خود فراموش
روح آزاد ہے خیال آزاد — جسمِ حسرت کی قید ہے بیکار
باطن میں ہیں آزاد بظاہر ہیں نظربند — ہیں دیدہ و دل بازیہاں دیدہ سربند
بیکار ڈراتے ہیں مجھے قیدِ ستم سے — واں روحِ وفا اور بھی آزاد رہے گی
ہو جبکہ شوقِ شہادت انہیں کیا خوف بھلا — قید کا مرحلہ نرم ہے اگر در پیش
اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی — ہیبت سی اک جو خطرہ دار و رسن میں تھی

دار و رسن کی ہیبت کو مٹانا ایک بندۂ حر ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اور جب قیدِ تنہائی میں ظلم و ستم کی انتہا ہو تو ریاضِ سخن کرنا شاعر کا نہیں' صاحبِ سیف کا ہی کرشمہ قرار دیا جا سکتا ہے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت نے صنفِ غزل سے قوم کو بیدار کرنے' اس میں حصولِ آزادی کا جذبہ پیدا کرنے اور اسے اتحاد و تنظیم کا درس دینے کا جو کام لیا ہے' اس نے اس کی روایتی ہیئت اور موضوع کے محدود دائرے کو وسیع تر کر دیا ہے۔ اگر حسرت محض حسن و عشق کے شاعر ہوتے اور غزل میں غمِ دوراں سے گریز چاہتے تو اردو شاعری میں یہ اجتہاد نہ

کرتے اور تغزل کے نازک آبگینے میں سیاسی شراب ہرگز نہیں انڈیلتے۔ درج ذیل غزل حسرت کے سیاسی نصب العین کو خود ہی واضح کر رہی ہے ؎

خرمی دو روزہ کو عشرت جاوداں نہ جان
فکر معاش سے گزر، حوصلۂ معاد کر
اے کہ نجاتِ بندگی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمت سر بلند سے یاس کا انسداد کر
خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جدّ و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

حسرت نے آخری دو شعر میں سودیشی تحریک کے نقطۂ نظر کو بڑی خوبصورتی سے واضح کر دیا ہے۔

اب ایک دوسری غزل ملاحظہ ہو۔ غزل کیا ہے، انگریزوں سے براہِ راست ہوکر آرا ہونے کا اعلان ہے۔ چھوٹی سی مترنم بحر، سادہ و شگفتہ الفاظ، رواں مصرعے، سیاسی موضوع کا اظہار اور جرأت آمیز خیالات کی پیشکش ــ ان سب عناصر نے اسے خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جبکہ سیاسی شعور کا فروغ معرضِ وجود میں تھا، اس رنگ و آہنگ کا کلام اہلِ وطن کے دلوں میں مشعلِ آزادی کو فروزاں کرنے میں اہم رول ادا کر رہا ہوگا ؎

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر — مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
سمجھتے ہیں سب اہلِ مغرب کی چالیں — مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بیکار ہو کر
ابھی ہم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب — بتا دو انہیں گرم پیکار ہو کر
فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی — نکل آؤ بے رحم و خونخوار ہو کر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے نہ دیکھو — نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو — کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

جنگ ہائے طرابلس و بلقان سے حسرت موہانی جیسے صاحبِ ایمان بھی متاثر ہوئے تھے۔ وہ تو ہر ظلم و جور کے مخالف رہے تھے چہ جائیکہ اسلامی مرکز ہی یورپ کی زد میں آ گیا تھا اور سلطنتِ ترکیہ کا نام و نشان مٹانے کی مہم تیز تھی۔ اپنے اس تاثر کو وہ غزل میں اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ شکست و محرومی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ فتح و کامرانی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو اس موقع پر ان کا کہا ہوا کلام ؎

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبر میں ہے

جورِ یورپ ہے بنا بیداریٔ اسلام کی
خیر ہے دراصل یہ باآنکہ شکلِ شر میں ہے

خاطرِ افسردہ میں باقی ہے اب تک یادِ عشق
گرمیٔ آتش ہنوز اس مشتِ خاکستر میں ہے

قلّتِ افواجِ ترکی پر نہ ہو اٹلی دلیر
ایک ہے سو کے لئے کافی جو اس لشکر میں ہے

اب خدا چاہے تو حسرتؔ جلد ہوتا ہے بلند
رایتِ حرّیت و حق جو کفِ انور میں ہے

میثاقِ لکھنؤ کے تحت مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتوں نے مل کر حکومتِ ہند سے اصلاحات کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں جون ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ شائع ہوئی جس میں اہلِ ملک سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ جلد ہی اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔ اعلان کے فوراً بعد مانٹیگو نے وائسرائے ہند چیمسفرڈ کے ہمراہ ملک کا دورہ کیا اور مختلف لیڈروں اور افسروں سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد مانٹیگو چیمسفرڈ ریفارم کا اعلان کر دیا جس میں دی گئی اصلاحات مطالبات سے بہت کم تھیں[1]۔ مولانا حسرت موہانی نے اس اعلان پر یوں نکتہ چینی کی تھی ؎

کس درجہ فریب سے ہے مملو تجویزِ رفارمِ مانٹیگو

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، ص ۳۷۴ و بعدہ

مشہور زمانہ ہیں، مسلّم — دستور کے حسب ذیل پہلو

قانون پہ اختیارِ کامل — عمّال پہ زور، زر پہ قابو

ان میں سے نہ ہو جب ایک بھی — گلہائے رخارم میں کہیں بو

کاغذ کے سمجھئے پھول ان کو — جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو

اس کے بعد حسرت نے اہلِ وطن کو خبردار کیا تھا کہ وہ ان اصلاحات کو قبول نہ کریں اور اپنی تگ و دو جاری رکھیں ؎

اے ہندی سادہ دل خبردار — ہرگز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو

کیا پائے گا خاک پھر جب ان سے — اس وقت بھی نہ لے سکا تو

بیسویں صدی کی اس پہلی دہائی میں، جبکہ سن ستاون کے انقلاب کو گزرے ہوئے نصف صدی بھی نہیں ہوئی تھی، مولانا حسرت موہانی آزادیٔ کامل حاصل کرنے کے لئے بے چین و مضطرب تھے۔ وہ فرنگیوں کے جور و جفا اور مکر و فریب کا فوری طور پر خاتمہ چاہتے تھے۔ اصلاح کے پردے میں تخریب کا جو عذاب افراد قوم پر نازل ہو رہا تھا اور قانون کے نام پر جو ستم ڈھائے جا رہے تھے، ان کے سدِّباب کے لئے وہ سراپا سیماب پا بنے ہوئے تھے۔ ان کے اس انقلابی رجحان کا اظہار درج ذیل اشعار میں بخوبی ہو رہا ہے ؎

تا بہ کجی ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب

ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا

خلق خدا پہ عذاب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم

جبر بزیر نقاب دیکھئے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر جور غلامانِ وقت

از رہِ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

برطانوی استعمار پسندوں نے برعظیم کے رہنے والوں کو ہمیشہ سے کمزور محسوس کیا اور اپنی مسلسل کچلتے رہے۔ کبھی توپ و تفنگ سے مغلوب کیا اور کبھی تباہ

کی پالیسیوں سے مغلوب کیا۔ اور اس طرح انہیں "قریب المرگ" سمجھ کر زاغ و زغن کی طرح لوٹنے کھسوٹنے لگے۔ تاریخ کے اس تلخ باب کو حسرت نے اپنے اس شعر میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے ؎

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ
مغرب کے یوں جمع ہیں زاغ و زغن تمام

حسرت پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اہلِ برطانیہ کو زاغ و زغن سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے ان کی جرأت و بے باکی کا پتہ چلتا ہے۔

ناظرین! ۔ حسرت موہانی کی شاعری کا جائزہ لے لینے کے بعد ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے معاملاتِ حسن و عشق کے پہلو بہ پہلو سیاسی و معاشرتی "حالات کو ان کے روابط اور اجتماعی زندگی کو اس کے اصل تعلقات میں سمجھنے کی کوشش کی" [۱] تھی۔ اور ان کے کلام کے اس ہمہ گیر پہلو کو یک طرفہ جائزے سے نظر انداز کرنا ناانصافی ہوگی۔

اس دور میں سیاسی، ذہنی اور معاشرتی غلامی کے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے [۲] ان کا اظہار چکبست کے کلام میں بڑی شدت سے ہوا ہے۔ کہیں وہ اشارہ و کنایہ میں رازِ درونِ میخانہ افشا کر جاتے ہیں تو کہیں بغیر کسی حجاب کے مدعائے دل بیان کر دیتے ہیں۔ اس نوع کے اشعار ان کی سیاسی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ نمونے کے طور پر چند شعر ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں ؎

قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی
اڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگِ آزادی

ہوائے شوق سے غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو مہک نہیں سکتے

یہ انقلاب ہوا عالمِ اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا بھول گئے

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمنِ روزگار کو

---

[۱] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۱۹۱
[۲] سروری، عبدالقادر: جدید اردو شاعری، ص ۲۲۰

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح — اس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی — شبنم کو آئے دامنِ گل میں قرار کیا

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا — دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

چکبست ہوم رول تحریک کے زبردست حامی و موئید تھے۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے اس کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرنے اور عوام کو اس سے باخبر کرنے میں بڑا اہم کام کیا ہے۔ ان کے یہاں اس کے مطالبے کی جو شدت پائی جاتی ہے اس کے پیشِ نظر ہم ڈاکٹر عبادت بریلوی کے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "سیاست میں ان کا نصب العین صرف ہوم رول تھا۔"[1] اس موضوع کو ان کے علاوہ کسی اور شاعر نے اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنے بھرپور جذبے کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے۔ اس نوع کے اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا — رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا

یہ آگ وہ ہے جو پانی دبا نہیں سکتا — دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہی — اب دین ہے تو یہی ایمان ہے تو یہی

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے — شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی — غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

ہوم رول کی اصل محرک مسز اینی بیسنٹ[2] کو حکومت برطانیہ نے جب گرفتار کرلیا تو چکبست نے اس موقع پر اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا تھا ؎

حکم حاکم کا ہے فریاد زباں رک جائے — دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے

---

[1] بریلوی، ڈاکٹر عبادت: روایت کی اہمیت، ص ۴۱۰

[2] سیتارامیا، پٹا بھائی: *The History of the Indian National Congress* جلد اول، ص ۱۳۰

قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے — یہ ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنہوں نے یہ اذیت دی ہے

کچھ تماشا نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے

چکبست کو سیاسی لیڈروں سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے گوپال کرشن گوکھلے اور بال گنگا دھر تلک کی موت پر تاثراتی نظمیں لکھیں جو بقول رام بابو سکسینہ "جوش و تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں بلکہ فی الحقیقت آزادی اور حریت کے خیالات ہیں جو کسی علمبردار آزادی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر شاعر کے دل میں موجزن ہوئے"[1]

چکبست نے جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے پر جو اشعار لکھے تھے، وہ صرف ان کے اپنے رنج وغم کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اہلِ وطن کے دلوں میں اس ظلم کے خلاف پیدا ہونے والے اشتعال کی صحیح طور پر ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ چند شعر پیشِ خدمت ہیں:

نہیں یہ فکر ہے ہردم نئی طرزِ جفا کیا ہے — ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

یہ رنگِ بیکسی رنگِ جنوں بن جائے گا غافل — سمجھ لے یاس و حرماں کے مرض کی انتہا کیا ہے

تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن — دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

چکبست نے ہوم رول تحریک کو اپنے کلام سے تقویت تو دی ہے اور مختلف سانحات پر درد دل کا اظہار بھی کیا ہے، لیکن وہ عزم و عمل کی سمت اہلِ وطن کی رہنمائی نہیں کر سکے ہیں۔ انہوں نے اقبال اور حسرت کی طرح سیاسی مسائل کو حل کرنے کا کوئی منشور بھی پیش نہیں کیا۔ آزادی کے متوالوں کے لئے وہ کوئی پیام بھی نہیں دیتے[2]۔ اس کے باوجود حریت کی راہ میں درپیش ہر مصیبت کو سہنے پر وہ آمادہ نظر آتے ہیں اور یہی ان کی وطن دوستی کی دلیل ہے۔ چلتے چلتے اس نوع کے دو شعر سن لیجئے:

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے — خوشی سے قید کے گوشے کو ہم سجائیں گے

---

[1] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، ص ۱۲۸

[2] حسین، سید احتشام: تنقیدی جائزے، ص ۱۲۵

زبان کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں　　　　مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

درج بالا شعر کہہ کر چکبست نے مجاہدین آزادی کو ہی نہیں، پورے اردو ادب کو ایک نیا، اچھوتا اور ولولہ انگیز خیال دے دیا ہے۔

سید ہاشمی فرید آبادی اپنی دو مشہور نظموں "کالی ناگن" اور "سراغ فہم" کے حوالے سے جدید اردو شاعری میں پہچانے جاتے ہیں۔[1] لیکن ان کی ان منظومات کا ذکر کہیں نہیں ملتا جو جنگ ہائے طرابلس و بلقان سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں۔ حالانکہ ہاشمی کی ان نظموں میں بھی وہی اٹھان ہے، وہی بانکپن ہے، وہی روانی ہے اور جذبات کی وہی شدت ہے جو مذکورہ نظموں کی خصوصیات ہیں۔

ہاشمی نے اپنی ایک نظم "دعوتِ بلقان" میں مسلمانوں کی غیرت کو ابھارتے ہوئے سوئے میدان کارزار چلنے کا پیغام دیا ہے۔ وہ ترکی کے خونیں واقعات پر افسردہ و مغموم ہونے کی بجائے عملی قدم اٹھانے کے آرزو مند نظر آتے ہیں۔ وہ ملت کی آبرو کو لاکھوں زندگیوں کی قربانی سے افضل قرار دیتے ہیں۔ ہاشمی کی اس نظم میں عزم وہمت کی جھنکار ہے، ولولہ و شوق کا اظہار ہے اور ایثار کا جذبہ فراواں ہے۔ ہیئت اور اسلوب کے رنگ اور فکر و عمل کے آہنگ نے اس میں بلا کی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ تحریکِ اتحادِ اسلامی کے جس مقصد کے پیش نظر یہ رزمیہ نظم لکھی گئی تھی، اس کو بہ حسن و خوبی پورا کر رہی ہے۔ چند ایک بند ملاحظہ ہوں ؎

تا کجا رخ زرد آنکھیں خونچکاں دل مضمحل
تا بہ کے ساز جنوں مشتاق آہنگ عمل
دعویٔ ایمان رکھتا ہے تو اے مومن نکل
شمہ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل

جان سے لاکھوں گنی بڑھ کر ہے تیری آبرو
ہو فنا گر ہے بقائے جاوداں کی آرزو
سد گوار بیائے فردا کی نہ کر تلقین تو
شمہ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل

---

[1] احمدؔ عزیز: انتخاب جدید، ص ۱۹ وبعدہٗ

تا کجا یکساں روی اب سن پیام انقلاب
چھوڑ بے رنگی سکوں کی ہو رہیں اضطراب
وہ بھی کیا مرنا کہ خود فطرت تجھے دے دے جواب
لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل

آخری بند میں ہاشمی فرید آبادی برعظیم کے مسلمانوں کو جس انقلاب کا پیام سنا رہے ہیں، وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہونے، اپنی اصلیت کو پہچاننے، متحرک و باعمل زندگی اختیار کرنے اور ایک اعلیٰ مقصد کے لیے زندگی قربان کر دینے کا پیام ہے۔ بادی النظر میں یہ پیام صرف اسلامی مملکت ترکیہ کے تحفظ کے لئے ہی نہ تھا، تمام دنیا کے مسلمانوں کی بقا و سالمیت، عظمت و سربلندی اور اقتدار و افتخار کو دائرہ حصار میں لانے کا پیام تھا۔ اور جب ہاشمی یہ کہتے ہیں کہ؎

لہو غیظ و غضب کا آنکھ کی رگ رگ سے بہ نکلا
گرا جب خاک پر کٹ کر مرا عثمانوی بھائی
مرے ہر سانس سے اک انقلابِ حریت اٹھا
مرے اک اک روئیں نے جب حمیت کی قسم کھائی
بس اب میں اپنے ملکِ نفس کا سلطان مطلق ہوں
بس اب ہے آج سے آغاز میری کار فرمائی

تو ان اشعار کے پس پردہ غلام ملک میں رہنے والے اس انقلاب کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے جو لیلیٰ حریت کا دیوانہ نظر آتا ہے اور بندگی و فرماں برداری کی ساری قیود کو توڑ کر ملکِ نفس کی عظمت کا پھریرا بلند کر دیتا ہے۔ طرابلس اور بلقان پر ہونے والے مظالم نے اس حریت پسند انسان کو تمام استعماری قوتوں سے متنفر کر دیا ہے اور اب اس کی اصلیت جوش پر آگئی ہے؎

بہت دن ذلتوں کو مصلحت جانا کیا لیکن
بس اب اے ہمنشیں میری طبیعت جوش پر آئی

طبیعت کے اسی جوش نے ہاشمی فرید آبادی کو عزم و عمل کا رجز گانے پر آمادہ کیا ہے۔ اس کے ہر بول میں زندگی کی بھرپور حرارت کار فرما ہے۔ اس نے برطانوی عروج و اقتدار کے زمانے میں مسلمانانِ پاک و ہند کے دلوں میں جرأت و حوصلے کے چراغ روشن کر دیئے تھے۔

حریت پسند شاعروں کی اس صف میں ہمیں صفی لکھنوی (م: ۱۹۵۰ء) بھی دکھائی دے رہے ہیں جو "اساتذۂ غزل میں ایک اونچا درجہ رکھتے ہیں"۔[1] انہوں نے لکھنؤ کے رنگ شاعری میں بہ لحاظ لفظ و بندش اور بہ لحاظ تخیل ترمیم و اصلاح کی بہت کی ہے۔[2] "وہ عاشقانہ مضامین اس صفائی اور پر درد طریقے سے نظم کرتے ہیں کہ اس کی مثال نہیں ملتی"۔[3] اس اعلیٰ درجے کی غزل گوئی کے باوجود صفی نے اپنی شگفتہ، رواں اور ولولہ انگیز نظموں کے ذریعے افراد ملت کے خوابیدہ شعور کو بیدار کرنے جو کوششیں کی ہیں ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ان کے قومی ترانے کا ذکر ناگزیر ہے جو ۱۹۱۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں پڑھا گیا تھا۔[4] واضح رہے کہ یہ زمانہ تحریک اتحاد اسلامی کا تھا۔ مغرب کی استعماری قوتیں بلاد اسلامی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے سرگرم عمل تھیں۔ برعظیم کے مسلمانوں میں اس کا جو شدید ردعمل ہوا تھا، اس کا ذکر زیر نظر باب کی ابتدا میں آچکا ہے۔ ایسے ماحول میں غزل گو صفی نے یہ ترانہ لکھ کر نہ صرف مسلمانان ہند میں اتحاد اسلامی کے جذبات پیدا کر دیئے تھے اور انہیں ولولہ انگیز شعور بخشا تھا، بلکہ برطانوی حکمرانوں کو بھی خبردار کر دیا تھا کہ "ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں اور وقت آنے پر یہ بتا دیا جائے گا کہ ہم کیا ہیں"۔

جیسا کہ ممتاز حسن جونپوری لکھتے ہیں "اس جوشیلی نظم کے جواب میں کرسچین سوسائٹی کی طرف سے بھی محض شاعر کا منہ چڑانے کی خاطر ایک نظم شائع کی گئی اور انگریز حکام کی طرف سے بھی صفی پر دباؤ ڈالا گیا"۔[5] ان تمام مزاحمتوں کے باوجود "یہ نظم زبان زد عام تھی"۔[6]

---

[1] سروری، عبدالقادر: جدید اردو شاعری، ص ۲۵۳

[2] موہانی، حسرت، منقول جونپوری، ممتاز حسن: مولانا صفی لکھنوی، مطبوعہ نقوش (شخصیات نمبر ۲) لاہور، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۴۳۵

[3] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۲۱۷

[4] بریلوی، سید الطاف علی: علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، ص ۲۹۷

[5] جونپوری، ممتاز حسن: ایضاً، ص ۱۴۳۶

[6] رضا، سید ہاشم: اردو شاعری اور جنگ آزادی، ایک مقالہ جو ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو بہادر یار جنگ اکاڈمی کراچی کے جلسے میں پڑھا گیا۔

اس ولولہ انگیز اور تاریخی نظم کے منتخب اشعار پیش خدمت ہیں ۔

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ملا دیں گے
مشرق کا سرا اٹھا کر مغرب سے ملا دیں گے

دھارے ہیں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں
بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے

ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ
شعلے بھڑک اٹھیں گے جھونکے جو ہوا دیں گے

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے دو وقت آئے پھر تم کو بتا دیں گے

دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی
دیکھو جو ہمیں رد کا طوفان اٹھا دیں گے

ایران ہو یا ٹرکی دونوں کو شاد دیکھیں
کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے

اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے

ذرا اندازہ کیجئے ! ۔ صفی کی اس نظم کا لہجہ کیسا توانا' آواز کتنی جاندار اور تیور کیسا دلیرانہ ہے ۔ غزل کے پیرائے میں کہی گئی اس نظم کو ہم اس لئے غیر مطلوبہ مال کے گودام میں نہ ڈال دیں کہ اس میں حسن وعشق کے روایتی معاملات نہیں ۔ ناظرین ! ۔ زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کے لئے حسن وعشق ہی تو سب کچھ نہیں !

بیسویں صدی کی پہلی دو دہائی میں ہمیں ایسے اور بھی شعرا نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے کلام کے ذریعے سیاسی بیداری کے اثرات کو اجاگر کیا ہے ۔ ان میں عزیز لکھنوی' ظریف لکھنوی' غلام بھیک نیرنگ' بے نظیر شاہ اور آرزو لکھنوی خاصے نمایاں ہیں ۔ چونکہ ان سبھوں کا مقصد ایک ہے اور موضوعات کی یکرنگی بھی ان کی شاعری کا احاطہ کئے ہوئے ہے' اس لئے طوالت کے خوف سے ہم ان کے تذکرے سے گریز کرتے ہیں ۔ البتہ اس باب کے خاتمے پر ہم ایک ایسے شخص کا ذکر ضرور کرنا چاہیں گے جو شاعر تو یقیناً ہے مگر جس کا نام شعرا کی فہرست میں ٹنکا ہوا نظر نہیں آتا ۔ ہماری مراد شبلی نعمانی کے ایک شاگرد سید سلیمان ندوی سے ہے جن کی نظم "مسٹر علی جینا" ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے ۔

زیر نظر دور میں ہمارے کئی شاعروں نے سیاسی لیڈروں کی شخصیت اور

کارنامے کو موضوعِ سخن بنایا تھا۔ ان میں مولانا حسرت موہانی اور چکبست پیش پیش تھے۔ ان دونوں نے بال گنگا دھر تلک کی شان میں قصیدے لکھے تھے۔ اور جیسا کہ ابھی ہم لکھ آئے ہیں، چکبست نے گوکھلے کا مرثیہ بھی درد انگیز پیرائے میں لکھا تھا۔ یہ دونوں قائدین ہندو فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور اسی کی سیاسی بہبود ان کا مطمحِ نظر تھا۔

ناظرین! یہ بات ذہن نشین رہے کہ کانگریس بہت پہلے ہی فعال بن چکی تھی اور ہندوؤں کے لئے جو کچھ کر رہی تھی، اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مسلمان میدانِ سیاست میں بہت بعد میں داخل ہوئے اور جب مسلم لیگ سرگرمِ عمل ہوئی تو ملت کو یک گونہ سکون ملا۔ لیکن کانگریس کے مقابلے میں جو تاب و توانائی لیگ میں چاہیے تھی، وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہر دور اندیش مسلمان کسی ایسی قیادت کا منتظر تھا جو یاس و حرماں کے چھائے ہوئے کہر کے درمیان مستقبل کی درخشاں شاہراہ کا سراغ دکھائے۔

جب قائدِ اعظم محمد علی جناح اپنی جملہ قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ افقِ سیاست پر ابھرے تو مسلم عوام کی طلب و جستجو کو سامانِ سکون میسر آیا۔ اس زیرِ نظر دور میں کسی شاعر نے قائدِ اعظم کو اپنی نظم کا عنوان نہیں بنایا تھا۔ البتہ سنہ چالیس سے قائدِ اعظم پر منظومات قلمبند کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور بعد میں ایسی بے شمار نظمیں مل جائیں گی[1]۔

یہ سلیمان ندوی تھے جنہوں نے سب سے پہلے قائدِ اعظم کی شان میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مولانا نے ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں بہ نفسِ نفیس شرکت کی تھی[2]۔ واضح رہے کہ یہ لیگ کا نواں اجلاس تھا جو ۳۰ / اور ۳۱ / دسمبر کو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اور جس کی صدارت خود قائدِ اعظم نے فرمائی تھی[3]۔ میثاقِ لکھنؤ اسی زمانے کی یادگار ہے[4]۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زیدی، ناصر و محمود الرحمٰن: وہ رہبر ہمارا وہ قائد ہمارا

[2] ندوی، سلیمان: حیاتِ شبلی، ص ۶۲۷

[3] پیرزادہ، شریف الدین: Foundations of Pakistan جلد اول، ص ۳۷۰

[4] ایضاً، ص ۳۹۲

صاحبِ صدر' محمد علی جناح' نے اس جلسے میں جو خیال انگیز تقریر کی تھی' وہ تاریخ جدوجہدِ آزادی کا ایک اہم ورق ہے[1] مولانا ندوی اس موقع پر قائدِ اعظم کی باوقار شخصیت' ان کی قائدانہ صلاحیت اور سیاسی بصیرت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ مسلمانانِ ہند کی سیاسی زبوں حالی کے ازالے کے لئے قائدِ اعظم جو جدوجہد کر رہے تھے' اس سے سلیمان ندوی خاصے پرامید تھے اور انہوں نے اپنی مذکورہ نظم میں جو دورانِ جلسہ موزوں کی گئی تھی[2]' اس خیال کا برملا اظہار کر دیا تھا ؂

پھر مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید

ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا[3]

سلیمان ندوی نے یہ نظم اس وقت کہی تھی جبکہ قائدِ اعظم کو مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور ابھی ملت میں ابھی وہ امتیازی مقام بھی حاصل نہیں ہوا تھا جو بعد میں ہوا۔ لیکن یہ مولانا ندوی کی دوراندیشی تھی کہ وہ اسلامیانِ ہند کی فلاح و بہبود' سیاسی استحکام اور ان کے فروغ و ارتقا کی جھلک "محمد علی جینا" کی قیادت میں دیکھ رہے تھے۔

آیئے!۔ اس مختصر مگر پرخلوص اور یادگار نظم پر نظر ڈالتے ہوئے ہم سیاسی بیداری کے اس انیس سالہ دور کو ختم کریں اور اپنا نیا سفر خلافت تحریک سے شروع کریں جو تیسری دہائی کے آغاز میں بہت زیادہ متحرک' فعال اور ہنگامہ خیز رہی ہے۔ سونا ظرین' یہ رہی نظمِ سلیمان ؂

اک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے

کوہِ شملہ جن دنوں ہم پایۂ سینا رہا

---

[1] مذکورہ تقریر کے لئے ملاحظہ ہو پیرزادہ شریف الدین: Foundations of Pakistan' جلد اول' ص ۳۷۰۔۳۷۷

[2] ندوی سلیمان: ارمغانِ سلیمان' ص ۹۰

[3] اس وقت یعنی ۱۹۱۶ء میں قائدِ اعظم اسی نام سے یاد کئے جاتے تھے اور جناح' نے ہنوز جینا کی جگہ نہیں لی تھی۔

جبکہ دارو ئے وفا ہر درد کا درماں رہی
جبکہ ہر ناداں عطاق بوعلی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اسے
جب اب یہ موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حبِّ وطن کچھ کیف پیدا کر سکے
دور میں یونہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
عِلّتِ دیرین سے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں
گوش شنوا ہے نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا
پر مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا[1]

---

[1] منقول ندوی، سلیمان: حیاتِ شبلی، ص ۶۲۷ ؟
نیز ارمغانِ سلیمان، ص ۹۵

دسواں باب

تحریکِ خلافت کا دور

پہلی جنگ عظیم تمام اقوام عالم کے لئے ہی نہیں، ملّتِ اسلامیہ کے لئے بھی ایک لمحۂ فکریہ ثابت ہوئی تھی۔ گذشتہ شاہانہ اسلامی شان و شوکت کی واحد یادگار ترکی[1] جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور بلغاریہ کا حلیف بن کر ان اتحادی قوتوں کے مدمقابل میدانِ کارزار میں بے محابا کود پڑا تھا جو برطانیہ، فرانس، بلجیم، یونان، سربیہ، اٹلی، روس اور رومانیہ جیسی سلطنتوں پر مشتمل تھیں۔[2] اس عالمی جنگ کا پانسہ اتحادیوں کے حق میں پلٹ گیا اور ترکوں کے لئے شکست و ریخت مقدر بن گئی۔ مملکت ترکیہ سے بے شمار علاقے نکل نکل کر حریفوں کی تنگ دامانی کو وسعت دینے لگے، حتّٰی کہ اماکن مقدسہ بھی اس کی تحویل سے نکل کر حکومت برطانیہ کے زیر اختیار آ گئے۔[3] معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا تھا۔ ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو یونانیوں کی ایک ڈویژن فوج برطانیہ کے نہایت طاقتور بحری بیڑے کی مدد سے سمرنا میں اتری اور ترکوں کا قتل عام شروع کر دیا۔[4] عمارتوں کو مسمار کر کے اور مسلم آبادیوں کو خاک کے گھاٹ اتار کر یہ یونانی سپاہ اندرونِ ملک گھستی چلی گئی۔[5] ادھر انگریزوں نے قسطنطنیہ پر نہایت ظالمانہ انداز میں فوجی قبضہ کیا جسے کیپی چولیشن[6] کہتے ہیں۔ اس میں فاتح فوج کو مفتوح عوام کے نجی سکونتی مکانات پر تصرف کا پورا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔[7]

مملکتِ ترکیہ کی تاراجی و بربادی کا حال سن سن کر مسلمانانِ پاک و ہند میں محض اس بنا پر کہرام نہیں مچا تھا کہ وہ ایک اسلامی ریاست تھی اور اس کے مظلوم و بیکس باشندے دینی رشتے کی بدولت ان سے منسلک تھے ــــ یہ کرب، یہ کسک اور یہ درد اس لئے بھی تھا کہ "ترکی کی قسمت برعظیم کے مسلمانوں کے لئے ایک مذہبی حیثیت

---

۱ ندوی، سید سلیمان: حیاتِ شبلی، ص ۱۹۰
۲ سرائٹی، پاکستان ہسٹاریکل: A Short History of Pakistan، ص ۳۸۱
۳ ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۹۰
۴ ایورسلے، لارڈ: The Turkish Empire، ص ۴۱۴
۵ ایضاً
۶ Capitulation
۷ ریاض، سید حسن: ایضاً ۸۵

اختیار کرگئی"[1] تھی جس کا دوسرا نام خلافت عثمانیہ تھا۔

اسلام کے قدیم و مقتدر منصب خلافت کا یہ سلسلہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے شروع ہوا تھا[2] اور مختلف ملکوں اور زمانوں سے گزرتا ہوا قسطنطنیہ تک پہنچا تھا۔ برعظیم کے مسلمانوں کے لئے شروع ہی سے احترام و تقدس، ایمان و ایقان، رشد و ہدایت اور طمانیت و سکون کا مرکز تھا۔ اس مرکز سے صرف عقیدت مند مسلم عوام کو ہی وابستگی نہ تھی، شاہانِ پاک و ہند بھی خلفا کی اجازت کے بغیر اپنے آپ کو سلطنت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے[3]۔ خود سلاطین غزنی و غور نے خلیفۂ بغداد سے سند اور یمین الدولہ ولی امیر المومنین کا خطاب حاصل کیا تھا اور اپنے نام کے ساتھ ناصر امیر المومنین تحریر کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ سکوں پر بھی یہی درج ہوتا تھا[4]۔ ابن بطوطہ کی روایت کے مطابق سلطان محمد تغلق شاہ نے خلیفہ ابوالعباس سے درخواست کی تھی کہ اس کو ہندوستان اور سندھ کے ملک پر حکمرانی کرنے کا اجازت نامہ بخشا جائے[5]۔ سلطنتِ مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر نے پانی پت کی لڑائی کے بعد دلّی کی جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا[6] اور اس طرح مرکزی خلافت کا تصور ترک کر دیا گیا تھا[7]، لیکن ٹیپو سلطان نے عثمانی خلفا سے درخواست کرکے اپنے آپ کو تسلیم کرا لیا تھا[8]۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد آہستہ آہستہ تمام برعظیم میں خطبے کے اندر سلطان ترکی کا نام دنیائے اسلام کے خلیفہ اور حکمراں کی حیثیت سے شامل ہونے لگا[9] تھا۔

---

[1] ہٹی، فلپ کے: *History of the Arabs*، ص ۱۷۸

[2] ایضاً: ص ۷۰۹

[3] بطوطہ، ابن: سفرنامہ جلد دوم، اردو ترجمہ محمد حسین، ص ۱۰۳

[4] ایضاً: ۱۰۴

[5] ایضاً: ۱۰۳

[6] بابر، ظہیر الدین: تزک بابری، اردو ترجمہ میرزا نصیر الدین حیدر، ص ۳۱۸

[7] قریشی، اشتیاق حسین: *The Administration of the Sultanate of Delhi*، ص ۳۸-۳۹

[8] ایضاً: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۵۲

[9] ایضاً

لیکن اب ـــ اتحادیوں کی ملی بھگت کے نتیجے میں اسی "سلطنتِ عثمانیہ اور خلافت کی تاراجی اور لوٹ" بقول قائدِ اعظم محمد علی جناح "ہمارے مذہب پر ایک حملہ تھا"[1] ـــ اور اس حملے کے تباہ کن اثرات جزیرۃ العرب اور اماکنِ مقدسہ پر بھی اپنا تاریک سایہ ڈال رہے تھے۔

برِعظیم کے مسلمانوں کے لئے یہ سانحہ قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔ جنگ ہائے طرابلس و بلقان سے لگے ہوئے چرکے بساطِ دل پر ہنوز تازہ تھے، مسجد کانپور کے لاشۂ بےجان ابھی تک نگاہوں کے سامنے پھر رہے تھے اور برطانیہ کے وزیرِ اعظم لائڈ جارج کا درج ذیل بیان بھی یادداشت میں محفوظ تھا:

> "اور نہ ہم اس لئے جنگ کر رہے ہیں کہ ترکیہ کو ایشیائے کوچک اور تھریس کی ان زرخیز اور مشہور سرزمین سے محروم کر دیں جس کی آبادی اکثریت کے ساتھ ترکی النسل ہے"۔[2]

لیکن جو حقائق سامنے آئے، وہ کئے گئے وعدے کے سراسر خلاف تھے۔ چنانچہ مسلمانوں میں غم و غصے کا اظہار ہونے لگا اور ہیجان بڑھنے لگا۔[3] "وہ سارے جذبات جو ایک عرصے سے دبے ہوئے تھے، ایک ایسی تحریک کے نتیجے میں پھوٹ نکلے جس نے برعظیم میں حکومتِ برطانیہ کو ہلا دینے کا وہ کردار ادا کیا جو آج تک اس سے قبل کسی اور شورش نے نہیں کیا تھا"[4] ـــ اور یہ تھی تحریکِ خلافت!

اس تحریک کا آغاز صحیح معنوں میں ۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء کو ہوا جب لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔[5] جب نومبر ۱۹۱۹ء میں اس کمیٹی کا پہلا باقاعدہ جلسہ فضل الحق کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا تو تمام مسلمانوں

---

[1] منقول پیرزادہ شریف الدین: Foundations of Pakistan، جلد اول، ص ۵۴۲

[2] سیتارامیا، پٹابھائی: The History of the Indian National Congress، جلد اول، ص ۱۸۹

[3] نہرو، جواہر لال: An Autobiography، ص ۷۶

[4] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، ص ۳۵۴

[5] ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۸۵

کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ فرنگی حکومت کی جانب سے منائے جانے والے جشن صلح میں شریک نہ ہوں اور اس کے خلاف سارے ملک میں جلسہ کریں۔ اور اگر صلح کانفرنس کا فیصلہ ان کے خلاف ہو تو ولایتی مال کا بائیکاٹ کریں۔[1] گویا انگریزوں کے خلاف معرکہ آرا ہونے کا یہ اجتماعی فیصلہ تھا۔ اس سے اگلے مہینے دوسرا اجلاس امرتسر میں ہوا، جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ یہاں یہ طے پایا کہ مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان بھیجا جائے جو وزیر اعظم برطانیہ کے سامنے مسلمانانِ ہند کے مطالبات پیش کرے۔ اسی عرصے میں دوسرا وفد ہند کے وائسرائے سے ملا اور ایڈریس پیش کیا جسے مولانا محمد علی نے لکھا تھا۔[2] اس میں یہ کہا گیا تھا کہ سلطنت ترکیہ کی سالمیت اور خلیفہ کی حیثیت برقرار رکھی جائے تاکہ دینی اور دنیوی دونوں حیثیتوں سے خلافت کا وجود قائم رہے۔[3] لیکن وائسرائے سے اس ملاقات کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ادھر مجوزہ وفد انگلستان پہنچا اور مولانا محمد علی جوہر نے بڑی جرأت اور بے باکی سے وزیر اعظم جارج کے سامنے مسلمانانِ ہند کے مطالبات پیش کیے۔[4] لیکن ع واں اک خامشی تری سب کے جواب میں!

وزیر اعظم برطانیہ کے مایوس کن جواب کی اطلاع جب اہل وطن کو ملی تو خلافت کمیٹی نے اعلان کیا کہ ملک بھر میں یوم غم منایا جائے اور عام ہڑتال ہو۔[5] اس کے بعد حکومت سے عدم تعاون کا جامع منصوبہ تیار کیا گیا ـــــ اب برطانوی حکومت کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی شروع ہو گئی۔

خلافت کمیٹی کی شاخیں شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں قائم ہو گئیں۔[6] کوئی گھر

---

[1] ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۸۶

[2] ایضاً: ص ۸۸

[3] ایضاً

[4] ایضاً، ص ۹۰

[5] ایضاً، ص ۹۱

[6] دریابادی عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول ص ۹۶

ایسا نہیں رہا جس کا کوئی نہ کوئی آدمی خلافت کارکن نہ ہو۔ جوان، بوڑھے، عورتیں اور بچے جذبات و خیالات میں سب خلافتی تھے۔"[۱]

خلافت کمیٹی کے قیام کے وقت مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جیل میں تھے "لیکن جب سے باہر نکلے، خلافت کمیٹی پر ایسا چھا گئے کہ لوگ اس کے بانیوں کو بھول ہی گئے اور زبانوں پر صرف محمد علی شوکت علی کے نام رہ گئے۔ یہ خلافت کمیٹی کے مرادف اور خلافت کمیٹی ان کے مرادف۔"[۲] علی برادران پورے ملک کا طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ عوام میں حکومت برطانیہ کی بدعہدی کے افسانے دہرا رہے تھے۔ ترکوں پر ڈھائے گئے مظالم کی روداد سنا رہے تھے۔ ان کی زبانیں آگ اگل رہی تھیں اور عوام کے دلوں میں جذبات کے شعلے فروزاں کر رہی تھیں۔ اس مہم میں یہ دو بھائی تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتوں کے قائد شریک تھے۔ ہندو اور مسلم سب ہی ہم آواز ہو کر برطانوی استبداد کے پرخچے اڑانے پر تلے ہوئے تھے۔ "سرکاری تعلیم گاہوں، سرکاری خطابوں اور سندوں، کونسلوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جا رہا تھا۔"[۳]

یہی وہ زمانہ تھا کہ مالابار کے موپلوں نے انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا۔ تار کاٹے گئے، ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، سرکاری عمال کو قتل کیا گیا، قیدیوں کو جیل سے رہا کرایا گیا، کچہریاں لوٹی گئیں، ہتھیاروں پر قبضہ کیا گیا۔ غرض فرنگیوں کے مقابلے میں یہ لوگ پوری طرح صف آرا ہو گئے۔[۴] برطانوی حکومت کے خلاف موپلوں کی اس محاذ آرائی کے "جواب میں نہایت انتقامی جذبے کے ساتھ جو مظالم کئے گئے وہ دنیا کی تاریخ مظالم میں بھی ہولناک ہیں۔"[۵]

---

۱ ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۰۰

۲ دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۹۶

۳ پرشاد، راجندر: اپنی کہانی، ص ۲۴۳

۴ واقعہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ریاض، سید حسن: ایضاً ص ۱۱۰ و بعدہ

۵ ایضاً، ص ۱۱۳

ناظرین! تحریک خلافت کا یہ دور برعظیم پاک و ہند کی سیاسی فضا کو جس طرح پیش کر رہا تھا، اس کا حال رئیس احمد جعفری کی زبانی سنئے:

"یہ زمانہ تھا طوفان کا، حوادث کا، انقلاب کا، ایسا طوفان جس نے ملک کے طول و عرض میں تلاطم برپا کر دیا، ایسے حوادث کا جنہوں نے رونما ہو کر ملک کی سیاسیات میں ایک نئی زندگی، ایک نئی تڑپ اور ایک نیا ابھار پیدا کر دیا۔ ایسے انقلاب کا جس نے بلند کو پست اور پست کو بلند کر دیا۔ ...... جس نے حکومت کا رعب ختم کر دیا، جس نے پولیس کی لاٹھیوں اور فوج کی گولیوں کا ڈر دل سے نکال دیا، جس نے جیل خانوں کو نشاط خانہ اور پھانسی کے تختے کو حاصلِ زندگی بنا دیا۔"[1]

ان شورشوں اور ہنگامہ آرائیوں میں فرنگیوں کو اپنا وجود خطرے میں گھرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ برعظیم میں اپنے تحفظ کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ اور وہ موقعہ بالآخر انہیں مل ہی گیا جب جولائی ۱۹۲۱ء میں، خلافت کانفرنس کے اجلاس میں، صاحب صدر مولانا محمد علی جوہر نے یہ اعلان کر دیا:

"آج سے فوج میں نوکری کرنا یا رنگروٹوں کی بھرتی میں مدد دینا ہر ایمان دار مسلمان کے لئے حرام ہے۔ اور یہ بھی کہ اگر حکومت برطانیہ نے حکومت انگورہ سے جنگ کی تو مسلمانان ہند سول نافرمانی شروع کریں گے، کامل آزادی قائم کریں گے اور احمد آباد کے اجلاس کانگریس میں ہندوستانی جمہوریت کا جھنڈا بلند کر دیں گے۔"[2]

حکومت برطانیہ نے تحریک خلافت کے روح رواں مولانا جوہر کے اس صدارتی خطبے کو یہ کہہ کر مقدمے کا جواز بنا لیا کہ انہوں نے "ایک باغیانہ تقریر کی تھی اور ایک باغیانہ ریزولیشن

---

[1] جعفری، رئیس احمد: حیات محمد علی جناح، ص ۹۹-۱۰۰

[2] منقول ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۱۴

پاس کرایا تھا جس سے مسلم سپاہیوں میں سرکار انگریزی کے خلاف بددلی و ناراضگی پھیلی"[۱]۔
کراچی میں مقدمہ چلا اور دو دو سال کی قید با مشقت کی سزا نہ صرف علی برادران کو بلکہ ان کے ساتھ مختلف سیاسی رہنماؤں کو ملی[۲]۔

دوسرے سال مہاتما گاندھی نے جو ترک موالات کی تحریک چلا رہے تھے، چورا چوری کے واقعہ[۳] کے بعد اسے بند کردیا۔ انہیں بھی چھ سال کی سزا ملی۔ ان رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد تحریک خلافت کی جان نکل گئی اور عوام کے ذہن برعظیم اور غیر ممالک میں مختلف واقعات رونما ہونے کے باعث دوسرے راستوں کی طرف مڑ گئے"[۴]۔

ناظرین!۔ آپ نے بخوبی محسوس کرلیا ہوگا کہ دو سال کے عرصے پر محیط یہ تحریک جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ایک زریں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی بدولت عوام میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور برطانوی حکومت کے خلاف منظم طور پر صف آرا ہونے کا حوصلہ بے پایاں دلوں میں فروغ پایا۔ اس تحریک کے دوران بہنے والے لہو سے جذبۂ حریت کی ہزاروں قندیلیں روشن ہوگئیں جن سے اگلی دو دہائیوں کی تاریکیاں تیزی سے چھٹتی نظر آنے لگیں۔ آیئے ہم تاریخ آزادی کے اس منور دور کی شاعری کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ سان ریمو کے متعصبانہ اور منتقمانہ صلح نامے[۵] کے بعد ترکوں کو ہماری تقریروں اور تحریروں سے عزم و ہمت کی جو روشنی ملی تھی[۶] اس میں ہمارے شاعروں کا کیا حصہ تھا۔

---

[۱] دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۹۹

[۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تھرانی، آر وی: Historical Trial of Ali Brothers & Fife others

[۳] فروری ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے ایک جلوس نے چورا چوری کے تھانے کو آگ لگادی۔ پولیس کے تمام آدمی جو سب کے سب ہندوستانی تھے، آگ کے شعلوں میں جل کر خاک ہوگئے"۔
منقول قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۶۰

[۴] معاہدۂ سیورے (سان ریمو، پیرس)

[۵] مولانا محمد علی نے اپنی ایک تقریر میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ "لالہ لاجپت رائے سے ترکوں نے کہا تھا کہ تمہارے ہندوستان کے بھیجے ہوئے چندے سے ہمارا اتنا کام نہیں نکلا جتنا کہ ہندوستان والوں کی تقریروں اور تحریروں سے"۔ ملاحظہ ہو علی، مولانا محمد: مقالات، حصہ اول، ص ۲۱۷

مولانا محمد علی جوہر نے اس دینی فریضے کی بجا آوری میں کچھ اس طرح غرق ہوئے کہ اپنے اہل و عیال اور عزیز و اقارب "سب کو بھولے پڑے، سب سے چھوٹے ہوئے تھے"[1] اجلاس امرتسر کے فیصلے کے مطابق ۱۹۳۰ء کے اوائل میں وہ انگلستان گئے اور لندن و پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں نہایت پرجوش اور مدلل تقریریں کیں اور قوم یورپ کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور مطالبات سے اچھی طرح آگاہ کیا[2] یہ امر واقعہ ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ سلطنت برطانیہ مسلمانوں کے خلاف بغض و عناد کا جذبہ رکھتی تھی، ایک "غلام ملک" کا باشندہ اسی کی سرزمین پر اسی کے جارحانہ رویے کے خلاف آگ اگل رہا تھا۔ ذرا دیکھئے، جوہر کا یہ ایک شعر اس پورے منظر کو کس لطافت و بلاغت کے ساتھ پیش کر رہا ہے اور ان کے بے پایاں حوصلہ و جرأت کی کیسی سچی تصویر نگاہوں میں پھر رہی ہے ؎

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

عاشق اسلام کی اس پکار میں جو گھن گرج، جو طنطنہ، جو گمک پائی جاتی ہے اس نے برطانوی جفا کاروں کے دل ضرور ہلا دیے ہونگے۔

آزادی کے اس شیردل مجاہد کے جذبے کو مفلوج و مجروح کرنے کے لئے طرح طرح کے ایذا رساں تجربات اس دور میں بھی دہرائے گئے، اور "حکم ہوا کہ ۲۴ مہینوں تک سب سے الگ، قید فرنگ میں بند رہنے کا ملا"[3] اس تلخ پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم جوہر کی درج ذیل غزل پڑھتے ہیں تو ملک و ملت کے لئے ان کی بے مثال قربانیوں کا معترف ہونا پڑتا ہے ؎

گھر چھڑایا یوں کہ چھوڑنے والے | ہم نہ تھے ان کے آستانے کے
ایک ایک کرکے سب تنکے | ہوئے برباد آشیانے کے

---

[1] دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۹۹
[2] ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۹۳
[3] دریابادی، عبدالماجد: ایضاً، ص ۱۰۳

کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے
دیکھئے اب یہ گردش تقدیر کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے ہو کیا بود و باش کا حال ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

ان اشعار کو پڑھ کر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جوہر کے ذہن و دل پر حزن و یاس کی چھاپ پڑ گئی ہے اور وہ انتہائے دل گرفتگی کے عالم میں قید تنہائی کا ذکر کر رہے ہیں. مولانا کا ایسا رجحان قطعاً نہیں تھا. درج بالا اشعار میں ان حالات و واقعات کو پیش کیا گیا ہے جن سے "شہنشاہ برطانیہ کے خلاف سازش کرنے والا ایک ملزم"[1] دوچار ہوا تھا ___ لیکن آزادی کے اس مجاہد نے ان مزاحمتوں سے دل برداشتہ ہو کر سپر نہیں ڈالی تھی۔ بیجاپور کی بلند و بالا دیواروں کے حصار میں رہ کر بھی وہ اپنے عزم راسخ، اپنی قوت ارادی اور اپنے آہنی جذبے کا اس طرح اظہار کر رہا تھا ؎

نہ اڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے ذرا پر باندھنا صیاد کس کے

جنگ عظیم گرچہ ترکوں کی تباہی کا موجب بنی تھی، لیکن اب ان کے مستقبل کی باگ ڈور مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ انہوں نے یونان سے مقابلہ کیا اور سمرنا پر قبضہ کر لیا۔ برعظیم کے مسلمانوں کے لئے یہ خبر مژدۂ جاں فزا سے کم نہ تھی۔ وہ جس سلطنت کی بقا و سالمیت اور جس خلافت کے تحفظ کے لئے عرصے سے سرگرم عمل تھے، اس کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ پا بجولاں محمد علی کے لئے باہر کی دنیا مقفل ہو چکی تھی ___ مگر یہ خبر بقول مولانا عبدالماجد دریابادی اس طرح پہنچی کہ "ایک دن دور سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے"۔[2] خوشی کے اس نعرے نے مسلمانانِ عالم کے اس والہ و شیدا کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا اور وفور جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے جو غزل لکھی، وہ تحریک خلافت کے جملہ اغراض و مقاصد کا نچوڑ ہے۔ اس کا ہر ہر مصرع حرف لکھنے والے کی تمناؤں، دعاؤں اور سرگرمیوں کا مظہر نہیں، برعظیم کی ملتِ

---

[1] مقدمہ کراچی کا الزام، منقول نقدانی آزوی: Historical Trial of Ali Brothers & Five Others، ص ۳-۴

[2] دریابادی، عبدالماجد: مقالاتِ ماجد، ص ۲۰۷

اسلامیہ کی آرزوئے حیات اور نقطۂ نظر کا بھی ترجمان ہے۔ دنیا سے بے تعلق کر دیے جانے کے باوجود شاعر اہلِ دنیا کے ہی جذبات و احساسات کی عکاسی کر رہا ہے۔ داخلی اور خارجی جذبات کے اظہار کی ایسی مثال مشکل ہی سے کہیں مل سکے گی۔ اس الہامی غزل کے چند شعر پیشِ خدمت ہیں ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

شیطانِ حیلہ باز کا جادو نہ چل سکا
تفسیر آج ہو گئی کیدِ متین کی

ہے نامِ مصطفےٰ کی یہ برکت کہ پھر خدا
یوں جڑ جما رہا ہے محمدؐ کے دین کی

ترکی کی مملکتِ اسلامیہ کا استحکام و عروج ہی دراصل جوہر کا مقصدِ حیات تھا اور اسی کی خاطر وہ برطانوی استبداد سے ٹکرائے تھے اور بیجاپور جیل میں سختیوں اور صعوبتوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے ــــ اس عالمِ قید میں ترکوں کے نئے اقدامات نے انہیں جو قلبی سکون پہنچایا تھا، اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی
مظلوم کی دعا بھی کہیں بے اثر گئی

عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا
ہم بیکسوں کی آہ عجب کام کر گئی

تحریکِ خلافت کیا؟ تحریکِ آزادی کو دبانے کے لئے برطانوی طاقت ہر طرح کے حربے آزما رہی تھی۔ کہیں ظلم و تشدد کی کارفرمائی تھی، کہیں فرقہ واریت کو ہوا دی جا رہی تھی، کہیں تعزیراتِ ہند کے تحت حریت پسندوں کو داخلِ زنداں کیا جا رہا تھا ــــ لیکن محمد علی جیسا مردِ حر مایوس و غمزدہ نہیں تھا۔ اسے ہر امتحان کے پس پردہ امید کی جھلک نظر آ رہی تھی اور ہر ابتلا و آزمائش اسے تسلیم و رضا کا درس بے بہا دے رہی تھی ؎

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے شکوہ نہ گلہ

اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

امید کے اسی پرتو اور تسلیم و رضا کے اسی اصول نے مولانا محمد علی جوہر کو توپ و تفنگ کی یورش اور طوق و سلاسل کے سائے میں بھی سرگرم عمل رکھا اور وہ آزادیٔ وطن کے لئے نذرانۂ جاں پیش کرتے رہے ؎

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہرؔ

کام کرنے کا یہی ہے، تمہیں کرنا ہے یہی

اب ہماری نظر اس دور کے دوسرے اہم شاعر مولانا ظفر علی خاں پر مرکوز ہو رہی ہے۔ ہم پہلے ہی یہ دیکھ آئے ہیں کہ وہ انگریزوں کو ملّتِ اسلامیہ کا بدترین دشمن سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان سے ہر لحاظ پر دست و گریباں رہے، ہر میدان میں ان کے خلاف صف آرا ہوئے — اور جب برطانیہ نے اتحادیوں کا ساتھ دے کر مملکتِ ترکیہ کو پارہ پارہ کرنا شروع کیا تو مولانا ایک زخمی شیر کی طرح دشمنانِ اسلام کے مدمقابل آ گئے۔ ان کا اخبار، ان کی نثر، ان کی نظم، حتّٰی کہ ان کی عملی کوشش — سب کچھ تحریکِ خلافت کے لئے وقف تھا۔ دنیائے شعر و ادب کے اس فعال رکن سے فرنگی حکام کو ہمیشہ خطرہ درپیش رہا۔ چنانچہ کبھی "زمیندار" آلۂ ستم بنتا رہا اور کبھی مولانا جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں مقید کئے جاتے رہے۔[1] مگر ان کی شاعری تحریک کو جاندار بنانے میں پیش پیش رہی۔

پہلی جنگِ عظیم کے نتیجے میں جب ترکی کے حصے بخرے ہونے لگے، مقاماتِ مقدسہ پر انگریزوں کے اثرات غالب آنے لگے اور خلافت کی قدیم روایات پر زد پڑنے لگی تو مولانا اس کا شکوہ نہ تو اتحادی قوتوں سے کرتے ہیں، نہ ہی اسلامی ممالک سے!۔ وہ براہِ راست خدائے بزرگ و برتر سے مخاطب ہو کر شکایات کا دفتر کھول دیتے ہیں اور اس انداز سے کھولتے ہیں کہ اس میں بےبسی بھی ہے، حزن و

---

[1] قریشی، محمد عبداللہ: اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر، مطبوعہ نقوش (طنز و مزاح نمبر) لاہور، جنوری فروری ۱۹۵۹ء، ص ۷۷۸

یاس بھی ہے، استغفار بھی ہے اور تشویش بھی ؎

خدایا تیرے گھر کی خاک اڑائی جا رہی ہے کیوں
قیامت وقت سے پہلے آئی جا رہی ہے کیوں
بجائی جا رہی ہے اینٹ سے کیوں اینٹ کعبے کی
خلیل اللہ کی بنیاد ڈھائی جا رہی ہے کیوں
اڑائے جا رہے ہیں کس لئے پرزے خلافت کے
رسول اللہ کی دولت لٹائی جا رہی ہے کیوں
وہ تیغ اعدا کے سر پر جس کو بجلی بن کے گرنا تھا
ہماری گردنوں پر آزمائی جا رہی ہے کیوں

ظفر علی خاں صرف شکوہ سنجی پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ وہ دشمنانِ اسلام کی تباہی کے لئے خدائے قہار کی شان قہاریت کو آواز بھی دیتے ہیں ؎

تری غیرت کی بجلی تلملاتی کیوں نہیں یارب
حریفوں کو جلال اپنا دکھاتی کیوں نہیں یارب

اور جب دشمنوں کی ستم گری ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے اور مسلمانوں کا وجود خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے تو ظفر علی خاں فریاد و فغاں، التجا و التماس اور دعا و منت کا طریقہ اختیار کر کے رحمتِ یزداں سے یوں خطاب کرتے ہیں ؎

کر انصاف تو ہی کہ کیا روا ہے
ذلیل اس طرح امتِ مصطفےٰ ہو
معلق ہو کوہ غم اسلامیوں پر
مصیبت میں چھوٹا بڑا مبتلا ہو
برس جائے پھر تری رحمت کا بادل
پھر اسلام کا باغ یارب ہرا ہو
ہے اس وقت کا منتظر گوشِ ملت
کہ نقارہ اسلام کا بج رہا ہو

مولانا نے کبھی شکوہ سنجی کے ذریعے، کبھی فریاد و فغاں کے لہجے میں اور کبھی منت و

آرزو کے سہارے خدا کو مائل بہ کرم کرانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ ان کی اسلام دوستی اور مسلمانوں کے لئے ان کے بے پناہ درد و خلوص کا مظہر ہیں۔

جب ترکوں نے عزم و ہمت کو رہنما بنا کر قدم آگے بڑھایا اور بیرونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے تو اس کا نتیجہ ناظرین پر واضح ہے۔ مولانا کی مسرت و شادمانی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ وہ ملت اسلامیہ کے اس جرأت مندانہ اقدام کا ذکر جس جذبے سے کر رہے ہیں، اس میں فخر و غرور بھی ہے، جوش و خروش بھی ہے اور احساس طمانیت بھی!۔ تحریک خلافت کے دور کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم ان کے درج ذیل اشعار پڑھتے ہیں تو ان کی جرأت و بے باکی کا قائل ہو جانا پڑتا ہے ؎

میانوں سے نکل آئیں تڑپ کر پھر وہ شمشیریں
ملیٹ دی ہیں جنہوں نے شرق و غرب کی تقدیریں
پڑا ہے زلزلہ دنیا میں پھر لزبن سے پیکن تک
بلند اک ساتھ ہوتی ہیں مسلمانوں کی تکبیریں

ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا
اس کی عزیمتوں نے بہ تائید ذوالجلال
جو سلطنت زمانہ کی سرتاج تھی کبھی
اس کا وقار از سر نو کر گیا بحال
چرکے دیئے صلیب پرستوں کو پے بہ پے
لے کر بڑھا وہ ہاتھ میں جب خنجر ہلال

عثمانیوں کے خنجر خارا شگاف نے
یورپ کے کافروں کو مسلمان کر دیا
مشرق کو زندہ کر نہیں سکتا خدا بھی آج
مغرب کے اس عقیدے کا بطلان کر دیا

ایسے وقت میں جبکہ برطانیہ و فرانس اور ان کے جملہ حلیف اسلامی مملکت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے تھے، مولانا ظفر علی خاں مسلمانوں کے روشن

اور تابناک مستقبل کی یوں بشارت دے رہے تھے ؎

وہ وقت آنے کو ہے جب ایشیا کی طرح یورپ بھی
رسول اللہ کے خوانِ کرم سے ریزہ چیں ہوگا
بجے گا سطوتِ کبریٰ کا ڈنکا ساری دنیا میں
زمیں ملک یمن ہوگی فلک زیرِ نگیں ہوگا
خلافت اقتدار اپنا زمانے پر بچھائے گی
مطاعِ دہر قسطنطنیہ کا مسند نشیں ہوگا
اڑائے جائیں گے ابلیس کے قانون کے پرزے
کتابِ عدل کا شیرازۂ بند آئینِ دیں ہوگا

مولانا ظفر علی خاں نے اپنے ولولہ انگیز نغموں سے برعظیم کے مسلمانوں میں خلافت کے تحفظ کا جو حوصلہ پیدا کر دیا تھا اس نے انہیں نہ صرف اس دور میں فعال و متحرک رکھا بلکہ آنے والے دور کے لئے بھی تیار کر دیا۔

اب آئیے رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کی طرف جو ابتدا ہی سے تحریکِ خلافت کے سرگرم کارکن رہے تھے، اور جیسا کہ پچھلے باب میں لکھا جا چکا ہے، وہ خلافت کانفرنس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔ جب برعظیم کے مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ ترکی کے سلطان نے جنگ عظیم میں شرکت کر لی ہے اور اس شمولیت کو جہاد قرار دیا ہے[1] تو ان میں غضب کا جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا[2] یہی وہ زمانہ تھا کہ خدام کعبہ[3] کے زیرِ انتظام سات سو حاجی ترکی کی طرف سے جنگ میں حصہ لینے کے لئے حجاز میں ٹھہرے ہوئے تھے[4] حسرت موہانی پہلے شاعر

---

[1] قریشی، اشتیاق حسین: Ulema in Politics، ص ۲۴۴

[2] ایضاً، ص ۲۶۱

[3] شوکت علی نے مولانا عبد الباری کے تعاون سے ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی تھی جس کا مقصد اسلام کے اماکن مقدسہ، مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں جانے سے بچانا تھا۔ اور اگر ایسا موقع آئے تو اس مقصد کے حصول کے لئے ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لئے مسلمانوں کو متحد کرے۔ منقول قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۵۰

[4] قریشی، اشتیاق حسین: Ulema in Politics، ص ۲۴۴

میں جنہوں نے جنگ کے دوران ہی اسلامی جوش و خروش کا اظہار کر دیا تھا[1] ؎

ترے فیض کرم سے دین کے دریا میں جوش آیا
ترے یمن قدم سے باغ ایماں میں بہار آئی

تری محفل سے اے پیر مغان عاشقی اکثر
مشیخت نے نواز آئی، فضیلت نے گسار آئی

الٰہی رنگ یہ کب تک رہے گا ہجر جاناں میں
کہ روز بے دلی گزرا تو شام انتظار آئی

مغرب کی استعماری قوتیں پہلی جنگ عظیم کے دوران ایک منظم سازش کے ذریعے اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی تھیں۔ کرنل لارنس اس کی نمایاں مثال تھا[2]۔ لیکن حسرت موہانی کو یقین واثق تھا کہ دشمنوں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ سن ۱۹۱۸ء ہی میں لکھی ہوئی ایک دوسری غزل کا درج ذیل شعر ان کے اس یقین کی گواہی دے رہا ہے ؎

دشمنوں کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹوں گا
اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے

اس دور کے حقائق گرچہ بہت تلخ تھے اور مسلمانوں کی بقا و سالمیت پر مغربی اقوام کی مسلسل ضربیں پڑ رہی تھیں، لیکن بہ ایں عالم حزن و یاس حسرت کو رحمت خداوندی کے نزول کی بھرپور امید تھی۔ ملاحظہ ہو یہ شعر ؎

پا کر مجھے بیکس تری رحمت یہ پکاری
یہ بندۂ بے برگ و نوا میرے لئے ہے

جب ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے تحت عملی اقدامات کئے گئے تو حسرت اس کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے انہوں نے اس کے مقاصد کو

---

[1] حسرت کی ایک غزل جس کے منتخب اشعار اسی صفحے پر درج کئے گئے ہیں، جنگ عظیم چھڑنے کے بعد اور تحریک خلافت کے آغاز سے قبل ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو "کلیات حسرت" حصہ سوم، ص ۱۱۷

[2] خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: کلام اقبال کا تاریخی و سیاسی پس منظر، مطبوعہ "صریر خامہ" (قومی شاعری نمبر) سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵

عملی جامہ پہنانے کی مسلسل سعی کی، حتیٰ کہ گوریلا طریقۂ جنگ کی بھی تبلیغ کی جس کے نتیجے میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔[1] یہ وہی گرفتاری ہے جس کے دوران حسرت نے ایک فیصلہ یہ بھی کیا تھا کہ غزل دکھیں گے، یہ جیل سے باہر بھیجی جائے گی اور اخبارات و رسائل میں چھپے گی۔[2]

اس دور کی غزلیں حسرت کے سیاسی رجحان و نظریے کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ ذیل میں درج کئے ہوئے منتخب اشعار اس رائے کی صداقت کے بین ثبوت ہیں ؎

چمن جاں میں پھر تقلید فرنگ — عاشقی کی بہار آئی ہے
نیا حبس اس نے کوئی شر اٹھایا — پیرا ایذا پسندی نے دعا دی

ہوتی ہے روز بارش عرفاں مرے لئے — گویا بہشت عشق ہے زنداں مرے لئے
ناکامیٔ طلب میں کہ ہے جان عاشقی — گنجینۂ مراد ہے پنہاں مرے لئے
رہتی ہے روز اک ستم تازہ کی تلاش — بے چین ہے وہ فتنۂ دوراں مرے لئے

ہم بیکسوں کو قتل جو کرتا ہے بے گناہ — کچھ اے عزیز تجھ کو خدا کا بھی ڈر نہیں[3]

بے خطا بھی گنہگار ہیں ہم — آپ جو کچھ کہیں وہی ہے بجا
یہ کس بزم کے ہم نکالے ہوئے ہیں — کہ محرومیوں کے حوالے ہوئے ہیں

جذبۂ حریت کے اظہار کے نتیجے میں حسرت موہانی کو قید بامشقت کی جو صعوبتیں دیکھنا نصیب ہوئیں ان سے ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ ان کا نظریہ کوہِ گراں کی طرح اٹل تھا۔ برطانوی ظلم و استبداد سے خائف ہو کر انہوں نے جرم عاشقی یعنی طلب آزادی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ درج ذیل اشعار ان کے عزم محکم کے گواہ ہیں ؎

ترک جرم عاشقی ممکن نہیں — پھر اسی کا ہم سے ہوگا ارتکاب

---

[1] منقول: مقدمہ، کلیاتِ حسرت، ص ۲۵

[2] ریاض، حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۲۱

[3] یرودا سنٹرل جیل، پونہ میں لکھی گئی ایک غزل کا یہ شعر بظاہر تو روایتی مضمون پر مشتمل ہے، لیکن بادی النظر میں ستم گر فرنگیوں پر ایک کھلا طنز بھی ہے جن کے عقیدۂ تثلیث میں خدا کا وجود پایا جاتا ہے۔

لطف کی ان سے التجا نہ کریں ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
ہم رضا کار ہیں خدا کی قسم ہم نہ ہوں گے مگر شہید وفا
زنجیر سے بیزار ہیں شمشیر کے مشتاق سب تیرے گرفتار ہیں تعزیر کے مشتاق

حسرت کی غزلوں میں سیاسی حالات و واقعات کا حرف اظہار ہی نہیں ہوا ہے، ان سے نبرد آزما ہونے کا پیغام بھی ہے' تاریکیوں میں مشعلِ آرزو جلائے رکھنے کی تلقین بھی ہے اور منزلِ مقصود کے قریب تر آنے کی خوش خبری بھی!۔ ذرا تصور کیجئے حرماں نصیبی' ستم گری اور رجاں کنی کے اس دور کا جب برطانوی حکمراں تحریکِ خلافت اور اس کے پسِ پردہ جذبۂ حریت کو کچلنے کے لئے ہر طرح کا حربہ آزمارہے تھے' جب برعظیم کے تمام قید خانے حریت پسندوں سے بھر گئے تھے' جب گولیاں نعرۂ حق بلند کرنے والوں کے سینے چھلنی کئے دے رہی تھیں اور موپلوں کا قتلِ چنگیزی عوام کے خوف و ہراس کو فزوں کر رہا تھا ـــــ اس موقع پر حسرت کی غزلوں نے قید خانے سے نکل نکل کر ملت کی بڑی دلجوئی کی ہوگی' بڑا سہارا دیا ہوگا' ان کی ہمت و حوصلے کو دو چند کر دیا ہوگا۔ حسن و عشق کے شاعر کے کلام کا یہ پہلو عبث محتاجِ نظر رہا ہے۔ آیئے ہم تو اس ادبی جرم کا ارتکاب نہ کریں ؎

عاشقو ہجر سے نہ ہو بیزار غمِ جاناں کا احترام کرو
رات رو رو کے جس طرح کاٹی اسی صورت سے دن کو شام کرو
گفتگو' ہیچ ہے' اگر چاہو کامِ جاں کا حصول کام کرو
موت سے پہلے ہی نہ راہ رکھا مرشدِ عاشقی میں نام کرو
کھل سکے جب تلک نہ راہِ مراد منزلِ صبر میں قیام کرو

عاشقو دور نہیں منزلِ مقصودِ وصال بادپائے طلبِ یار کو مہمیز کرو

دلگیر کیوں ہو غلغلۂ اعدا سے دوستو کیا ڈر نہیں کہ فضلِ خدا ہے تمہارے ساتھ

کچھ بھی شہرِ وصال دور نہیں جذبۂ شوق ہو جو راہ نما

منصور کی سولی پہ نمایاں ہوئی عظمت
ہے طنطنۂ اہلِ رضا دار پہ موقوف
قوت کی جو پوچھو تو یہ ہوتی ہے ہمیشہ
اقوام میں افراد کے ایثار پہ موقوف

اب ہم اس تحریک کے تعلق سے اقبال کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ، کانگریس اور خلافت کمیٹی کا مشترکہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا تھا جس میں علامہ نے بھی شرکت کی تھی۔ جلسے کی منظور شدہ ایک قرارداد کے بموجب مولانا محمد علی ایک وفد لے کر یورپ گئے تاکہ برطانوی وزیر اعظم کو خلافت کی اہمیت و افضلیت سے آگاہ کریں اور اس ضمن میں انصاف کے طلب گار ہوں۔ لیکن اقبال نے اس نظریے کی سخت مخالفت کی اور صاف صاف بتا دیا"[1]

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

اقبال اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ دشمنانِ اسلام چراغِ مصطفوی[2] کو بجھانے کے ہمیشہ درپے رہے ہیں۔ اگر اتحادی قوتوں نے مملکتِ ترکیہ کے خاتمے کا جامع منصوبہ بنا کر ہر چہار جانب سے اس پر حملہ کر دیا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ایسا کرنا تو ان کی سرشت میں داخل ہے۔ لیکن ان کے خیال میں یہی کشاکش پیہم ملت بیضا کی تاب و تب کا موجب بھی ہے۔ اقبال نے اپنی خیالات پر مبنی ایک چھوٹی سی نظم "ارتقا" کے عنوان سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۲۰ء

---

[1] خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: کلام اقبال کا تاریخی و سیاسی پس منظر، مطبوعہ "صریر خامہ"، (قومی شاعری نمبر)، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۶ء، ص ۲۶
نیز سالک، عبد المجید: ذکر اقبال، ص ۱۰۷

میں پڑھی تھی جو پیسہ اخبار لاہور کے ۱۵ اپریل ۱۹۲۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی[1]، یعنی تحریک خلافت کے ابتدائی دور میں۔ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی

جنگ عظیم کے نتیجے میں سلطنتِ ترکیہ اور خلافتِ عثمانیہ پر جو شدید ضرب پڑ رہی تھی، اس سے متاثر ہو کر اقبال نے اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" لکھی جس میں بقول عبدالمجید سالک "فاتح اقوام کی دھاندلی، ان کی ابلیسانہ سیاست، سرمایہ داری کی عیاری، عالمِ اسلام خصوصاً ترکانِ آلِ عثمان کی بے دست و پائی پر موثر اور بلیغ تبصرہ کیا ہے"[2]

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
حکمتِ مغرب سے ملّت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اقبال نے اس نظم میں مسلمانوں کے تلخ حالات پر محض تبصرہ ہی نہیں کیا تھا، مشکلات و مصائب پر قابو پانے کی تجاویز بھی پیش کی تھیں، مغرب کی استعماری

---

[1] سالک، عبدالمجید: ذکرِ اقبال، ص ۱۰۹

[2] ایضاً، ص ۱۱۰

قوتوں سے بنرد آزما ہونے کا طریقہ بھی بتایا تھا اور عمل کی نئی سمت کی نشان دہی بھی کی تھی ؎

ربط و ضبط ملّت بیضا ہے مشرق کی نجات

ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اسی نظم مذکورہ کے آخری بند میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

سنہ ۱۹۲۲ء میں اقبال نے آنے والے دور کی جو دھندلی سی تصویر پیش کی تھی[1] وہ سنہ ۱۹۲۳ء میں بالکل واضح ہوگئی جب ملّت ترکیہ جدوجہد آزادی میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور اس کی آبرومندانہ زندگی کا ساز و سامان مہیا ہو گیا۔ چنانچہ اقبال کی نظم "طلوعِ اسلام" جو اسی سال لکھی گئی[2]، ترکانِ احرار کے امید افزا اور ولولہ انگیز دور کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی

افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا

سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

---

[1] نظم "خضرِ راہ" اسی سال لکھی گئی۔ بحوالہ خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: کلامِ اقبال کا تاریخی و سیاسی پس منظر۔ مطبوعہ "صریرِ خامہ" (قومی شاعری نمبر) سندھ یونیورسٹی حیدرآباد۔ ص ۲۶

[2] خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: ایضاً

ہوئے احرارِ ملّت جادہ پیما کس تجمل سے

تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں

کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

اقبال کی ان دونوں نظموں نے بقول عبدالمجید سالک "اس زمانے میں مسلمانوں کو بہت بڑا اسبھار دیا اور ان کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دور کے بعد صراطِ مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا"۔[1]

ہمیں جنگِ بلقان کے شاعر ہاشمی فرید آبادی بھی اس تحریکِ خلافت کے دور میں عزم و عمل کا رجز پڑھتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اشعار کیا ہیں' پوری ملّتِ اسلامیہ کے ولولہ و شوق کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ذرا اسے آپ بھی ملاحظہ کیجئے ؎

ہر سمت سے منہ پھیر کے باندھے ہوئے احرام

ہے کعبۂ مقصود کی جانب مرا اقدام

ہمّت ہے بہ اندازۂ دشواریٔ منزل

ملتا ہے صعوبت میں سفر کی مجھے آرام

چبھتے ہوئے کانٹوں میں ہے مہمیز کی تاثیر

رستے کی ہر افتاد میں برخیز کا پیغام

ایمائے کشاکش ہے مجھے ہر عقدۂ مشکل

پروازکی تحریک ہے مجھے ہر گرہ دام

اللہ نے تقدیر شکن دی ہے مجھے تدبیر

اور عزم وہ محکم کہ جو ہوتا نہیں ناکام

صادق ہے طلب' پاک ہے دل میری مہم کا

مسعود سرآغاز ہے مقبول سرانجام

اسلامی تحریک کا یہ سرآغاز جتنا مسعود تھا' انجام اتنا ہی مقبول ہوا۔

---

[1] سالک' عبدالمجید: ذکرِ اقبال' ص ۱۱۱

تحریک خلافت کے سلسلے میں ہم نے اب تک جتنے شعرا کا تذکرہ کیا ہے وہ دنیائے شاعری کی جانی پہچانی شخصیتیں ہیں۔ سیاسی شعور کے احیا کے دور میں بھی یہ سرگرم عمل رہے ہیں اور اس تحریک کو تاب و توانائی عطا کرنے کے لئے بھی یہ اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لیتے رہے ہیں۔ اس دور میں ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے شعرا نظر آتے ہیں جن کی نظموں میں سوز دروں کا عکس ہی نہیں، انداز بیان کا نیا پن اور اظہار خیال کی ندرت بھی موجود ہے۔ آیئے ان شعرا سے بھی ہم متعارف ہو جائیں۔

آغا حشر کاشمیری (م: ۱۹۳۵ء) یوں تو ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں، لیکن وہ قادر الکلام شاعر بھی تھے[۱]۔ انہوں نے "شکریۂ یورپ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جو انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسے میں پڑھی گئی تھی[۲]۔ اس میں انہوں نے یورپ کے ظلم و ستم، اس کی آدمیت سوز تہذیب اور اس کی تخریبی سرگرمیوں پر زبردست نکتہ چینی کی ہے۔ وہ سرزمین یورپ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ؎

اے زمینِ یورپ اے مقراضِ پیراہن نواز
اے حریفِ ایشیا اے شعلۂ خرمن نواز

حرفِ تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تیری
آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری

عظمتِ دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے
ڈھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے

جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کر دیا
جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا

اسلامی دنیا پر یورپ کی اس ستم آرائی کے باوجود آغا حشر اس کے ممنون بھی ہیں کہ ظالمانہ رویے کی بدولت "چشم ملت کھل گئی" اور اس کے تن بے جاں میں ہیجان آ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ عالمی جنگ کے دلدوز واقعات نے ترکوں کو اس طرح ٹھوکر لگائی کہ وہ ایک انقلاب بپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حشر نے اپنی مذکورہ نظم میں ترکوں کی

---

[۱] سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، حصۂ نثر، ص ۱۵۲
[۲] انسائیکلو پیڈیا، اردو، فیروز سنز، ص ۲۶

بیداری کے نفسیاتی عوامل کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ ایک ڈرامہ نگار ہی ایسا کر سکتا تھا۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار ؎

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے
امتِ خیر الوریٰ لیکن تری ممنون ہے
کون ہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں، سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ ملت کھل گئی
یک بیک خوں سے تنِ بے جاں میں ہیجان آ گیا
قطرہ دریا بن گیا، دریا میں طوفان آ گیا
چونکہ اٹھی روحِ اخوت، ایک دل خستہ ہوئے
پتیاں گل بن گئیں، گل مل کے گلدستہ ہوئے

الغرض یہ نظم ایک طرف مصطفٰے کمال کی انقلابی سرگرمیوں سے پہلے کے حالات و واقعات کا عبرتناک منظر پیش کرتی ہے تو دوسری جانب بعد کے ولولہ انگیز تغیر و تبدل کی صحیح ترجمانی بھی کرتی ہے۔ اس نظم کا اطلاق مسلمانانِ ہند کی حالت و کیفیت پر بھی ہو رہا ہے کہ کہاں وہ شاندار ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف تھے اور اب حال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے فرنگیوں سے نبرد آزما تھے۔ ڈرامہ نگار حشر کی یہ ایک تخلیق واقعات کی صداقت، جذبات کی شدت اور اظہارِ خیال کی ندرت کی بدولت خاصی قدر و قیمت کی حامل بن گئی ہے۔

ایک غیر معروف شاعر نجم الہدیٰ گیلانی کی نظم "فریادِ ملت" کا ذکر بھی لازمی ہے۔ شاعر نے اپنے اچھوتے اندازِ بیان، موزوں و مناسب الفاظ کے انتخاب، مترنم بحر کے استعمال اور ردیف و قافیے کی دلآویزی سے اس فریاد میں غضب کی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اس میں پیغامِ بیداری ہے لیکن سوز و دروں کے ساتھ؛ انقلاب کی تلقین ہے لیکن درد و اثر کے لہجے میں؛ جہد و عمل کی ترغیب ہے لیکن آہ و فغاں کے دوش بدوش۔ چند اشعار کے مطالعے سے ناظرین کو اس نظم کے معیار و انداز کا اندازہ ہو جائے گا ؎

سازِ عجمی کیسا، بزمِ عربی کیسی — اے دل ضعیف جاں میں راحت طلبی کیسی

مجنوں نے نگر چھوڑا، فرہاد نے سر پھوڑا
لیلیٰ نظری کیسی، شیریں لقبی کیسی

یہ وقت ہے محفل میں اک شورشِ محشر کا
دورِ عمری میں پھر یہ بولہبی کیسی

ہے شمعِ حرم مردہ اے سوزِ نہاں والے
آ دیکھ مرے دل میں ہے آگ دبی کیسی

خالی کیا ساقی نے پیمانہ تو کیا پروا
ہے دجلۂ خوں جاری یاں تشنہ لبی کیسی

اٹھو سینۂ پر غم سے نالے کو رہا کر دے
اس طائرِ بے پر کو ہمدوشِ سما کر دے

ہنگامِ افق تابی اور تیری یہ خاموشی
یا شورِ جرس بن جا یا بانگِ اذاں ہو جا

جا دیکھ لے مقتل میں حالت مرے بسمل کی
ہے عمرِ خضر پنہاں شمشیر میں قاتل کی

ہمیں شاعروں کے اس قافلے میں ز۔ خ۔ ش[1] بھی شامل دکھائی دے رہی ہیں۔ حبِ قومی اور جذبۂ حریت سے سرشار[2] یہ خاتون زیرِ نظر دور میں سیاسی موضوعات پر مشتمل نظمیں لکھ رہی تھیں جو ایک مجاہد ہی کے اخبار[3] میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ ایک ایسے باپ کی بیٹی تھیں جو حکمراں طبقے سے قریب تر تھے[4]۔ اس کے باوجود یہ شاعرہ اسلامیانِ ہند کے جذباتِ دروں کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔ جنگِ عظیم کے صلحنامے پر مبارک باد کیا دی ہے، طنز کے تیر برسائے ہیں۔

سنا ہے ہم نے دورِ عیش و عشرت آنے والا ہے
ہوئی کافور ظلمت اب اجالا ہی اجالا ہے
مبارک باد لو اس مسلمِ دل ریش کی جس نے
تمہارے واسطے اسلام کو خطرے میں ڈالا ہے
مقاماتِ مقدس میں نہ ہوگی دخل اندازی
طلبگارِ عمل یہ وعدۂ سرکار والا ہے

---

[1] زاہدہ خاتون شروانیہ جو نواب سر مزمل اللہ خاں کی بیٹی تھیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے، حقی، شان الحق: نکتۂ راز، ص ۲۸۳ - ۳۰۷

[2] ایضاً ص ۲۹۲

[3] مولانا ظفر علی خاں کا اخبار 'زمیندار' حوالہ ایضاً

[4] سید الطاف علی بریلوی ان کی بابت لکھتے ہیں: "گورنمنٹ میں بڑا اعزاز تھا۔" منقول علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، ص ۴۷۴

مسیحی ہو مسیحائی کرو بیمار ترکی کی
بڑے نازوں سے جس کو مادرِ گیتی نے پالا ہے
نہیں استغفراللہ! کون کہتا ہے کہ جلدی ہو
ہنسی ٹھٹھا ہے کچھ اوصاف یا منہ کا نوالا ہے

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اسلام کی بقا و سالمیت اور مسلمانانِ عالم کے عروج و ارتقا کے لئے مولانا ظفر علی خان نے اس تحریک کے دوران خدائے بزرگ و برتر سے دعا کی تھی۔ زاہدہ خاتون حضور رسالتمآب میں یوں منت گزار ہیں۔

اے رسولِ عرب! اے شرف افزائے رسل
اب بھی قرباں ہے ترے نام پہ امت تیری
جوش زن اب بھی دماغوں میں ہے سودا تیرا
جلوہ گر اب بھی دلوں میں ہے محبت تیری
حرزِ جاں اب بھی ہے قرآن مقدس اپنا
اب بھی محفوظ ہے سینوں میں امانت تیری
آج بھی مرجعِ آفاق ہے مولد تیرا
آج بھی مرکزِ انوار ہے تربت تیری
تا کجا لب پہ رہے شورِ متیٰ نصر اللہ
تا کجا جورکشِ دہر ہو امت تیری
اے مرے فیض! یہ اندھیر مٹا سکتی ہے
طرفۃ العین میں اک چشمِ عنایت تیری

برعظیم پاک و ہند میں تحریکِ خلافت کا یہ دور بے حد انقلاب آفریں، نہایت ولولہ خیز اور حد درجہ جذبات انگیز تھا۔ ہر فردِ ملت ترکوں کے ساتھ والہانہ محبت اور اسلام دوستی کے نشے میں سرشار تھا۔ اس روح پرور زمانے میں مستند و بلند پایہ اور معروف و غیر معروف شعرا کے کلام کے علاوہ ایسی بے شمار نظمیں اور گیت منظرِ عام پر آئے جن کے خالق کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ گرچہ فن شاعری کے لحاظ سے

ایسی منظومات قابلِ گرفت ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان میں عوام کے انقلابی خیالات و عقائد پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں، ان میں اس وقت کی فضا اور اس کے اثرات کو برقرار رکھا گیا ہے اور کہنے والے کا جذبۂ پرخلوص بھی موجود ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر اس قسم کی عوامی تک بندیوں کو بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "وہ خداداد مقبولیت حاصل ہوئی جو اچھے جید شاعروں کے لئے باعثِ رشک ہو سکتی تھی"۔[۲]

ان میں سب سے زیادہ مقبول ہونے والی نظم "صدائے خاتون"[۳] تھی جو مولانا محمد علی جوہر کی والدہ کی زبان سے ادا کی گئی تھی۔ خلافت کے دور میں اس نظم کو عوام میں جو مقبولیت حاصل تھی اور اس کے جو ہمہ گیر اثرات مرتب ہو رہے تھے، اس کا اندازہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے درج ذیل بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"۲۲ء کا ایک عام منظر۔ شام کا وقت ہے۔ امین آباد کے چورا ہے پر بھی 'صدائے خاتون' دو دو پیسہ کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی رہتی ہے۔ لڑکے درد انگیز آواز سے گا گا کر پڑھ رہے ہیں، اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی 'زہرِ عشق' کی دھن میں۔ صد ہا راہ گیر کھڑے سن رہے ہیں۔ پولیس کی لاری آئی۔ بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانہ پہنچا دیا۔ روز سہ پہر سے لے کر رات گئے تک یہی تماشا رہتا ہے۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل

---

[۱] سیتا پوری، نادم: تحریکِ خلافت کی باغیانہ نظمیں، مطبوعہ 'صریرِ خامہ' (قومی شاعری نمبر)، سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۶۶ء، ص ۹۴

[۲] دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۱۰۵

[۳] اس نظم کے سلسلے میں ایک گمنام مراسلہ نگار نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو مطلع کیا تھا کہ اس کے مصنف مرزا طاہر بیگ طاہر مرادآبادی تھے۔ یہ خط صدق جدید، لکھنؤ کے ۲۵ مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ منقول: سیتا پوری، نادم: ایضاً، ص ۹۵

ہو گیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھراتے تھے، سہمے جاتے تھے
اب خود ان کا جیل جانا ایک مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے۔"[1]

درج بالا اقتباس سے یہ حقیقت بخوبی منترشح ہو جاتی ہے کہ اس قسم کی نظموں کو سننے اور سنانے والے دونوں تحریک خلافت کے جذبے سے سرشار تھے اور ان کی نظر میں قید و بند کی صعوبت اور طوق و سلاسل کی بندش بے معنی اور ہیچ تھی۔ اس یادگار نظم کے اشعار آپ بھی سن لیجئے ؎

بولیں اماں محمد علی کی	جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی	جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا	کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اترنا	جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے	کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دینِ احمد کے رستے	جان بیٹا خلافت پہ دے دو

دوسری نظم "صدائے مظلوم" بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ یہ اس موقع پر لکھی گئی اور مشہور ہوئی جبکہ کراچی کے مقدمے میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں کو قید با مشقت کی سزا ہوئی تھی۔ اول الذکر ترانے کی طرح یہ بھی بچے بچے کی زبان پر جاری و ساری تھی۔[2] تاریخ کی فضاؤں میں اس شعر کی آواز بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے ؎

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

تحریک خلافت کے زمانے میں ان دو مقبول عام ترانوں کے علاوہ بھی ایسی کئی نظمیں لکھی گئیں جن میں شاعرانہ حسن تو نہیں، لیکن وقت کے سیاسی حالات و کیفیات اور عوام کے جوش و جذبے کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ اشعار ؎

---

[1] دریابادی، عبدالماجد: محمد علی ذاتی ڈائری، حصہ اول، ص ۱۰۶
[2] ایضاً، ص ۱۰۳

خبر لو خدارا مدینہ کے والی — کہ دشمن جفا پر جفا کر رہے ہیں
بے انصاف کی آرزو ہو نہ پوری — خدا سے یہ ہم التجا کر رہے ہیں
تھریس اور سمرنا کو لے کر ستمگر — نہ سمجھیں کہ اپنا بھلا کر رہے ہیں
عرض بندۂ ترک و مدینہ کے باشی — دکھی دل سے ہر دم دعا کر رہے ہیں
خلافت کا جھگڑا اٹھایا ہے جب سے — وہ مٹ جائے یہ التجا کر رہے ہیں
ہمیں قتل کردو یا اولاد کو تم — خلافت پہ ہم جاں فدا کر رہے ہیں

آسماں ٹوٹ پڑے اور زمیں کھا جائے — جو خلافت کے مٹانے پہ کھڑا ہو جائے
کیوں خلافت کے مٹانے پہ کمر باندھی ہے — پرشیں میں آکہیں یورپ نہ فنا ہو جائے

میں جان دے دوں خلافت کے نام نامی پر — دعا قبول یہ رب الانام ہو جائے

یہ عوامی نظمیں غیر مستند، غیر معیاری اور ناقص ہی کیوں نہ نظر آتی ہوں، ان کا سب سے نمایاں وصف جو رہا ہے، اسے نادم سیتاپوری کی زبانی سنیئے:

"یہی اس وقت باغیانہ ادب مانا گیا تھا، جو تحریک کے جوش و خروش کے ساتھ بچہ بچہ کی زبان پر آچکی تھیں اور لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر سر راہ فروخت ہوتی تھیں۔"[1]

باغیانہ ادب ہونے کا الزام ہی ان نظموں کا بڑا اعزاز تھا۔

---

[1] سیتاپوری، نادم: تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں، مطبوعہ "تحریر خامہ" (قومی شاعری نمبر) سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء، ص ۹۴

گیارہواں باب

تحریکِ آزادی کا ارتقائی دور

(۱۹۲۵ء — ۱۹۴۷ء)

جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر کیا جا چکا ہے، گاندھی نے چورا چوری کے واقعہ کے بعد ترک موالات کی تحریک، جو تحریک خلافت سے ہی وابستہ تھی، اچانک ختم کردی۔ ان دونوں مشترکہ تحریکوں کے سربرآوردہ قائدین بھی گرفتار کرلئے گئے تھے۔ ادھر ۱۹۲۴ء میں کمال اتاترک نے ترکی میں جمہوری حکومت قائم کرکے خلافت کا سلسلہ ہی ختم کردیا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر برعظیم کی اس زبردست تحریک کا غلغلہ دب کر تو رہ گیا، لیکن اس سے وہ نتیجہ قطعاً برآمد نہیں ہوا جس کی طرف جواہر لال نہرو نے یہ اشارہ کیا تھا کہ "مسلمانوں کے جذبۂ اخوت کا گلا گھونٹ دیا گیا"۔[1] بلکہ انہیں اس کی بدولت بڑے پیمانے پر عوامی تحریک کو منظم کرنے کے طریق کار کی تعلیم ملی اور ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔[2] خود کانگریس کو اس تحریک سے جو تاب و تب ملی تھی، اس کا ذکر ڈاکٹر امبیدکر نے یوں کیا ہے:

"کانگریس کی دستوں پر جو خلافت کے معاملے کو لیا گیا تو اس کا اثر عظیم ہوا۔ کانگریس کو واقعی جو عظمت و طاقت حاصل ہوئی وہ ہندوؤں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہوئی"۔[3]

یہی حاصل شدہ طاقت "شدھی" اور "سنگھٹن" جیسی فرقہ پرست تحریکوں کے فروغ کا باعث ہوئی جس کے نتیجے میں ہندو مسلم اتحاد جو میثاق لکھنؤ کے بعد قائم ہوا تھا اور جس نے امرتسر کے اجلاس میں تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کی تجاویز منظور کی تھیں ـــــ اب پارہ پارہ ہوگیا تھا اور دونوں قوموں کے درمیان خلیج حائل ہوگئی تھی۔ بقول مولانا محمد علی جوہر:

ہندو مہاسبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں جنہوں نے مذہبی تعصبات کی آگ کو بھی بھڑکا دیا جسے ہم ٹھنڈا کرچکے تھے۔ اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا"۔[4]

---

[1] نہرو، جواہر لال: An Autobiography، ص ۲۰۸

[2] قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۶۱

[3] منقول حسن، سید ریاض: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۵۳

[4] منقول جعفری، رئیس احمد: سیرت محمد علی، جلد دوم، ص ۵۳۲

شورش و فساد کی فضا برقرار تھی کہ ۱۹۲۷ء کے اواخر میں حکومت برطانیہ نے سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا تا کہ وہ منجملہ اور باتوں کے اس امر کا بھی جائزہ لے کہ کس حد تک ذمہ دار حکومت کا اصول برعظیم پاک و ہند میں قائم کیا جائے۔ اس کمیشن کے تمام ارکان انگریز تھے اور اس میں ملک کا کوئی بھی نمائندہ شریک نہیں کیا گیا تھا' لہذا اس کے تقرر پر تمام ہندوستان غضبناک ہو گیا[1] ہندو اور مسلمان ایک بار پھر متحد ہو کر بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ کمیشن کے بائیکاٹ کے لئے اٹھے[2] اس پر جھنجھلا کر وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو یہ چیلنج دیا:

"بجائے اس کے کہ وہ حکومت کے خلاف ہمیشہ انہدامی نکتہ چینیاں کرتے رہیں' وہ اپنی طرف سے دستور کی کوئی متحدہ اسکیم پیش کر دیں"۔[3]

کانگریس نے لارڈ برکن کے اس چیلنج کو خوب اچھالا اور مسلمانوں کو غیرت دلائی کہ وہ اپنے تمام مقاصد کو چھوڑ کر اس کا جواب دینے میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو جائیں[4] چنانچہ آل پارٹیز کانفرنس کا قیام عمل میں آیا اور اسی کے تحت ایک چھوٹی سی کمیٹی اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے بنائی گئی جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو مقرر ہوئے[5] ارکان میں صرف ایک مسلمان محمد شعیب قریشی تھے[6]

نہرو کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی وہ بہت بری اور فتنہ و فساد کی جڑ تھی[7] اس میں جداگانہ طریق انتخاب ختم کرنے' ملک میں وحدانی طرز حکومت قائم کرنے اور مسلم

---

[1] ریاض' سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا' ص ۱۵۹

[2] مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے متعدد جلسوں میں "Siamon Go Back" کے نعرے لگائے گئے۔ منقول ہاشمی' انوار: تاریخ پاک و ہند' ص ۵۱۶

[3] بولیتھو' ہیکٹر: Jinnah Creator of Pakistan' ص ۹۳

[4] ریاض' سید حسن: ایضاً' ص ۱۶۰

[5] ایضاً' ص ۱۶۱

[6] ایضاً' ص ۱۶۱

[7] ایضاً

اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو کم نشستیں دینے کی سفارشات شامل تھیں[۵]۔ اس طرح نہرو رپورٹ نے میثاق لکھنؤ پر پانی پھیر دیا اور ایک بار پھر یہ ثابت کردیا کہ کانگریس فرقہ وارانہ ذہنیت کو فروغ دے رہی ہے اور وہ کبھی بھی مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کر سکتی[۲]۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ برعظیم کے تمام مسلمان نہرو رپورٹ کے خلاف ہو گئے۔ محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک میٹنگ میں نہرو رپورٹ کو مسترد کردیا اور سیاسی فیصلے کے لئے اپنے چودہ مشہور نکات پیش کئے جن میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ، ان کی نمائندگی اور جداگانہ انتخاب وغیرہ مقاصد شامل تھے[۳]۔

کانگریس چودہ نکات پر مبنی ان نکات کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی۔ چنانچہ ملک میں پھر انتشار کی فضا قائم ہوگئی اور ہندو مسلم اختلافات ابھر آئے۔ حکومت برطانیہ نے سیاسی ارتقا کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے گول میز کانفرنس بلانے کا ارادہ کیا[۴]۔ پہلے اجلاس منعقدہ نومبر ۱۹۳۰ء میں کانگریس کے نمائندے نے شرکت نہیں کی۔ دوسرے میں جو ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوا[۶] گاندھی نے ہندوؤں کی نمائندگی کی۔ قائد اعظم نے ان دونوں اجلاس میں مسلمانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا اور ان کے حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ گاندھی نے ہٹ دھرمی کا جو طریقہ اختیار کیا اس کی وجہ سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہو سکا[۵]۔ چنانچہ برطانوی وزیر اعظم نے خود ہی فیصلہ کرکے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کردیا جس کی رو سے تمام اقلیتی فرقوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا گیا[۶]۔ میثاق لکھنؤ کی بنیاد پر تمام فرقوں کے لئے صوبوں اور مرکزوں میں نشستیں مخصوص کردی گئیں[۷]۔

---

[۱] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر): 'A Short History of Pakistan' جلد چہارم، ص ۲۰۲

[۲] ہاشمی، انوار: تاریخ پاک وہند، ص ۵۱۷

[۳] انصاری، مظہر: تاریخ مسلم لیگ، ص ۳۲۹ - ۳۳۰

[۴] جعفری، حیات محمد علی جناح، ص ۱۹۵

[۵] ہاشمی، انوار: ایضاً، ص ۵۲۱

[۶] ایضاً

[۷] ایضاً

ادھر کانگریس نے نہرو رپورٹ پر عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں پورے ملک میں سول نافرمانی شروع کردی تھی[1] گاندھی نے نمک سازی کے قانون کو توڑ کر اس کا آغاز کیا تھا۔ یہ تحریک جنگل کی آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی۔ شورش و ہلچل، ہنگامہ و فساد اور قید و بند کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ کانگریس کے چوٹی کے لیڈر گرفتار کرلئے گئے تھے۔ ہندوؤں کی یہ ہنگامہ آرائی جس کے دوران کانگریس نے راجندر پرشاد کے بقول "ایثار و قربانی کے قابل فخر کارنامے انجام دیے"[2] بہ ظاہر حکومت کے مگر بہ باطن مسلمانوں کے خلاف تھی[3] لہٰذا مولانا محمد علی جوہر نے مسلمانوں سے یہ اپیل کی کہ وہ کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک میں ہرگز حصہ نہ لیں[4]

اس کے بعد کا زمانہ اسلامیانِ ہند کے لئے بڑی بے سرو سامانی کا زمانہ تھا۔ محمد علی جناح ذاتی فیصلے کے تحت لندن چلے گئے تھے اور وہیں بیرسٹری کرنے لگے تھے[5] مولانا محمد علی جوہر بھی اس دوران وفات پا چکے تھے۔ مسلمانوں میں عوامی سطح کا کوئی ایسا لیڈر نہ تھا جو ان کے لئے لائحہ عمل تیار کرتا[6] اور انگریزوں اور ہندوؤں سے چومکھی جنگ لڑنے کے لئے کوئی راستہ وضع کرتا[7] کانگریس ڈومینین اسٹیٹس کا نعرہ لگا کر ملک کے لئے ایسی کامل آزادی چاہ رہی تھی جس میں صرف ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہو اور مسلمان ایک اقلیتی فرقہ بن کر رہیں۔

یہی وہ روح فرسا زمانہ تھا کہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے اقبال نے "تاریخ کا ایک گمشدہ صفحہ نکال کر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا اور اس مستقبل کی طرف رہنمائی کی جو پیدا ہونے والا تھا"[8] اس

---

[1] ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۷۱
[2] پرشاد، راجندر: اپنی کہانی، ص ۵۶۶
[3] ریاض، سید حسن: ایضاً، ص ۱۷۰
[4] ایضاً
[5] ایضاً، ص ۱۷۹
[6] سوسائٹی، پاکستان ہسٹاریکل: A Short History of Hind-Pak.، ص ۳۳۲
[7] عزیز، اے: Discovery of Pakistan، ص ۳۲۷
[8] ریاض، سید حسن: ایضاً، ص ۱۸۰

منزل تک ملّت اسلامیہ کی رہبری کے لئے ایک باعمل، دوراندیش اور مخلص سیاست داں کی ضرورت تھی، اور ایسا شخص محمد علی جناح کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ چنانچہ بعض مسلم زعما کے اصرار پر وہ ۱۹۳۵ء میں مستقل طور پر وطن واپس آئے اور مسلم لیگ کو حددرجہ فعّال بنا دیا۔ اسی سال گورنمنٹ ایکٹ کے نفاذ کے بعد کانگریس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہی واحد سیاسی جماعت ہے جو انگریزوں کے بعد برعظیم کا عنانِ حکومت سنبھال سکتی ہے۔[1] نہرو نے اسی خیال کو مدراس میں اپنی تقریر کے دوران یوں دو ٹوک پیش کر دیا:

"ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں، ایک کانگریس دوسری حکومتِ برطانیہ۔"[2]

یہ قول مسلمانوں کے وجود سے انکار تھا اور مسلم لیگ کے وجود سے انکار۔[3] چنانچہ قائدِاعظم محمد علی جناح نے اس کا برجستہ جواب یہ دیا:

"نہیں، تیسری جماعت مسلمان ہیں اور مسلم لیگ ہے۔"[4]

ناظرین! ۔ تحریکِ خلافت کے بعد یہی دو جماعتیں میدانِ سیاست میں سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔ دونوں کی منزل ایک تھی، یعنی حصولِ آزادی لیکن راستے مختلف تھے، طریقے مختلف تھے اور نظریے مختلف تھے۔ کانگریس پورے برعظیم کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر خود کو اس کا واحد حقدار تصور کرتی تھی جبکہ مسلم لیگ دس کروڑ مسلمانوں کی آزادی اور ان کے حقوق کا بھی مطالبہ کر رہی تھی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ تحریکِ آزادی کے اس ارتقائی دور کے شعرا نے عوامی جدّوجہد میں کس طرح حصّہ لیا اور اپنے ولولہ انگیز کلام سے اہلِ وطن کے دلوں میں حریّت کے جذبات بیدار کرنے میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

---

[1] ہاشمی، انوار: تاریخ پاک و ہند، ص ۵۲۶
[2] منقول ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۸۹
[3] ریاض، سید حسن: ایضاً
[4] منقول، ایضاً

اس دور میں اقبال ہی صحیح معنوں میں حریت پسند شعرا کے قافلہ سالار نظر آتے ہیں۔
جس طرح انہوں نے تحریک اتحاد اسلامی کو اپنے اعلیٰ فکر و خیال سے قوت و توانائی عطا کی، اسی طرح فرنگیوں کے خلاف قوم کو صف آرا کرنے اور اس میں حصول آزادی کا جذبہ ابھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کی تمام تر وجہ قائد اعظم کے الفاظ میں سنئے:

"باوجودیکہ وہ ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے، ان کی حیثیت
ایک عملی سیاست داں سے کچھ کم نہ تھی"۔[1]

اقبال نے بیسویں صدی کے اوائل ہی سے سیاست میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔[2] جب انگریزی مال کے بائیکاٹ کے لئے سودیشی تحریک وجود میں آئی تھی تو انہوں نے اس کی باقاعدہ حمایت کی تھی۔[3] وہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔[4] ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں اپنی پارٹی کا سکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔[5]

اقبال نہرو رپورٹ کے سخت مخالف تھے، اس لئے کہ اس میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم نہیں کی گئی تھی اور ان کا کوئی مطالبہ منظور نہیں ہوا تھا۔[6] وہ جنوری ۱۹۲۹ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں پنجاب لیگ کی طرف سے شریک ہوئے تھے۔[7] اور سنہ جس میں انہوں نے جو تاریخی خطبۂ صدارت پیش کیا تھا اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ "غرض مسلمانوں اور اپنے ملک کے لئے ان کی خدمات اتنی لاتعداد ہیں کہ ان کے کارہائے نمایاں کو ایک عظیم المرتبت ہندوستانی کے کارہائے نمایاں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے"۔[8]

---

[1] منقول پیرزادہ، شریف الدین: پاکستان منزل بہ منزل، ص ۱۵۲
[2] زبیری، امین: سیاست ملیہ، ص ۵۹
[3] اقبال: انوار اقبال، ص ۲۵ - ۳۱
[4] سالک، عبد المجید: ذکر اقبال، ص ۱۳۳
[5] پیرزادہ، شریف الدین: Foundations of Pakistan جلد دوم ص ۱۳۶
[6] سالک، عبد المجید: ایضاً، ص ۱۴۲
[7] ایضاً: ص ۱۴۳
[8] قائد اعظم، منقول ہاشمی انوار: تاریخ پاک و ہند، ص ۵۲۰

اقبال اس قوم میں پیدا ہوئے تھے جو پا بجولاں ہو کر مردہ ہو چکی تھی اور انہوں نے اس سرزمین میں آنکھیں کھولیں جو آزادی سے یکسر محروم تھی۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا۔

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

یہ ان ہی کا حوصلہ تھا کہ ملک و ملّت کو اغیار کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے مختلف تدبیریں سوچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور سب سے زیادہ ان کو خودی کا فلسفہ اپنی جانب کھینچتا ہے۔"[1] احتشام حسین کی کہی ہوئی اس بات کا جواب خود اقبال کے اس شعر میں موجود ہے۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّت نمود میں ہے

اقبال نے نظریۂ خودی کے ذریعے ملّت کو یہ پیغام دیا کہ وہ اپنی خلقی صلاحیتوں کو پہچانے، ان کی نشو و نما کرے اور اپنے بروئے کار لائے تاکہ اغیار کی سیاسی اقتصادی اور ثقافتی غلامی سے نجات ممکن ہو۔ ان کے خیال میں زندہ و بیدار قوموں کی طرح زندگی گزارنے کے لئے خودی کا فروغ لازمی ہے۔ چنانچہ زیر بحث دور میں اس مخفی قوت کو ابھارنے کے لئے انہوں نے مسلسل جدّ و جہد کی ہے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

---

[1] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۱۹۳

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

جب بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق

اقبال نے جہاں درس خود آگاہی کے ذریعے قوم کی قسمت خفتہ کو جگانے کی کوشش کی ہے وہاں اس کے ضمیر کو جھنجوڑا بھی ہے، اس کے نکبت و ادبار پر روشنی بھی ڈالی ہے اور اس غلامانہ زندگی کا ذمہ دار بھی خود اسے ٹھہرایا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار جو شاعر کے دل دردآشنا کی آواز بن کر فرنگی فضاؤں میں گونج رہے تھے ؎

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

فرنگیوں کی غلامی میں رہ کر اپنی اقدار و روایات کو بھلا دینے اور ذلت آمیز حالات سے سمجھوتہ کر لینے والی قوم کو اقبال نے جا بجا یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آزادی اور محکومی میں کیا فرق ہے۔ بادی النظر میں انہوں نے حصولِ آزادی کے جذبے کو فروغ دینے کا اہم کام سرانجام دیا ہے۔ درج ذیل اشعار دورِ غلامی میں منارۂ نور بن کر ظلمت کدۂ دل کو اجال رہے تھے ؎

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگِ تاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

غلامی اور آزادی کے اس نمایاں فرق کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال نے بندۂ آزاد کے مقام و مرتبے پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ اس کے قول و عمل سے کیا کیا اثرات رونما ہوتے ہیں۔ ایک غلام قوم کو ان اشعار کے ذریعے اقبال نے بہت کچھ بتا دیا ہے۔

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی ہو جاتی ہے خاکِ چمنستان شرر آمیز
اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم پرویز

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

اقبال نے سیاسی شعور کے اس ارتقائی دور میں اہلِ وطن کو جہاں ایک جانب آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا ہے اور بندۂ آزاد کے مقام و مرتبے سے باخبر رکھا ہے' وہاں دوسری جانب انہیں جہد و عمل کی راہ بھی دکھائی ہے۔ ان کی نظر میں شعور کی بیداری اس وقت تک بے معنی ہے جب تک غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ وہ فکر و خیال میں تبدیلی پیدا کرنے کو ہی کافی نہیں سمجھتے' اغیار سے معرکہ آرا ہونے کا حوصلہ عطا کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ ذرا یہ اشعار دیکھئے۔ ان میں ایک سپہ سالار کا عزم آہنی ہے' ایک مجاہد کا جوش و

خروش ہے اور ایک بندۂ حرکی للکار ہے ؎

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ منسوں ہے قم باذن اللہ

بہ زورِ دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

معرکۂ دین و وطن کی عظمت کا احساس دلانے والے اقبال اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ جب اسلامیانِ ہند حصول آزادی کا جذبۂ فراواں لے کر جہد و عمل کی شاہراہ پر گامزن ہو جائیں گے تو پھر فرنگی استعماریت کا تار و پود بکھر کر رہ جائے گا، غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور حریت کا اجالا نمودار ہو جائے گا۔ دیکھئے "مستقبل کا شاعر"[1] دل گرفتہ قوم کو حسین مستقبل کا پیام جاں فزا سنا کر غم و الم کے چھائے ہوئے ابر کو کیسا صاف کر رہا ہے ؎

---

[1] صدیقی، رشید احمد : منقول سرور، آل احمد : اکبر کا المیہ، مطبوعہ "بہترین ادب ۱۹۴۹ء" لاہور، ص ۷۹

خلوت کی گھڑی آئی جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر

الٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش امروز ہے فسانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

زیرِ نظر دور میں اقبال نے اپنے ولولہ انگیز اور حیات آفریں کلام سے نہ صرف اہلِ وطن کے دلوں میں حصولِ آزادی کی تڑپ پیدا کر دی اور اپنی اغیار کے خلاف صف آرا کر دیا بلکہ "اردو کے نوجوان شاعروں کی راہ میں بہت سے چراغ جلا دیئے"[۱] ان چراغوں کی روشنی طلبِ حریت کی ہر راہ کو منور کرتی رہی۔

جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں، مولانا ظفر علی خاں تحریکِ اتحادِ اسلامی کے سرگرم مجاہد تھے۔ اس زیرِ بحث دور میں بھی وہ اپنی تقریر و صحافت کے دوش بدوش شاعری کے ذریعے قوم میں حریت کا شعور پیدا کر رہے ہیں۔ وہ برطانوی ظلم و استبداد سے نجات پانے اور آزادی کے حصول کے لئے ایثار و عمل کے جذبے کا فروغ ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ وطن سے یوں مخاطب ہیں ؎

---

[۱] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۱۹۷

اگر تم کو حق سے ہے کچھ لگاؤ | تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ
حکومت کو تم نے لیا آزما | اب اپنے مقدر کو بھی آزماؤ
ہو تم جسکے ذرے وہ ہے خاکِ ہند | چھپے ہیں جو اس میں وہ جوہر دکھاؤ
ہمالہ بھی آجائے گر راہ میں | تو ٹکرا کے آگے سے اسکو ہٹاؤ

محنت کے بلا خیز سمندر کے نہنگو | سرمائے کی مچھلی کو سمو چاہی نگل جاؤ
آزادی کامل کا علم ہاتھ میں لے کر | میداں میں بجاتے ہوئے ایماں کا بگل جاؤ

عزتِ ملتِ بیضا کی حفاظت کیلئے | دوش پر لاکھوں بھی سر ہوں تو کٹاتے جاؤ
صلح کے نام سے دھڑکے ہیں وہ گر کان پہ ہاتھ | تو انہیں جنگ کا پیغام سناتے جاؤ

ظفر علی خاں حصولِ آزادی کے لئے دوسروں کو ہی ایثار و عمل کا درس نہیں دیتے، وہ اس جدّوجہد میں خود بھی برابر کے شریک نظر آتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں اہلِ وطن کو للکارتے ہوئے خود بھی دشمنوں سے صف آرا ہوتے ہیں۔ اس نوع کے اشعار میں بڑی گھن گرج اور بڑا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ تیور ایسا کہ رن میں تلوار بجلی بن کر حریفوں پر گر رہی ہو ؎

ازل کے روز سے بارِ امانت کا ہوں میں حامل
خدا کا فضلِ بے پایاں ہے میرے حال کو شامل
مسلماں ہوں مرا مقصود ہے آزادیٔ کامل
قسم ہے سرورِ کونین کی جانِ گرامی کی
کہ اک جھٹکے میں توڑوں گا میں زنجیریں غلامی کی

ثریا سے بھی اونچا دینِ قیم کا علم ہوگا
سرِ اعدائے ملت عرصۂ تیغِ دو دم ہوگا
موحد ہوں مرا سر غیر کے آگے نہ خم ہوگا
قسم ہے اشہبِ توحید کی محشر خرامی کی
کہ اک جھٹکے میں توڑوں گا میں زنجیریں غلامی کی

وطن کو چمنستاں بنا کے چھوڑوں گا

اور اس کی صبح کو خنداں بنا کے چھوڑوں گا

لہو شہیدوں کا لونگا اور اسکی سرخی کو

میں غازۂ رخ ایماں بنا کے چھوڑوں گا

حصولِ آزادی کے سلسلے میں حریت پسندوں کو بڑی سختیاں جھیلنی پڑی تھیں اور قیدو بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا تھا۔ اس عالم دارو گیر میں نہ داد رسی تھی نہ انصاف۔ برطانوی حکمراں جو چاہتے اور جیسا چاہتے کرتے تھے۔ جنگِ آزادی کے عام سپاہی فرنگی حکام کے ظلم وستم کا نشانہ تو بنتے ہی تھے' سیاسی قائدین پر بھی عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر اور حسرت موہانی اس کی نمایاں مثال ہیں۔ ظفر علی خاں تحریکِ خلافت کے دور میں بھی داخلِ زنداں کئے گئے تھے' زیرِ نظر دور میں بھی قیدِ تنہائی ان کا مقدّر بنی۔ وہاں جو بھی مظالم ان پر یا ان کے اہلِ وطن پر ڈھائے گئے' ان کا ذکر وہ اپنے کلام میں جا بجا کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری تاریخ کے اس کربناک رخ کو نمایاں کرکے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیتی ہے۔ اس نوع کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

ہیں نئی روش کی عدالتیں ہیں نرالے ڈھنگ کے فیصلے

نہ نظیر ہے نہ دلیل ہے' نہ وکیل ہے نہ اپیل ہے

پاؤں میں بیڑی گلے میں تختی اور ہاتھوں میں داغ

امتِ مرحوم پر کیا کیا ہیں احسانِ فرنگ

جب آئے ہم جیل میں تو ہم پر کھلا فرنگی ازل کے دن سے

دروغ گو بھی ہے' حیلہ جو بھی ہے' کمینہ بھی ہے' لئیم بھی ہے[1]

برطانوی حکومت نے آزادی کے جذبے کو کچلنے کے لئے ہر طرح کا تشدّد روا رکھا

---

[1] ظفر علی خاں کا یہ شعر پڑھ کر ناظرین کو وکی کا مندرجہ ذیل شعر ضرور یاد آگیا ہوگا جس کا تذکرہ ہم مقالے کے شروع میں کر آئے ہیں ؎

وگراں میں فرنگی بے حد ہیں — کہ قول و فعل میں مکروہ بد ہیں

رکھا لیکن مردانِ حر ان تمام مصائب و آلام کو ہنسی خوشی برداشت کرتے رہے۔ یہ ان ہی زندانیوں کا اعزاز تھا کہ قید بامشقت کے دوران بھی حریت کے چراغ روشن کئے رہے۔

زمانہ قید کا برطانیہ کے زندانی — مصیبتوں میں خوشی سے گزار دیتے ہیں

ظفر علی خاں کو یہ یقین تھا کہ ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے یہی مجاہد سر بکف ہو کر میدانِ جنگ میں آئیں گے اور اغیار سے معرکہ آرا ہوں گے۔ ان ہی کے ایثار پر ہے انقلاب کا دار و مدار ہوگا۔

سربکف میدان میں آپہنچے جوانانِ وطن
جن کی قربانی پہ ہے دار و مدار انقلاب
وقت آپہنچا ہے کہ یا مر جاؤ یا آزاد ہو
تخت یا تختہ ہے حکم تاجدار انقلاب
شہسوار آزادیٔ کامل کا ہے اس میں نہاں
بیٹھتے ہی خود دکھا دے گا غبار انقلاب

مولانا کو یہ امید تھی کہ سربکف شہسواروں کی یہ جد و جہد، یہ سعی و عمل، یہ معرکہ آرائی رائگاں نہیں جائے گی۔ ان کی بے مثال قربانیوں کے نتیجے میں برطانوی حکام کا ظلم و استبداد ختم ہو جائے گا، ان کے عروج و اقتدار کا قلعہ مسمار ہو جائے گا، غلامی کی سیاہی چھٹ جائے گی اور آزادی کا آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ وطن کے افق پر طلوع ہوگا۔ یہ امید افزا اشعار عوام کے شوق و طلب کو دوچند کر رہے ہونگے۔ آپ بھی اس نوع کا کلام ملاحظہ کیجئے۔

زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہو جس کو ٹکرانا

پرانا ہوا دخترِ اقتدار — سمجھ لو بس اس کا بھی ہر چل چلاؤ
کسی روز خود غرق ہو جائیگی — بہت بہہ چکی ہے یہ کاغذ کی ناؤ

وقت آپہنچا کہ ہو تقسیم قوموں کی نئی — اک نئی دنیا ہو اور اس کا نیا مقسوم ہو

وقت آپہنچا کہ پھر ہو زندہ آئینِ کہن
پھر بہارِ باغِ گیتی امتِ مرحوم ہو

ڈھائی جائے گی بنا یورپ کے استعمار کی
ایشیا آپ اپنے حق کا پاسباں ہو جائے گا
نغمہ آزادی کا گونجے گا حرم اور دیر میں
وہ جو دار الحرب ہے دار الاماں ہو جائے گا

پھوٹنے والی ہے آزادی کے سورج کی کرن
اٹھ رہا ہے پردۂ شب ہائے تار انقلاب

مولانا ظفر علی خاں زیر نظر دور میں اردو شاعری کی مروجہ روایات سے ہٹ کر جس طرح ملکی و ملی موضوعات پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں، اس کی بنا پر ان کا کلام بقول مولانا عبدالسلام ندوی "اس دور کی مجموعی تاریخ کے ابواب و فصول کا ایک مجموعہ بن گیا ہے اور ان کو پیش نظر رکھ کر اس دور کی قومی، سیاسی اور مذہبی تاریخ کا ایک مکمل خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے۔"[1]

سیاسی حیا سی کے اس دور میں حسرت موہانی بھی پیش پیش ہیں۔ اپنی آخری گرفتاری کے بعد جب ۱۹۲۴ء میں وہ رہا ہوئے جب سے "انقلابی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔[2] مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے انہوں نے حصول آزادی کا پر جوش نعرہ لگایا۔ اس پورے دور میں عملی سیاست ہی ان کا مرکز زندگی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تر توجہ جدو جہد آزادی کی طرف مبذول رہی۔ وہ شاعری میں سیاسی رنگ زیادہ نہ بھر سکے جیسا کہ پہلے دور میں کرتے رہے تھے۔ پھر بھی اس نوع کے خیالات کی ترجمانی کہیں کہیں ضرور کر گئے ہیں۔ آئیے! ایسے سیاست آمیز خیالات کا پتہ چلائیں جن کا تحریک آزادی سے گہرا ربط ہے۔

تحریک آزادی کی طویل تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ فرنگی حکام نے ہمیشہ وعدہ وعید

---

[1] ندوی، مولانا عبدالسلام: مقالات عبدالسلام، ص ۱۴۷
[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ کلیات حسرت، ص ۲۶ و بعدہ

سے کام لے کر عوام کو خوش رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اسی وعدے کے سہارے برعظیم کے ہزاروں افراد جنگ عظیم کی آگ میں جھونک دیئے گئے تھے۔ سہانے خواب کا منظر دکھا کر ملک کی کثیر دولت برما و رنگون اور جانے کہاں کہاں شوق ہو کہ آزادی کی تکمیل کے لئے کام میں لائی جاتی رہی تھی۔ حسرت نے اسی تاریخی حقیقت کو غزل کے ایک مطلع میں پیش کر کے تاریخ ادب اردو میں بھی ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے ؎

ہر دم رضائے یار سے نزدیک ہم رہے　　　امیدوار وعدہ بعد طلب ہم رہے

اسی غزل کے بقیہ اشعار میں حسرت نے اپنے سیاسی مسلک اور نصب العین کو پیش کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ ڈومینین اسٹیٹس کے طلب گار نہیں بلکہ آزادی کامل کے خواہاں تھے۔ اور وہ اپنے اس نظریے پر کانگریس کی مخالفت کے باوجود جس لے سختی سے کاربند تھے، اس کا اظہار خود کر رہے ہیں:

"ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے"۔[1]

حسرت موہانی کے اسی سیاسی نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے مذکورہ غزل کے بقیہ اشعار پڑھ لئے جائیں ؎

تحریک حریت کو جو پایا قرین حق　　　ہر عہد میں معاون تحریک ہم رہے
خلق خدا کو ماں کے شرکت کا مستحق　　　در باب ملک منکر تملیک ہم رہے
دشوار تھا بغیر یقیں روح کا سکوں　　　اچھا ہوا کہ دشمن تشکیک ہم رہے
بر حال ہر خیال میں ہر اعتبار سے　　　حسرت مطیع عشق رہے ٹھیک ہم رہے

حسرت نے عشق سیاست کا جو روگ لگا رکھا تھا، اس میں وہ بے حد انتہا پسند تھے۔ "وہ جس چیز کو اپنے ملک کے لئے اچھا سمجھتے تھے، اسی کی تبلیغ بھی کرتے تھے خواہ اس

---

[1] حسرت، منقول مقدمہ کلیات حسرت، ص ۱۳

کے نتائج و عواقب کچھ ہی کیوں نہ نکلیں۔ وہ بڑی سے بڑی ہستی سے بھی کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ وہ حق بات کہنے میں بالکل نڈر اور بے باک تھے"۔[1] حسرت کے ایک سرکاری محتسب[2] کی اس رائے کو ذہن میں رکھتے ہوئے درج بالا غزل کا مقطع ایک مرتبہ پھر پڑھ لیا جائے تو رئیس الاحرار کا مسلک واضح ہو جائے گا ؎

برحال ہر خیال میں ہر اعتبار سے … حسرت مریض عشق رہے ٹھیک ہم رہے

حسرت موہانی اپنے مسلک میں نہ ابن الوقت تھے نہ موقع پرست۔ وہ حکومت برطانیہ سے براہ راست ٹکرانے کے قائل تھے۔ ان کے اس نظریے کی شہادت ۱۹۲۲ کی ان تقریروں سے مل سکتی ہے جن کا ذکر گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے اس آہنی عزم اور بے پناہ جذبۂ حریت کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جو اسی ارتقائی دور کی یادگار ہیں ؎

حریت کامل کی قسم کھا کے اٹھے ہیں … اب سایۂ برٹش کی طرف جائیں گے کیا ہم
گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخہ … لینن کی طرح دیں گے نہ دنیا کو ہلا ہم
اعلان کی تصدیق ہیں پشت پہ حسرت … مسلم ہیں تو دب کر نہ رہیں گے بخدا ہم

اقبال و ظفر کی طرح حسرت بھی مستقبل سے مایوس نہ تھے۔ جدّوجہد آزادی کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے انہیں یہ امید تھی کہ استعماری قوتوں کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو جائے گا' جور و ستم کا رواج بالآخر اختتام پذیر ہوگا اور دل زار پر بیرونی تسلط کا اثر باقی نہیں رہے گا۔ ان خیالات پر مبنی درج ذیل غزل کیا ہے' آفتاب حریت کے طلوع کا مژدہ جاں فزا ہے ؎

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی … نہ حکام کا جور بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں … کسی کا نہ تخت پہ دعویٰ رہے گا
دل زار اب اپنے پہلو میں ہرگز … نہ تمھارا کے گا نہ دابا رہے گا

---

[1] برنی' ضیاءالدین احمد: عظمت رفتہ' ص ۱۸۹

[2] ضیاءالدین برنی حکومت بمبئی میں مترجم کی حیثیت سے ملازم تھے۔ ہر سیاسی لیڈر کی تحریر و تقریر کو سنسر کرکے اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرکے متعلقہ شعبے کو پیش کرتے تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے' ایضاً' ص ۵۴' ۱۸۹

فرنگی حکام نے پہلے تو ظلم و تشدد کے ذریعے تحریکِ آزادی کو کچلنا چاہا ــــ اور پھر لطف و مدارات کے توسط سے عوام کو زیرِ دام کرنے کی کوشش کی تھی ۔ لیکن مجاہدوں کا جو قافلۂ بے پناہ آگے بڑھ رہا تھا، وہ حکومت کی ہر سختی اور ہر عنایت کو نظر انداز کرتا ہوا منزلِ حریت کی طرف رواں دواں رہا۔ حسرت کی دور بین نظر دیکھ رہی تھی کہ بہت جلد یہ قافلہ کامیابی سے ہم کنار ہوگا اور گردشِ دوراں حاکم و محکوم دونوں کے درمیان علیحدگی اور لاتعلقی کی دیوار کھڑی کر دے گا۔ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی اس حقیقت کی جھلک حسرت کے اس شعر میں دیکھ لیجئے ؎

کرنا ہے جو کچھ کر لیجئے لطف و مدارا
پھر گردشِ دوراں میں کہاں آپ کہاں ہم

آج برِعظیم میں نہ آزادی سلب کرنے والی برطانوی حکومت ہے، نہ ظلم و جفا کرنے والے انگریز حکام ہیں ــــ نہ ہی آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والے، قید و بند کی صعوبت برداشت کرنے والے اور اپنے سینوں پر گولیاں کھانے والے مجاہدین زندہ ہیں، لیکن اس کرب و الم کے دور کی تاریخ آج بھی زندہ ہے۔ اور ہم آج ان دونوں کا تذکرہ ٹھیک اسی طرح کر رہے ہیں جس کی پیش گوئی غزل گو اور "حسن پرست" حسرت موہانی نے آج سے نصف صدی قبل ان اشعار میں کی تھی ؎

ترے حسن کا دور دورا رہے گا ۔۔۔ نہ میرا یہ جوشِ تمنا رہے گا
مگر سالہا سال بعدِ فنا بھی ۔۔۔ زمانے میں دونوں کا چرچا رہے گا[1]

مولانا حالی کے بہت گہرے دوست اور پانی پت کے رہنے والے وحید الدین سلیم (م: ۱۹۲۸ء) یوں تو قومی و ملی شاعری کے دور سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی طبیعت کے جوہر بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد ہی کھلے[2]۔ ان کا کلام قنوطیت سے خالی اور رجائیت سے مملو ہے[3]۔ وہ سعی و عمل کے شاعر ہیں۔ اپنے روح پرور نغموں سے قوم کے تن مردہ

---

[1] پانی پتی، شیخ محمد اسمٰعیل: شعرائے متغزلین، مطبوعہ نقوش (غزل نمبر) لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۶۷۶
[2] سروری، عبد القادر: جدید اردو شاعری، ص ۱۹۴
[3] سیوہاروی، نہال: مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، مطبوعہ ساقی، دہلی، جون ۱۹۴۲ء، ص ۲۳

میں ایک تازہ روح دوڑانا چاہتے ہیں اور اسے معاشرے میں تغیر برپا کرنے پر اکساتے ہیں۔
ملاحظہ ہوں ان کے یہ اشعار ؎

کرنا ساحل کی خموشی کو نہ زنہار پسند
تم کو اے دوستو ہنگامۂ طوفاں کی قسم
بحر سے گر تمہیں ملنا ہے تو بے تاب رہو
موج رقصاں کی قسم سیل شتاباں کی قسم

زندگی نام ہے حرکت کا تم افسردہ نہ ہو
نبض کے خون کی مانند اچھلنا سیکھو
چشمۂ آب ہو تم سوتے ہو کیوں زیر زمیں
سنگ خارا کے شگافوں سے ابلنا سیکھو
نہ ڈرو صدمۂ طوفاں سے مانند نہنگ
ورطۂ بحر کی آغوش میں پلنا سیکھو

ہنگامۂ طوفاں میں سلیم اہل وطن کو خود طوفان کا روپ دھارنے کی تلقین کر رہے ہیں ؎

کیا لے گا خاک مردہ و افتادہ بن کے تو
طوفان بن کے ہو تری فطرت میں انقلاب

وحید الدین سلیم نے افراد قوم کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ غلامی کی ذلت اور پستی میں رہنے کے باوجود ان کے تن مردہ میں بیکراں طاقتیں پوشیدہ ہیں' بے پناہ طوفان خیز لہریں دبی ہوئی ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان ہی مخفی طاقتوں اور لہروں کا ادراک قوم کو شورشیں برپا کرنے' نیا انقلاب لانے اور ماحول و معاشرے کو بدل دینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں سے باخبری ہی ایک غلام' مردہ اور افتادہ قوم میں کچھ کر گزرنے کا سبب بنتی ہے۔ سلیم اسی سبب کو دائرۂ نور میں لا رہے ہیں ؎

میں راکھ ہوں ان انگاروں کی جو سینۂ ہستی میں ہیں دبے
میں لہر ہوں ان طوفانوں کی جو اٹھتے ہیں دل کے سمندر میں

چاک سے میرے نکلتے ہیں ہزاروں خورشید
صبحِ رخشندۂ فطرت کا گریباں ہوں میں

میری ہستی کے سیہ پردے میں چھپا سورج مگر
اس دھندلکے کی حقیقت سے ابھی غافل ہوں میں

کرب والم اور حزن وافسردگی کے اس دور میں سلیم کی حیثیت ایک ایسے پیامبر کی ہے جو اندھیرے میں اجالا، یاس میں آس اور رات کی پر ہول ظلمتوں میں صبحِ درخشاں کا پیام جاں فزا سناتا ہے، جو فتح وظفر کی خبر دے کر ناکامیوں کی تلخی کو بے حد کم کر دیتا ہے۔ ایسے اشعار بھی سن لیجئے ؎

ناکامیوں کا پردہ اٹھتا ہوں جب کبھی
روئے عروسِ فتح وظفر دیکھتا ہوں میں[1]

شب تاریک کی سیاہی نظر آتی مجھے
سر بہ انجم کی صف آرائی نظر آتی مجھے
چاند کو ڈوب کے بادل سے نکلتا دیکھا
نور کو چشمۂ ظلمت سے اچھلتے دیکھا
کشتیاں زنگ کے سیلاب میں چلتی دیکھیں
بجلیاں گود میں خاشاک کی پلتی دیکھیں

سلیم نے سرسید کے دور سے لے کر ۱۹۲۸ء تک کے زمانے کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ وہ خود بھی "زمیندار" کے ادارتی فرائض نہایت جوش اور سرگرمی سے انجام دیتے رہے تھے اور مسجد کانپور کے سلسلے میں مضامین لکھنے کی وجہ سے انہیں بڑی آفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔[2] وہ اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ برطانوی حکومت کے خلاف پوری قوم صف آرا ہو چکی ہے اور اب غلامی کی فضا تادیر قائم نہیں رہے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی نظم "الہام" میں بہ بانگِ دہل یہ اعلان کر دیا تھا کہ ؎

---

[1] سیوہاروی، نہال: مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، مطبوعہ ساقی، دہلی، جون ۱۹۴۴ء، ص ۲۳
[2] وہ ۱۸۹۴ء میں سرسید کے لائبریری اسسٹنٹ مقرر ہوئے تھے، بحوالہ قریشی، عبداللہ، نقوش (مکاتیب نمبر) جلد دوم، نومبر ۱۹۵۷ء، ص ۷۴۶
[3] سروری، عبدالقادر، جدید اردو شاعری، ص ۱۹۱

راز آسودہ کے عریاں نظر آتے ہیں مجھے
اک نئی جنگ کے ساماں نظر آتے ہیں مجھے
کتنی قوموں کا چھلکنے کو ہے پیمانۂ عمر
ٹوٹتے شاہوں کے پیماں نظر آتے ہیں مجھے
آگ اگلنے کو تفنگوں نے دہن کھول دیے
خوں فشاں خنجرِ براں نظر آتے ہیں مجھے
جن کو اربابِ حشم نے کبھی ٹھکرایا تھا
محتشم اب وہی دہقاں نظر آتے ہیں مجھے

سرسید اور حالی کے صحبت یافتہ اور ان دونوں قومی رہنماؤں کے خیالات سے متاثر ہونے والے سلیم آنے والے حسین مستقبل کو خود اپنی آنکھوں سے تو نہ دیکھ سکے، مگر نظم امید کی کرن سے اہلِ وطن کے مغموم دلوں میں اجالا ضرور کر گئے۔ [۱]

خاتمہ تیرا اب اے ظلمتِ ہجراں ہوگا
صبحِ امید کا پھر جلوہ نمایاں ہوگا
منتظر شاہدِ مقصود کی رہتی ہے نظر
شعلۂ برق اسی تار پہ رقصاں ہوگا
طیش میں اشک کا جو قطرہ گرا دامن پر
اسی قطرے سے بپا عیش کا طوفان ہوگا
جس سے اٹھتا نظر آتا تھا شبِ غم کا دھواں
مطلعِ صبح وہی چاکِ گریباں ہوگا
پہلے جس دشت پہ پھیرا تھا اداسی نے قلم
اب وہی تختۂ مشقِ گل و ریحاں ہوگا
پہلے اٹھتے تھے جہنم کے شرارے جس جا
اب وہیں جلوہ نما گلشنِ رضواں ہوگا
ظلمتِ فصلِ خزاں چھائی تھی جس بستی پر
اب وہ پھولوں کی تجلی سے چراغاں ہوگا

---

[۱] عبدالحق، مولوی: چند ہم عصر، ص ۱۲۰

اس دور میں سیاسی جد و جہد کو ایک نئی زبان دینے والوں میں جوش ملیح آبادی کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو انقلابی نعروں سے جس طرح مزیّن کیا ہے، یہ ان ہی کا حصّہ ہے۔ وہ جہاں انقلاب، انقلاب، کا نعرہ لگا کر اپنے مسلک کا یوں اظہار کرتے ہیں ؎

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

وہاں برطانوی استبداد سے معرکہ آرا ہونے کے لئے قوم کو بیدار بھی کرتے ہیں اور بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں تلوار تھما دیتے ہیں کہ اس کے بغیر آزادی کی جد و جہد ایک بے معنی سی بات ہے ؎

خواب کو جذبۂ بیدار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے دیتا ہوں

برعظیم کے دیگر سیاسی رہنماؤں کی طرح جوش بھی اس خیال کے حامی تھے کہ مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ مل کر جنگِ آزادی میں حصّہ لیں[1] لیکن ترکِ موالات کی تحریک جب ختم ہوئی اور مہا سبھائیوں نے سنگھٹن کی تشدد آمیز تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بھی "تنظیم" کی تحریک شروع کرنی پڑی[2] اس طرح دونوں قوموں کے درمیان کشیدگی کی فضا قائم ہوئی۔

جوش فرقہ وارانہ فسادات کو وطن کے لئے فال نیک نہیں سمجھتے۔ ایک وطن جہاں غربت و افلاس کا پہلے ہی سے ڈیرا جما ہوا ہو۔ یہاں یہ نکتہ پیشِ نظر رہے کہ "ان دونوں چیزوں کو انگریزوں کی غلامی نے پیدا کیا تھا"[3] لہٰذا جب جوش غربت و فساد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو بادی النظر میں وہ انگریزوں کے پیدا کردہ حالات کا اظہار کر کے اہلِ وطن کو باخبر رکھنا چاہتے ہیں ؎

---

[1] مولانا محمد علی جوہر کے علاوہ خود قائدِ اعظم نے ہندو مسلم اتحاد پر خاصا زور دیا تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: بولیتھو: Jinnah the Creator of Pakistan، ص ۸۹؛ نیز سید مطلوب الحسن: Mohammad Ali Jinnah، ص ۲۳۶؛ نیز پیرزادہ سید شریف الدین: Foundations of Pakistan، جلد اول، ص ۵۷۷

[2] قریشی، اشتیاق حسین (ایڈیٹر): A Short History of Pakistan، جلد چہارم ص ۱۹۸

[3] بریلوی، ڈاکٹر عبادت: روایت کی اہمیت، ص ۴۴۴

آہ اے ہندوستاں اے مفلسوں کی سرزمیں

اس کرے پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں

آہ اک دل بھی ترے افلاس پر جلتا نہیں

اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

ہندو مسلم ہیں اٹھتے تری امداد پر

لعنت ہے ایسی بے حمیت ناخلف اولاد پر

ہائے کیا کرنا تھا ان کو اور کیا کرتے ہیں یہ

گائے اور باجے پر لڑنے کے لئے مرتے ہیں یہ

صرف غربت و افلاس اور فرقہ وارانہ فسادات ہی جوش کے پیش نظر نہیں، وہ برطانوی حکومت کے ظلم و استبداد، اس کے پیدا کردہ فتنہ و فساد اور اس کی پے بہ پے سازشوں سے بھی خوب واقف ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان حالات سے پوری قوم باخبر ہو جائے اور اپنے سروں پر ستم گر حکمرانوں کی چمکتی ہوئی تلوار دیکھ لے ؎

اے مرد خدا! فتنۂ اغیار سے ہوشیار

ہوشیار ہو ہوشیار ہو ہوشیار ہو ہوشیار

ہم تجھ سے نہ کہتے تھے کہ ہونے کو ہے پیکار

لے آگئی سر پہ چمکتی ہوئی تلوار

بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار ہو بیدار

بیدار ہو بیدار

پیام بیداری کے ساتھ ساتھ وہ آزادی کی اہمیت بھی اجاگر کرتے جاتے ہیں ؎

سنو اے ساکنانِ خاکِ پستی | ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر | غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

برسہا برس کی غفلت شعاری اور تساہل پسندی نے اہلِ وطن کو میٹھی نیند سلا رکھا ہے۔ جوش کی گرجتی ہوئی آواز بھی انہیں نہیں جگا پاتی۔ ایسی حالت و کیفیت میں وہ ہم وطنوں کے شانے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر انہیں بیدار کرتے ہیں اور ان کے کانوں میں اپنا پیغام ٹپکاتے چلے جاتے ہیں ؎

اے بندگۂ ذلیل غلامانِ روسیاہ

شاعر سے تو ملا تو خدا کے لئے نگاہ

اس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے

تو ہیں گرج رہی ہیں سروں پر خبر بھی ہے

اے امتِ شکستہ دل وائے گروہ شل

کب سے بلا رہا ہوں میں تجھ کو سوئے عمل

تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر

جھنجوڑ رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجوڑ کر

آتی ہے نیند تجھ کو درمیانِ کارزار

دیکھ کے وہ تیغ عدو چمکی خدارا ہوشیار

جب نیند کے ماتے جاگ اٹھتے ہیں، جب طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے قیدی کروٹیں لینے لگتے ہیں اور جب اہلِ وطن شاعر کی پکار پر لبیک کہہ اٹھتے ہیں تو جوش میدانِ جنگ کے ایک تجربہ کار کمانڈر کی طرح یہ حکم دیتے ہیں :-

اٹھ اور ہلا کے رکھ دے یہ میدانِ ہست و بود

اغیار کو پیامِ عدم دے ترا وجود

بڑھ اور طوق کاٹ دے زنجیر توڑ دے

رخوتِ شہاں پر آگ کا دامن نچوڑ دے

جیسا کہ ابھی لکھا گیا، جوش میدانِ کارزار کے ایک تجربہ کار کمانڈر ہیں۔ وہ اس حیثیت سے جہاں دوسروں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے انہیں للکارتے ہیں، وہاں خود بھی سعی و عمل کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں اور اس عزم کے ساتھ بڑھاتے ہیں :-

ہٹ کے اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں

خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں

پھر وہ اغیار سے بہ نفسِ نفیس معرکہ آرا ہوتے ہیں۔ ان کے حملے میں جوش و خروش ہی نہیں، شدید قسم کی ضرب بھی ہے۔ فنِ حرب کی یہ خصوصیت ہم ظفر علی خاں کی

میں دیکھ چکے ہیں۔ اب جوش کی یورش و یلغار ملاحظہ ہو۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
"دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو"

"جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیئے کو مار دو گولی پئے امن و بقا"

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انساں کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انساں کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے

لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں

دستکاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

(کمپنی کے فرزندوں سے اقتباس)

جوش کے یہاں برطانوی حکومت سے شدید نفرت کا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ فرنگی استبداد کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت کرنے پر تیار نہیں۔ وہ جب انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو ہر نتیجہ بھگتنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہ رجحان ان کے نڈر، بے باک اور پرجوش مجاہد ہونے کی دلیل ہے۔ وہ آزادئ وطن کی خاطر سولی پر لٹکنے کو بھی بہ جان و دل تیار ہیں۔

پہلے تو ہر اک رہروِ آزاد کو ٹوکو
مانے نہ اگر بات تو زنجیر پہنا دو

سینے میں کھٹکتی ہے مرے جوش کی ہر بات — بس شاعرِ گستاخ کو سولی پہ چڑھا دو

یہی شاعرِ گستاخ اپنے پرجلال تیور، اپنے ترش لب و لہجے اور اپنی انقلابی صداؤں سے اغیار کی صفوں میں تہلکہ مچا دیتا ہے سہ

ہاں بغاوت آگ بجلی موت آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل میرے جلو میں قتلِ عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اٹھتی ہے مری چینِ جبیں سے کائنات
جنگ کے میداں میں میری سیف کی اللہ ری ضو
خاک بن جاتی ہے بجلی برف دے اٹھتی ہے لو

جوش کو پورا یقین تھا کہ آزادی کی تحریک جس شد و مد کے ساتھ جاری ہے اور انگریزوں کی مخالفت میں جو شورشیں اور ہنگامے برپا ہیں، وہ حسین مستقبل کی ضمانت ہیں۔ دیوارِ زنداں منہدم ہو جائے گی، غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور قیدی آزاد ہو جائیں گے۔ "شکستِ زنداں" کے عنوان سے ان کی نظم جنگِ آزادی کے پابجولاں مجاہدین کی بدلی ہوئی کیفیت کا یوں اظہار کرتی ہے سہ

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

انگریزوں نے برِعظیم پاک و ہند پر اپنا عروج و اقتدار قائم رکھنے کی جو بھی تدبیریں اختیار کی تھیں، وہ بالآخر دم توڑنے لگتی ہیں اور قیدی قہرِ بے اماں بن کر بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ سہ

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

جنگ آزادی کے شعرا میں جوش ایک ارفع و اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ ان کی انقلابی شاعری نے جولانیِ امنگ، جوش اور ولولے کے چراغ روشن کئے ہیں[1]۔ انہوں نے جس جرأت اور حقیقت نگاری کے ساتھ ہماری زندگی کی سیاسی کشمکش کو پیش کیا ہے، اردو تو کیا دوسری زبانوں میں بھی اس کا جواب تلاش کرنا آسان نہ ہوگا[2]۔

سیماب اکبرآبادی (م: ۱۹۵۱ء) نے بھی سیاسی انقلاب کی دھمک اپنے سینے میں محسوس کی تھی۔ بدلتے ہوئے وقت اور ماحول میں انہوں نے نہ صرف اپنے شاعرانہ خیالات میں تبدیلی پیدا کی، بلکہ وہ دوسرے شعرا میں بھی انقلاب کی جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں شاعری محض حسن و عشق کی مدح خوانی کا نام نہیں تھا، بلکہ انقلاب انگیز حالات و کیفیات میں ملک و قوم کی رہنمائی بھی اس کے فرائض میں شامل تھی۔ وہ پہلے شخص[3] ہیں جنہوں نے اپنی نظم "شاعر امروز" میں گل و بلبل کی مدح سرائی کرنے والے شاعروں کو ان کے فن کے اصلی مقصد و منشا سے آگاہ کیا ؎

کیا ہے کوئی شعر تیرا ترجمانِ دردِ قوم
تو نے کیا منظوم کی ہے داستانِ دردِ قوم
تو کبھی محفل میں آیا ہے رجز گاتا ہوا
گونجتا، روتا، گرجتا، آگ برساتا ہوا
قوم کے غم میں کیا ہے خون کو پانی کبھی
رہگزارِ جنگ میں کی ہے حدی خوانی کبھی
کیا رلایا ہے لہو تو نے کسی مضمون سے
نظمِ آزادی کبھی لکھی ہے اپنے خون سے

---

[1] بریلوی، ڈاکٹر عبادت: "تنقیدی زاویے"، ص ۳۲۰

[2] حسین، سید احتشام: "روایت اور بغاوت"، ص ۱۹۸

[3] گرچہ اقبال نے اپنے اس شعر ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کے ذریعے شاعروں کے مطمحِ نظر پر شدید طنز کیا تھا، لیکن کوئی اور سخنور اس سیاسی دور میں ایسا نظر نہیں آتا جو سیماب کی طرح شعرائے اردو کو میدانِ سیاست میں کود پڑنے اور رہگذارِ جنگ میں حدی خوانی کرنے پر آمادہ کر رہا ہو۔

اپنے ہم عصر شعرا کو میدان جنگ میں رجز گانے، گونجنے، گرجنے اور آگ برسانے کی تلقین کرنے والے سیماب وقت کی رفتار کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ اسی لئے وہ روایتی شاعری سے منہ موڑ کر انقلاب کے راستے پر آ کھڑے ہوئے ہیں اور نظم "جوش انتقام" میں پکار اٹھتے ہیں ؎

اٹھا دو چنگ و رباب اپنی بزم عشرت سے
کہ آ رہا ہوں صد محشر، جنوں بر دوش
ہے میرے ساتھ پریشانیوں کی اک دنیا
دکانِ حشر چکاں و فغاں صور فروش
نظام بزم مسرت کو فرصتِ تغئیر
اک انقلاب ہے میرے ورود میں روپوش

اپنے جلو میں انقلاب انگیز خیالات لئے ہوئے جب سیماب بزم سخنوراں میں قدم رکھتے ہیں تو اپنے مقصد فن کا برملا اظہار کر دیتے ہیں ؎

میں پیامی ہوں تمہارے مسلک آزاد کا
روح آزادی ہے ہر ٹکڑا مری روداد کا
میں غفلت میں سونے والوں کی نیند اڑانے آیا ہوں
دنیا کو جگا کر چھوڑوں گا، دنیا کو جگانے آیا ہوں

سیماب حرف سوئے ہوئے ہم وطنوں کو جگاتے ہی نہیں ہیں، انہیں ملک کے سیاسی حالات سے آگاہ بھی کرتے ہیں، آزادی کے عدم وجود اور اقتدار سے محرومی کا احساس بھی دلاتے ہیں ؎

وہ بہاریں، وہ چمن وہ گلشن ایجادی کہاں
اے غلام آباد اب وہ تیری آزادی کہاں
بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار
ایک ذرے ایک قطرے پر نہیں ہے اختیار
الغرض ناشاد ہوں برباد ہوں تاراج ہوں
تاج گل تھا میرے سر پر آج میں محتاج ہوں

ملک و ملت کی یہ بربادی یہ تاراجی بے سبب نہیں۔ اس کے پس منظر میں سیاسی

عوامل کام کر رہے تھے، استعماری قوتیں سرگرم عمل تھیں اور بیرونی جارحیت برسرِ پیکار تھی ۔ ان تمام عناصر کو سیماب اکبر آبادی نے غزل کے ایک شعر میں اس طرح سمو دیا ہے کہ برعظیم میں برطانوی دور کی تاریخ خونچکاں بے نقاب ہو گئی ہے ۔

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

اہل وطن کو اس سیاسی پس منظر سے آگاہ کرنے کے بعد سیماب انہیں ہوشیار رہنے، حصولِ آزادی کے لئے جدّوجہد کرنے اور غلامی کے طوق و سلاسل توڑ دینے کا عزم صمیم عطا کرتے ہیں ۔

اے ہند نہ جانے تیری تقدیر میں کیا ہے	کیا تجھ کو ہوا ہے
بدلی ہوئی ذہنیت قومی کی ہوا ہے	کیا وقت پڑا ہے
فرزندِ وطن سے کوئی کہہ دے رہے ہوشیار	ہوشیار! خبردار

سوچ لو آزاد ہو جانے کی تدبیریں تمام
جمع کر لو ذہن میں رفعت کی تنویریں تمام
پھینک دو ہاتھوں سے مایوسی کی تصویریں تمام
کھول دو پائے وطن سے آج زنجیریں تمام
توڑ دو بندِ غلامی اے غلامانِ وطن اے جوانانِ وطن

سیاسی اعتبار سے سیماب ایک کامیاب شاعر ہیں، اس لئے کہ ان کا کلام بقول پروفیسر عبدالقادر سروری "کبھی رجز ہے، کبھی حدی خوانی اور کبھی دلاسا اور خوش آئند مستقبل کا ترانہ"[1] وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بہ جانب ہیں کہ ۔

غلامی کی فضاؤں میں بنیا پھونکا فسوں میں نے
کیا اعلانِ آزادی بہ اندازِ جنوں میں نے

حفیظ جالندھری "اسلامی شائستگی کے احیا کے متمنی ہیں"[2] اور شاہنامے کے ذریعے انہوں نے مسلم مشاہیر کے پرعزم کارناموں کو پیش کر کے مایوس و مضمحل افراد کو روشنی دکھائی

---

[1] سروری، پروفیسر عبدالقادر: جدید اردو شاعری، ص ۲۵۱
[2] ایضاً، ص ۲۶۹

ہے۔ بایں ہمہ انہوں نے سیاسی موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ اس ضمن میں ان کی طویل نظم "فریبِ آزادی" قابلِ ذکر ہے۔ حفیظ نے شیر، سانپ، گھڑیال، نہنگ جیسے خونخوار، مہلک اور زہریلے جانوروں کی تشبیہ کے در پردہ فرنگی حکام کے ظلم و استبداد کی تصویر کشی کی ہے۔ چھوٹی، مترنم اور رواں بحر میں انہوں نے تاریخ کے اندوہناک واقعات کو جس چابک دستی سے پیش کیا ہے، وہ ان کے شاعرانہ کمال کی دلیل ہے۔ ظالم و جابر برطانوی آقاؤں کی تعریف حفیظ کی زبان سے سنیئے ؎

شیروں کو آزادی ہے　　آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں　　کھائیں پئیں آنند رہیں

سانپوں کو آزادی ہے　　ہر بستے گھر میں بسنے کی
ان کے سر میں زہر بھی ہے　　اور عادت بھی ہے ڈسنے کی

پانی میں آزادی ہے　　گھڑیالوں اور نہنگوں کو
جیسے چاہیں پالیں پوسیں　　اپنی تند امنگوں کو

حاکمِ وقت کے اس تعارف کے بعد حفیظ برِ عظیم کی محکوم و مظلوم رعایا کو معصوم اور بے ضرر بھیڑوں کی شکل میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

شیر کے آگے بھیڑیں کیا ہیں　　اک من بھاتا کھاجا ہے
باقی ساری دنیا پرجا　　شیر اکیلا راجا ہے

چند خونی اور موذی شیروں کے آگے لاکھوں لاکھ بھیڑوں کی بے بسی ملاحظہ ہو ؎

بھیڑیں لاتعداد ہیں لیکن　　سب کو جان کے لالے ہیں
ان کو یہ تعلیم ملی ہے　　بھیڑیئے طاقت والے ہیں

ماس بھی کھائیں کھال بھی نوچیں　　ہر دم لاگو جانوں کے
بھیڑیں کاٹیں دورِ غلامی　　بل پر گلہ بانوں کے

حفیظ جالندھری کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ جب تک ان ظالم و سفاک فرنگیوں کا خوف اور ڈر محکوم افراد پر غالب رہے گا، غلامی سے نجات ناممکن ہے۔

جب تک ایسے جانوروں کا ڈر　　　　دنیا پر غالب ہے

پہلے مجھ سے بات کرے　　　　جو آزادی کا طالب ہے

آزادی کے طالب کو شاہنامۂ اسلام کے مصنف جو مشورہ دے رہے ہیں وہ ایک عظیم و جلیل انقلاب کا مظہر ہے ؎

بھیڑیا جب تک شیر نہ بن لیں　　　　نام نہ لیں آزادی کا

حفیظ کی درج بالا نظم جو اسلوب و ہیئت کے لحاظ سے بھی ایک منفرد تجربہ ہے رہروانِ آزادی کے لئے بانگ جرس کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اسے خطرناک قرار دیتے ہوئے ضبط کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔[1]

حفیظ کے جیتے جی آزادی کی طالب و جویا قوم نہتے شیروں کی مانند فرنگیوں سے معرکہ آرا ہوئی اور اس تصادم میں خون کی جو ندیاں رواں ہوئیں ان سے راہِ آزادی میں تازہ پھول کھلتے چلے گئے۔ شیر دل قوم کا یہ بہتا ہوا لہو روشن مستقبل کا ضامن بنتا چلا گیا، بقول حفیظ جالندھری ؎

یہ لہو بہتا رہے گا رنگ لاتا جائے گا

راہ آزادی میں تازہ گل کھلاتا جائے گا

عبدالمجید سالک ایک صحافی کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے "زمیندار" اور "انقلاب" جیسے اخبارات کے ذریعے حصولِ آزادی کی عملی جدوجہد کی تھی۔ اس قلمی جدوجہد میں ان کی شاعری بھی برابر کی شریک ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح سالک بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جب تک اہلِ وطن کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کا وافر جذبہ پیدا نہیں ہوگا، جب تک وہ اغیار سے دست و گریباں نہیں ہونگے اور جب تک ان کا عمل طوفان خیز نہیں ہوگا، اس راہ میں کامیابی سے ہمکنار ہونا آسان نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اشعار کے ذریعے ان باتوں کی مسلسل تلقین کرتے نظر آتے ہیں ؎

---

[1] "ضبط شدہ نظمیں"، مطبوعہ دہلی۔ منقول صدیقی، پروفیسر فصیح الدین: جنگِ آزادی اور مسلمان شعرا، مطبوعہ "علم و آگہی" (قائد اعظم نمبر)، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷-۱۸

تزلزل ڈال دے ایوانِ استبداد میں ایسا

کہ استحکام حریت ہو اس گھر کی نگوں ساری

مسلمانو جنوں کو تازہ کر لو پھر بہار آئی

اگر منظور ہو کٹ جائیں محکوموں کی زنجیریں

تا بکے طوقِ غلامی میں رہے گی گردن

جس میں سودائے حکومت ہو وہ سر پیدا کر

سالک اپنی نظم و نثر کے ذریعے آزادی کی جو جنگ لڑ رہے تھے، اس میں انہیں فتح و نصرت حاصل کرنے کا پورا پورا یقین تھا۔ وہ اس دور کو اپنی آنکھوں سے آتا دیکھ رہے تھے جب غلامی کا خاتمہ ہوگا، ظلم و ستم کی ساعت بدل جائے گی اور آزادی کا مہر طلوع ہوگا۔ ان امید افزا خیالات سے حریت کے علمبرداروں کو آگاہ کر کے سالک نے صحیح معنوں میں شوق و طلب کی لہر کو تیز تر کر دیا تھا۔ اس نوع کے چند اشعار آپ بھی سن لیں ؎

یہ زمانِ حال ہو جائے گا ماضی ایک دن

ایک عظیم الشان مستقبل ہے میرے روبرو

وہ دن آنے کو ہے جب منقلب دورِ زماں ہوگا

مسلمانوں کے حق میں انقلابِ آسماں ہوگا

صنم خانوں میں گونجے گی صدا اللہ اکبر کی

منور نیرِّ توحید سے ہندوستاں ہوگا

حامد اللہ افسر میرٹھی کے یہاں حصولِ آزادی کی وہ تڑپ نہیں پائی جاتی جو اس دور کے دوسرے شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی شاعری کا محور جذبۂ حب الوطنی ہے جو ناکام جنگِ آزادی کے بعد کا موضوع رہا ہے۔ زیرِ نظر دور میں جبکہ شعرائے اردو برطانوی حکومت سے براہ راست ٹکرا رہے تھے، افسر وطن کی عظمت و سربلندی کے گیت گاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو افسر اس نوع کی نظموں سے اہلِ وطن کے دلوں میں ملک کی فضیلت و برتری کے احساس کو دوبارہ اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے وہ پڑھے ہوئے سبق کا آموختہ لازمی تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ فرنگیوں سے جھڑپ، تصادم اور معرکہ آرائی کے ہنگامے میں ان کی

یہ آواز سنائی دیتی ہے ؎

پھولوں سے بھی سوا ہے کانٹا مرے وطن کا
ہے آفتاب مجھ کو ذرّہ مرے وطن کا
دل میں جما ہوا ہے نقشا مرے وطن کا

ہے دکھ سکھ میں دل کا سہارا وطن
ہے آنکھوں میں آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

افسر کے یہاں وطن کی عظمت کے گیت کے سوا اہلِ ملک کے لئے کوئی پیغام بیداری یا ترغیب آزادی کا رجحان نظر نہیں آتا۔ البتہ وہ روشن مستقبل کی بشارت ضرور دیتے ہیں اور موجودہ ظلم وستم سے نجات پانے کا مژدہ بھی سناتے ہوئے ؎

عہدِ گل آنے کو ہے پھولوں کی بارش کے لئے
ختم دورِ برق و بارود و شرر ہونے کو ہے
جلوہ گر ہونے کو ہے صبحِ بہارِ آشتی
ظلم سے آزاد کل نوعِ بشر ہونے کو ہے

افسر میرٹھی کے برعکس ساغر نظامی کے یہاں عزم وعمل کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنے وطن سے صرف یہ کہہ کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتے کہ ع

میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

بلکہ اس کو زیب و زینت عطا کرنے، اس کو عروج بخشنے اور اس کے دشمن کو نیست و نابود کر دینے کا اٹل ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی آواز میں ایک محافظ وطن کا جذبہ صاف جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ بند ؎

اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

ذرّے ذرّے میں محفل سجا دیں گے ہم ۔۔۔ تیرے دیوار و در جگمگا دیں گے ہم
تجھ کو جنت کا گلشن بنا دیں گے ہم ۔۔۔ آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دیں گے ہم

بن کے دشمن ترا جو اٹھے گا یہاں
اس کو تحت الثریٰ میں گرا دیں گے ہم
اور تحت الثریٰ کو فنا کے سمندر میں ارتھی بنا کر بہا دیں گے ہم

ساغر نظامی ملک و ملت کے دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار دینے کا جو آہنی عزم رکھتے ہیں، اس کے پس پردہ ان کا بیکراں خلوص، ان کی اٹوٹ محبت اور بے لوث حب الوطنی کار فرما نظر آتی ہے ــــ یہ وہ صداقتیں ہیں جو ملک کے محافظ و نگراں ہیں یوں خود ہی ہیں اور انہی کی موجودگی میں ہر محبِ وطن اپنی زندگی قربان کر دینے کا آرزومند ہو سکتا ہے۔ ساغر کے یہاں بھی جذبۂ ایثار کی فراوانی ہے۔ وہ تختۂ دار پر بھی وطن کی عظمت و سربلندی کا نغمہ گانے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی مراد مولوی کفایت علی مراد آبادی سے دی جا سکتی ہے جنہیں ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب پھانسی کے لئے قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو نہایت جوش و خروش میں اپنی غزل پڑھتے ہوئے قدم بڑھا رہے تھے[1] ساغر بھی سوئے دار جانے کا جو عزم رکھتے ہیں، اس کا اندازہ درج ذیل بند سے لگائیے ؎

حکم آخر قتل گہ میں جب سنایا جائے گا
جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے گا
جب دکھا یک تختۂ خونیں بٹھایا جائے گا

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

حصول آزادی کے لئے ساغر نظامی تنہا جدوجہد نہیں کرتے، وہ دوسروں کو بھی ترغیب عمل دیتے اور حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں درسِ آزادی کی گونج بکثرت سنائی دیتی ہے۔ اس نوع کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہلا دے جور و استبداد کی سنگیں بنیادیں
غلامی کے بتوں کو گرزِ حریت سے غارت کر
غلامی مستقل لعنت ہے اور توہینِ انساں ہے
غلامی سے رہا ہو اور آزادوں میں شرکت کر

---

[1] ان کا تذکرہ اس مقالے کے چھٹے باب میں کیا گیا ہے۔

پھر شکستہ رشتہ سعی و عمل کو جوڑ دے
اٹھ کے اک جھٹکے میں زنجیر غلامی توڑ دے

ساغر نظامی ملک کے نوجوان طبقے کو بھی غلامی کی زنجیر توڑ دینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ نوخیز نسل کو اس جدّ و جہد آزادی سے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ اسے بھی ماضی کی عظمت کا احساس دلایا جائے محکومی و غلامی کے دور زبوں سے آگاہ کیا جائے اور اس کے دلوں میں آزادی کی قدر و قیمت اجاگر کی جائے۔ چنانچہ وہ نوجوان طبقے کو اس جنگ میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ ساغر کا یہ خیال کتنا درست تھا، اس کا اندازہ تحریک پاکستان کی تاریخ سے لگایا جا سکتا ہے جب بڑوں بوڑھوں کے دوش بدوش نوجوانوں نے بھی آزادی کی راہ میں بے مثال قربانیاں پیش کیں۔[1] نوجوانوں سے ساغر کا خطاب جنگ آزادی کی شاعری میں ایک نئی آواز ہے۔ آیئے ہم بھی اسے سن لیں ؎

اے جوانو، نوجوانو — توڑ دو بند زار غلامی
خوش جمالو، نونہالو — پھینک دو سر سے بار غلامی
اے حسین و علی کے سپوتو — اے محمدؐ کے شہ زور بیٹو
نسل سے بادشاہوں کے تم ہو — پھر بھی ہو یادگار غلامی

اے جوانو، نوجوانو

اپنے وطن اور اہل وطن کو بار غلامی سے نجات دلانا ہی ساغر نظامی کا مقصد حیات رہا ہے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے مسلسل جدّ و جہد کرتے رہے ہیں۔ مختلف بحر اور وزن میں آزادی کے ترانے لکھ کر انہوں نے نہ صرف اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے بلکہ حریّت پسند شاعروں کی اولین صف میں آ کھڑے ہوئے ہیں اور بڑے خلوص اور نہایت سوز و گداز بھرے لہجے میں خدائے بزرگ و برتر سے آزادی کی بھیک مانگتے ہیں ؎

وہ آزادی الٰہی خستہ کاموں کو بھی مل جائے
وہ آزادی الٰہی ہم غلاموں کو بھی مل جائے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زمن مختار: Role of Students in Pakistan Movement، کراچی، ۱۹۶۸ء

احسان دانش اگرچہ شاعرِ مزدور کی حیثیت سے اجاگر ہوئے لیکن حریت پسند شعرا کے قافلے میں بھی شریک رہے ہیں اور اس حد تک کہ بقول شورش کاشمیری:

"۱۹۳۲ء کے بعد ملک میں جتنی قومی یا سیاسی تحریکیں
ابھریں، دو چار شاعروں میں احسان بھی ایک شاعر تھے
جن کا کلام مقرروں نے دلوں میں گرمی پیدا کرنے کے لئے
استعمال کیا، بلکہ بعض مقرروں پر ان اشعار کے برمحل
استعمال کی وجہ سے بغاوت کے مقدمے چلے"۔[1]

احسان دانش کی جن نظموں نے اہلِ وطن کے دل میں سیاسی بیداری پیدا کی تھی ان میں "فقدانِ معاش"، "امیدِ آزادی" اور "غلامی کی خصوصیات" وہ منظومات ہیں جو بحکم سرکار برطانیہ ضبط ہوئی تھیں۔[2]

احسان بخوبی جانتے تھے کہ برعظیم میں غلامی کی جڑیں کافی دور دور تک پیوست ہیں اور اس کے اثرات اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ بادی النظر میں ان کا بیخ و بن سے اکھڑنا کوئی آسان کام نہیں۔ اہلِ برطانیہ نے سائنسی ترقی اور دیگر اصلاحات کے ذریعے جو اجالا پھیلا دیا ہے، وہ آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے اور لوگ اس طلسم خانے میں کچھ ایسے آسودہ حال ہیں کہ انہیں اپنے حال زبوں کا احساس تک نہیں۔ ان خیالات کو احسان نے جا بجا پیش کر کے صحیح معنوں میں اہل وطن کے ذہن و دل پر پڑے ہوئے جالے کو صاف کیا ہے۔ ایسے اشعار میں بلا کا طنز اور غضب کی تلخی پوشیدہ ہے۔

غلامی کے شبستانوں میں زہریلا اجالا ہے
جو اس میں آ کے سویا وہ کہاں پھر اٹھنے والا ہے
اللہ اللہ یہ عقیدوں کی سراب آرائیاں
کس تکلف سے غلامی زمزمہ پرواز ہے
دے دیا ہے تجھ کو غفلت نے غلامی کا خطاب
ہے تری غیرت کے منہ پر بے حیائی کی نقاب

---

[1] کاشمیری، شورش: "روپ بہروپ"، مطبوعہ جامِ نو کراچی، احسان دانش نمبر ۱۹۷۴ء، ص ۱۷۶
[2] ضبط شدہ نظمیں، منقول صدیقی، وضیع الدین، "جنگِ آزادی اور مسلمان شعرا"، مطبوعہ علم و آگہی کراچی (قائداعظم نمبر) ۱۹۷۷ء، ص ۱۸

احسان دانش کا مطمحِ نظر انقلاب ہے۔ وہ قوم کی غفلت شعاری پر محض طنز کر کے ہی نہیں رہ جاتے، اس میں انقلابی رجحان پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تاکہ وہ غلامی کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ ہو۔ ان کی نظر میں یہی آمادگی حصولِ آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے ؎

ہو چکا ہے تیری خودداری کا شیشہ چور چور
کھول آنکھیں اے غلاموں کے غلامِ بے شعور
جو راہ میں پہاڑ ہوں تو بے دریغ اکھاڑ دو
اٹھاؤ اس طرح نشاں فلک کے دل میں گاڑ دو
تنوں میں مفلسوں کے پھونک دے وہ روحِ آزادی
غلاموں کا سکوت آمادۂ پیکار ہو جائے

احسان دانش جد و جہدِ آزادی سے مطمئن بھی نظر آتے ہیں اور اس کے خوش آئند نتیجے کی خبر بھی یوں سناتے ہیں ؎

گونج اٹھنے کو ہیں ہر گوشے میں آزادی کے راگ
خامشی کا لمحہ لمحہ گوش بر آواز ہے

تلوک چند محروم بھی جذبۂ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں یہ رجحان خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ ملک کی بربادی، قوم کی محکومی اور حکمراں طبقے کی ستم گری سے بے حد کبیدہ خاطر تھے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار وہ حسرت و مایوسی کے لہجے میں اس طرح کرتے ہیں ؎

یہ قفس اور اس میں یوں افسردہ و ناشاد ہم
خانہ پرورد چمن ہیں آخر اے صیاد ہم
تیرا خوں ہونا دلِ حسرت نشاں دیکھا کئے
منظرِ خونیں بچشمِ خوں فشاں دیکھا کئے
وطن جس کا ہو پابندِ الم وہ شادماں کیوں ہو
قفس ہو آشیاں جس کا وہ بلبل نغمہ خواں کیوں ہو

محروم سیاسی حالات کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ملک میں رونما ہونے والے
انقلاب کی خبر بھی دیتے ہیں۔ اس قسم کے جذبے کے اظہار میں ان کے دلی سکون وطمانیت
کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ بند ؎

جے ہند کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے　　جے ہند کی عالم میں صدا گونج رہی ہے
یہ ولولہ یہ جوش یہ طوفان مبارک
ہر آن مبارک

تلوک چند انقلاب تو چاہتے تھے لیکن خود انقلابی نہیں تھے۔ ان کے کلام میں
جوش و ولولے کے وہ اثرات نظر نہیں آتے جو اس دور کے دیگر شعرا کے یہاں ہمیں
ملتے ہیں۔ وہ مجاہدوں کے قافلے کے دوش بدوش نہ آگے بڑھتے ہیں نہ ہی اغیار
سے معرکہ آرا ہوتے ہیں۔ البتہ منزل مقصود کی طرف اس انداز میں رہنمائی ضرور
کر دیتے ہیں ؎

وہ سامنے آزادیٔ کامل کا نشاں ہے　　مقصود وہی ہے وہی منزل کا نشاں ہے
درکار ہے ہمت کا سہارا کوئی دم اور
دو چار قدم اور

روش صدیقی نے بدلتے ہوئے ماحول کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ وہ انقلاب
کے نعرے بھی سن رہے تھے۔ مجاہدین صف شکن کو دشمنوں سے معرکہ آرا ہوتے
ہوئے بھی دیکھ رہے تھے ——— ان میں اتنا دم خم تو نہ تھا کہ بڑھ کر اس قافلۂ جاں
نثارانِ وطن کے ساتھ ہو لیتے اور انقلاب آفریں نعرے بلند کرتے۔ اس کے
باوجود وہ فرنگی تہذیب و تمدن کے خاتمے کے آرزومند ضرور تھے۔ وہ اس
حکمراں طبقے کو روبہ زوال دیکھنا چاہتے تھے جس نے برعظیم میں ظلم و بربریت
سے کاشانۂ انساں کو ویراں کر دیا تھا، آپس کے دیرینہ تعلقات اور باہمی
یگانگت کو اپنی سازشوں سے زہر آلود کر دیا تھا۔ چنانچہ تحریک آزادی کے
عروج کو دیکھ کر وہ یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھے کہ بیرونی جارحیت کا نام و
نشان مٹ جانے سے "مشرق" کی عظمت و سربلندی دوبارہ ابھر آئے گی۔

روشؔ اپنی طویل نظم "ساقی" میں اس خیال کو نہایت قطعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ چند منتخب اشعار کے مطالعے سے ان کے اس روح پرور جذبے کی توثیق ہو جائے گی ؎

جس نے صہبائے محبت کو کیا زہر آلود
آج اس زہر سے ہے مرگ بہ جام اے ساقی
جو غمِ عشق کی عظمت کو سمجھتا تھا حرام
اس پہ ہر لمحۂ راحت ہے حرام اے ساقی
خود کہے دیتی ہے خاکستر تہذیب فرنگ
کون تھا سوختۂ آتش خام اے ساقی
گریہ ہے پرِش پرستی کی سزا کا آغاز
کیا ہو اب دیکھئے پاداشِ تمام اے ساقی

روشؔ صدیقی گرچہ مجاہدوں کے شانہ بشانہ راہِ آزادی میں رواں دواں نہ تھے، لیکن ان کی تیز رفتاری کا مشاہدہ کرکے یہ اندازہ ضرور لگا چکے تھے کہ منزل قریب ہے اور آزادی کا حسین و دلکش دور جلد ہی آنے والا ہے۔ چنانچہ اپنی نظم "روشنی" میں وہ آمدِ بہار کا مژدہ یوں سناتے ہیں ؎

دیکھ کر دیدۂ گیتی میں فروغِ امید
مطمئن ہوں کہ بہت جلد وہ دور آئے گا
جسے گردوں نے ستاروں میں چھپا رکھا ہے
کہکشاں نے جسے اک راز بنا رکھا ہے
قدسیوں نے جسے انساں سے چھپا رکھا ہے
ختم ہونے کو ہے افسانۂ محرومیٔ دید
اب یہ پردہ رخِ امکاں سے سرک جائیگا

برعظیم میں انقلاب کی صدا جس طنطنے کے ساتھ گونجی تھی اور فرنگی ظلم و استبداد کے خلاف جس حوصلے سے مورچہ باندھا گیا تھا، اسے دیکھ کر روشؔ صدیقی کا دل یہ ضرور گواہی دے رہا تھا کہ غلامی کا شبِ ہائے فسوں بکھرنے ہی والا ہے اور حرکۂ آتش و خوں کے پس منظر سے ایک "نئی دنیا" طلوع ہونے کو ہے۔ آیئے اس نئی

دنیا کے قیام کا مژدہ شاعر کی ہی زبانی سن لیا جائے ؂

یہ سکوں اور یہ شب ہائے غلامی کا فسوں
زورِ طوفانِ تغیر سے بکھر جائے گا

وقت توڑے گا روایات کے بت خانوں کو
غرق کر دے گا کمالات کے ایوانوں کو
پھونک دے گا درِ ظلمت کے نگہبانوں کو

ہے یہ مژدہ کہ پسِ معرکۂ آتش و خوں
چہرۂ عالمِ ایجاد نکھر جائے گا

جب تصور پہ غلامانِ خرد تھے مغرور
وہ جہاں سوز تصور ہے چراغِ سحری

اب گریبانِ تمرد میں رفو ناممکن
تنِ بے روح میں تجدید نمو ناممکن
رنگ لائے نہ صداقت کا لہو ناممکن

جلوہ گر لوحِ تغیر پہ ہے یہ آیتِ نور
کہ گرا چاہتا ہے خیمۂ بیدادگری

خوش ہوا ہے دوست کہ وہ دورِ بہار آتا ہے
جب کو نزدیک خزاں کر نہ سکے گا انساں

اس حقیقت کے باوجود کہ "روش کی شاعری میں سیاسی تخیل زیادہ پر زور نہیں تھا[1]، انہوں نے بدلتے ہوئے ماحول اور معاشرے کا عمیق مشاہدہ ضرور کیا تھا اور انقلاب کی رفتار سے جو نتیجہ وہ اخذ کر پائے تھے وہ مثبت اقدار پر مبنی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سعی و عمل کی ہما ہمی نہ ہونے کے باوجود حسین و جمیل مستقبل کی بشارت ضرور ملتی ہے۔ ان کی شاعری کا یہ عنصر غلامی کے تیرہ و تار ماحول میں کچھ کم خوش آئند نہ تھا۔

---

[1] حسین، سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۲۶۱

الطاف مشہدی اپنے جوشیلے نغموں کی بدولت حریت پسند شاعروں میں خاصے جانے پہچانے نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں مرد مجاہد کا آہنی عزم ہے، محافظ وطن کا بیکراں جوش ہے اور سپاہی کی للکار ہے۔ وہ دشمنوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر حملہ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ وطن کی محبت انہیں اغیار کے ساتھ کسی طرح کی بھی رعایت کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ سید احتشام حسین کے خیال کے مطابق "ان کا جوش و خروش اصلاحات کے ساتھ صلح کرنے پر کسی طرح رضا مند نہیں معلوم ہوتا"۔[1] ان کی فطرت میں انتقام کا جو جذبہ کار فرما ہے، اس کی جھلک ملاحظہ ہو ؂

ہندوستاں کا ندھوں پر رکھے باغی بر سو گھوم رہے ہیں
اونچے اونچے میناروں پر سرخ پھریرے جھوم رہے ہیں
زندانوں کی دیواروں کو توڑ دیا ہے دیوانوں نے
انسانوں کے آگے جھکنا چھوڑ دیا ہے انسانوں نے
چاروں جانب پھیل رہا ہے خون کے فواروں کا منظر
خون کے فواروں کا منظر، پیلے انگاروں کا منظر
آگ کے شعلے خون کے چھینٹے تیر رہے ہیں سرخ فضا میں
چیخوں کا طوفان بپا ہے بھڑ بھڑ کرتی گرم ہوا میں

الطاف مشہدی انقلاب کا یہ منظر دکھا کر اہل وطن کے دلوں میں ظلم و استبداد کے خلاف نفرت کی چنگاریاں سلگا دیتے ہیں اور جب یہ شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتی ہیں تو پھر انہیں یہ تلقین کرتے ہیں ؂

قصرِ استبداد کو برباد کرنے کے لئے جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے
مستئ صہبائے آزادی لہراتے چلو
ابر کی صورت بلند و پست پر چھاتے چلو
قہقہوں سے لیلئ مغرب کو شرماتے چلو

الطاف کے یہ قہقہے ایک مظلوم و محکوم کے قہقہے نہیں، بیدار و ہوشیار اور جیالے سپوتوں

---

[1] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۱۹۹

کے تبعیے تھے جن سے فرنگیوں کے قصر و ایواں لرزاٹھے تھے۔

الطاف مشہدی کی طرح کی گھن گرج، طنطنہ اور جوش و خروش شورش کاشمیری کے کلام کی بھی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ نوجوانی کے زمانے سے ہی عملی سیاست کے میدان میں گامزن رہے ہیں[۱]۔ "برطانوی دور میں جب تحریک آزادی کی مہم زوروں پر تھی تو انہوں نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنی شعلہ مقالی اور آتش بیانی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے"[۲]۔ فرنگی حکام نے انہیں اس جرم کی پاداش میں ساڑھے دس سال قید میں رکھا[۳]۔ گویا آزادی کی جنگ میں وہ نظریاتی طور پر نہیں عملی طور پر شریک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں انکا اپنا عمل، انکا اپنا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ جیسا کہ خود رقمطراز ہیں:

"میں نے جو کچھ کہا ہے، اس پر عمل بھی کیا ہے۔ ان سیاسی شعروں میں میرے کردار کی پوری پوری جھلک موجود ہے"[۴]۔

آغا شورش نے ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے برعظیم کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ غیر ملکی حکام کے ظلم و سفاکی کا طویل دوران کے سامنے تھا۔ آزاد و خود مختار قوم کی بے بسی و بے چارگی کی تصویر ان کے روبرو تھی۔ ان تلخ اور کربناک حالات نے شورش کے دل میں انگریزوں سے انتقام لینے کے جذبے کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ برطانوی شہنشاہیت کے وجود کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ بلکہ اس سے وطن کے ناموس و وقار کی بربادی اور قوم کی تذلیل و رسوائی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ ان کے اس ارادے کا اظہار کچھ اس طرح ہوا ہے ؎

لینا ہے مجھے ہند کی تذلیل کا بدلا
ناموس کی بجھتی ہوئی قندیل کا بدلا

۱۔ کامل محمد وارث: آغا شورش کاشمیری، مطبوعہ نقوش، لاہور (شخصیات نمبر ۲) اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۳۲

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ کاشمیری، شورش: دیباچہ گفتنی و ناگفتنی

یہ ملک ہوا جس کے تشدد کا نشانہ
اب اس کی تباہی کا بھی آیا ہے زمانہ
خورشید شہنشاہی کو ڈھلتے ہوئے دیکھوں
سینے میں عزائم کو مچلتے ہوئے دیکھوں
یورپ کی فضاؤں میں قضا جاگ اٹھی ہے
اب جنگ کفن چور لٹیروں میں ٹھنی ہے

آغا شورش کاشمیری جذبۂ فراواں لئے ہوئے خود تو آگے بڑھتے ہی ہیں، اہل وطن کو بھی آواز دیے چلے جاتے ہیں کہ آؤ اور جنگِ آزادی میں شریک ہو جاؤ۔ ان کے پیغام میں بلا کا اثر ہے۔ سننے والا تیغ بکف میدان کارزار کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے ؎

اے لشکرِ ملت کے رضاکار جوانو — آزادیٔ کامل کے طلبگار جوانو
تقدیر کو تدبیر کے بازو پہ جھکا دو — ناموسِ وطن کے لئے جانوں کو لڑا دو
کہتا ہوں سنو جوشِ جوانی کو پکارو — چلتی ہوئی تیغوں کی روانی کو پکارو
مقتل سے اٹھا لاؤ شہیدوں کے سروں کو — آواز دو آواز تبہ حال گھروں کو

شورش کاشمیری بھی نئے دور کی آمد کی خبر دے رہے ہیں مگر بہ انداز دگر ؎

اک نئے دور کی ترغیب کے ساماں ہوں گے
دستِ جمہور میں شاہوں کے گریباں ہوں گے

مولانا اقبال احمد سہیل جو شبلی اسکول کے پروردہ تھے[۱]، اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی فرنگیوں کے مخالف تھے۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے مصر میں برطانوی پالیسی پر ایک سخت قسم کا مضمون "اردوئے معلیٰ" میں لکھا تھا جس کا ذکر حسرت موہانی کے باب میں آ چکا ہے۔ وہ شبلی کی قومی و سیاسی شاعری سے متاثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جدوجہد آزادی کے رجحانات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ کہیں وہ آزادیٔ گلشن کا ترانہ گاتے ہیں، کہیں اسیری کی زنجیر ٹوٹنے کی

---

[۱] ندوی، سید سلیمان: حیاتِ شبلی، ص ۲۸۹

دعا مانگتے ہیں اور کبھی ظالم و جابر حکمراں کے خاتمے کی خبر سناتے ہیں۔ ان کے اشعار میں جوش و خروش کا عنصر تو نہیں پایا جاتا، لیکن سیدھے سادے کلام میں خلوص کی جلوہ گری ضرور نظر آجاتی ہے ؎

گائیں گے ہم آزادیٔ گلشن کا ترانہ
بے کار ہے اے برق بلا ہم کو ڈرانا

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے اسیر غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہے باغباں نے آکے گلچیں بھی لوٹ جائے

وہ دور مسرت آنے دو قومی پرچم لہرانے دو
جاتی ہے غلامی جانے دو صدیوں کا دلدر جاتا ہے
جس نے یہ چمن برباد کیا مشرق کو غلام آباد کیا
وہ قہر مجسم جاتا ہے وہ سحر مصور جاتا ہے

تحریک آزادی کے اس ارتقائی دور میں ہر شخص رواں دواں تھا۔ ہر ایک کو منزل حریت تک پہنچنے کی فکر دامن گیر تھی۔ اس قافلے میں اردو کے قومی و سیاسی شعرا بھی شامل تھے جن کا تفصیلی جائزہ ہم ابھی ابھی لے چکے ہیں، اور رومان پرست سخنوربھی شریک سفر تھے۔ گرچہ ان کا موضوع کل عشق و محبت کی سرمستیاں تھیں اور رومان ہی ان کا حاصل فکر و نظر تھا، لیکن تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی ماحول سے وہ الگ تھلگ نہیں رہے۔ وہ بھی اہل وطن کے دلوں کی دھڑکنیں سن رہے تھے، انقلاب کی صدائیں ان کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں اور معرکۂ حق و باطل کا نظارہ وہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایسی صورت حال میں انہوں نے اپنی محسوسات کے دروازے مقفل نہیں رکھے بلکہ ذہن و دل کے دریچوں سے خارجی حالات و کوائف کا مشاہدہ کرنا ہی مقصدِ فن سمجھا۔ ایسے رومان پرست شعرا میں اختر شیرانی سرفہرست ہیں۔

وادیٔ رومان میں اپنا مستقر بنانے کے باوجود اختر آزادی کے مداح اور قدرشناس تھے، اس حد تک کہ اس پر اپنا عشق قربان کر دینے سے بھی انہیں انکار

نہ تھا۔

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے — عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے
عشق پہ کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی — لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

اختر شیرانی رومان پرست ہونے کے باوجود ایک مجاہد کا جذبہ رکھتے تھے اور اغیار سے معرکہ آرا ہونے اور اسے زیر و زبر کر دینے کا عزم راسخ ان میں نمایاں تھا۔

خرمنِ ہستیٔ اعدا کو جلا کر اس سے — کار ان کی فضاؤں میں چراغاں کر دیں
جان جائے کہ رہے ملک کی خاطر ہمدم — دشمنِ ملک کو تو بے سر و ساماں کر دیں

سلمیٰ و ریحانہ کے قصیدہ نگار وطن کی راہ میں قربان ہو جانے کے کس درجہ آرزو مند تھے' اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

سر کٹا کر سر و سامانِ وطن ہونا ہے
نوجوانو ہمیں قربانِ وطن ہونا ہے
جان دینے کے لئے کیوں نہ ہوں اختر تیار
ایک نہ اک دن ہمیں گر جانِ وطن ہونا ہے

اختر شیرانی نے اہلِ وطن کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے اور اپنی معرکہ آرائی کا حوصلہ عطا کرنے کے لئے "ساقی اٹھ تلوار اٹھا" جیسی معرکتہ الآرا نظم لکھی تھی۔ اس سے انہوں نے "وہی کام لینا چاہا ہے جو عرب شعرا اپنے قبیلے میں شجاعانہ جذبات کو بیدار کرنے کے لئے اپنے قصائد سے لیا کرتے تھے"۔[1] اس کے دو بند یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ آزادی کی جنگ کے دوران اس رند مشرب شاعر کے نغمے نے دلوں میں کیسی ہلچل اور تپش پیدا کر دی ہوگی۔

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثارِ آزادی' جاں میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لیں ہاتھوں سے لوائے آزادی

---

[1] جستی' ڈاکٹر یونس: اختر شیرانی کی شاعری کے دوسرے پہلو' مطبوعہ اردو' کراچی' شمارہ ۲' ۱۹۷۴ء' ص ۵۹

وہ بلبلہ بلغار اٹھا
اٹھو ساقی اٹھو تلوار اٹھا

ناموسِ وطن کو غیروں کے پنجے سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس انکی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں

لا برقِ فنا آثار اٹھا
اٹھو ساقی اٹھو تلوار اٹھا

میدانِ کارزار میں حصولِ آزادی کی خاطر جوہرِ شجاعت دکھانے کی آرزو ان کے دل میں کروٹیں لیتی رہی ہے۔ وہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں ؎

اور اگر زخم بھی آنا تھا بہر رنگ تو یہ
ملک کے واسطے میدان میں آیا ہوتا
گل کی ہے آرزو نہ گلستاں کی آرزو
سینے میں حشر خیز ہے میداں کی آرزو

اختر شیرانی کی یہی آرزو اس عورت کی آرزو بن کر ابھرتی ہے جس کا شوہر جنگِ آزادی میں اپنا سر کٹا چکا ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کا ننھا بچہ جوان ہو کر وطن کے تحفظ و سلامتی کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور باپ کے نقش قدم پر چل کر دشمنوں کے خون کی نہریں بہائے اور وطن عزیز کو غیروں کے پنجے سے چھڑائے ؎

مرا ننھا بہادر ایک دن ہتھیار اٹھائے گا
سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہِ رزم جائے گا
وطن کے دشمنوں کے خون کی نہریں بہائے گا

اور آخر کامراں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کی جنگِ آزادی میں جس نے سر کٹایا ہے
یہ اس شیدائے ملت باپ کا پرجوش بیٹا ہے
ابھی سے عالمِ طفلی کا ہر انداز کہتا ہے

وطن کا پاسباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کے نام پر اک روز یہ تلوار اٹھائے گا
وطن کے دشمنوں کو کھینچ تربت میں سلائے گا
اور اپنے ملک کو غیروں کے پنجے سے چھڑائے گا

غرور خانداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

اختر شیرانی نے دراصل اس ولولہ انگیز نظم کے ذریعے نئی نسل کے دل میں جذبۂ حب الوطنی کو ابھارا ہے اور اسے یہ پیغام دیا ہے کہ جس طرح اسلاف حصول آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے تھے یہ بھی وطن کی راہ میں تلوار اٹھائے۔ ان کی یہ آرزو بیوہ ماں کی آرزو کا ہی مظہر نہیں، برعظیم کی تمام مقدس و محترم ماؤں کی آرزوؤں کا مظہر بن گئی ہے۔

اگر اختر شیرانی رومانی شاعری نہ بھی کرتے تو تاریخ ادبیات اردو میں حریت پسند شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام مخصوص ہو چکا تھا۔

جگر مرادآبادی حسن و عشق کے شاعر ہونے کے باوجود سیاسی ماحول سے غیر متاثر نہیں رہے ہیں۔ انہیں غلامی کا شدید احساس تھا۔ غیروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنا انہیں گوارا نہ تھا۔ وطن کی تباہی و بربادی کے منظر سے وہ بے حد دل گرفتہ تھے۔ ان خیالات کا اظہار ان کی غزلوں میں جا بجا ہوا ہے۔ مثلاً یہ اشعار

ناز جس خاک وطن پر تھا مجھے آہ جگر
اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا
نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

کرم صیاد کے صدہا ہیں پھر بھی
فراغ خاطر اہل قفس کیا

جگر سیاسی نکبت و ادبار سے مایوس نہیں ہوتے۔ حصول آزادی کے لئے برعظیم میں جو جدوجہد جاری تھی اس سے وہ مطمئن تھے۔ ان کی نظر میں مقید طائر کے بال و پر میں جو لرزش پیدا ہوئی تھی وہ اغیار کے لئے نشتر ثابت ہو رہی تھی۔ جدوجہد

آزادی کی اس پوری کیفیت کو انہوں نے درج ذیل شعر میں بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے ؎

صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں
اک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

ہماری تاریخ شاہد ہے کہ فرنگیوں کے ظلم و جور نے شوقِ آزادی کو اور بھی پروان چڑھایا ہے۔ اہلِ وطن کو کچلنے، ان کے ذہن کو مفلوج کرنے اور ان کے نعرۂ حق کو دبانے کے لئے حکمران طبقے نے جس قدر بھی مظالم ڈھائے، اس سے آزادی کا جذبہ اور بھی ابھرا اور جوش و خروش میں مزید اضافہ ہوا[1] جگر اس ظلم اور تشدد سے ہراساں نہیں ہوتے بلکہ اسے عوامی بیداری کا سبب قرار دیتے ہیں اور اس بات کے لئے وہ دشمنوں کے ممنونِ احسان ہیں ؎

میری زباں پر شکوۂ اہلِ ستم نہیں
مجھ کو جگا دیا یہی احسان کم نہیں

غزل کے اس شاعر نے غزل ہی کے اشعار میں نہایت یقین و اعتماد کے ساتھ جدو جہدِ آزادی کے کامیاب ہونے، اغیار کے رختِ سفر باندھنے اور نئی سحر کے طلوع ہونے کی خبر بھی دی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں جب حکومت کی غلط پالیسیوں کے سبب[2] بنگال میں قحط پڑا تو جگر نے اسی وقت یہ اعلان کر دیا تھا ؎

ہر چند کہ آثار تو کچھ اور ہیں لیکن
اک خیر بھی در پردۂ شر دیکھ رہا ہوں

---

[1] ناظرین حسرت موہانی کا یہ شعر بھولے نہیں ہوں گے ؎
اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں ‏ ‏ ‏ پھیلے گی یونہی شورشِ حبِّ وطن تمام

[2] دسمبر ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس قائدِ اعظم محمد علی جناح کی زیرِ صدارت کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی چوتھی قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ "مرکزی حکومت نے ایسی پالیسی وضع کی جو قحطِ بنگال کا سبب بنی"۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پیرزادہ سید شریف الدین: Foundations of Pakistan، جلد دوم، ص ۴۷۴

بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیٔ ارباب نظر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ
اغیار کو مجبور سفر دیکھ رہا ہوں
رحمت کا چمکنے کو ہی پھر نیر تاباں
ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا ابتک
اس خواب کی تعبیر جگر دیکھ رہا ہوں

ناظرین :- درج بالا اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ جگر وقت، ماحول اور معاشرے سے الگ تھلگ نہیں تھے، بلکہ اسی میں رہ کر تمام سیاسی اُتار چڑھاؤ کا عمیق مشاہدہ کر رہے تھے۔ وہ مجاہدین آزادی کے قافلے میں اگر شامل نہ تھے تو اس سے کچھ دور بھی نہ تھے ورنہ ان کی غزلوں کو سیاسی زبان کہاں سے ملتی۔

تحریک آزادی کے اس ارتقائی دور میں اردو شاعری کو سیاسی زبان دینے والے شاعروں کا قافلہ خاصا پھیلا ہوا ہے۔ اس میں محوی لکھنوی بھی ہیں جو یہ کہہ کر کہ ع
حکومت جسم پہ ہو سکتی ہے دل پر ہو نہیں سکتی
ایک نیا شعور دے رہے ہیں۔ احمق پھپھوندوی بھی ہیں جو اہل وطن کو مزید قربانیوں کے لئے یوں تیار کر رہے ہیں ؎

کھینچو گے ابھی تختۂ دار پر تم ابھی تم کو پھانسی پہ جانا پڑے گا

وحشت کلکتوی جیسے غزل گو شاعر بھی ہیں جو جہد و عمل اور ہمت و استقلال کا پیغام دے رہے ہیں ؎

مژدہ اے پائے طلب ہمت کا پیغام آگیا
اٹھ کہ فرمان عمل اے دل ترے نام آگیا

کوکب شادانی ہیں جو اس طرح انقلابی نعرہ بلند کر رہے ہیں ؎

اٹھو اور اٹھ کے غلامی کی بیڑیاں کاٹو

خدا کے سامنے دو امتحانِ آزادی

خان غازی کابلی بھی ہیں جو بڑے طنطنے، رعب اور دبدبے کے ساتھ انگریز حکمرانوں کے لئے یہ حکم نافذ کر رہے ہیں ؎

کہہ دو یہ فرنگی سے ہندوستاں خالی کرو
مہمانی ہو چکی میرا مکاں خالی کرو

اور محمود اسرائیلی ہیں جو محبانِ وطن اور مجاہدینِ آزادی کو نئے دور کی آمد کی نوید دے رہے ہیں ؎

محبانِ وطن کے دل شگوفے بن کے پھوٹیں گے
اب حریت کے خوں سے ہوگا حسنِ گلستاں پیدا
بدل جائے گی فطرت انقلاب آئے گا دنیا میں
اب ان ہندی غلاموں ہی سے ہوں گے حکمراں پیدا

حدِّ نگاہ تک پھیلے ہوئے اس بے پناہ قافلے کے کس کس رکن کا تعارف کرایا جائے کہ ہر ایک جذبۂ آزادی سے سرشار ہے اور منزلِ مراد تک پہنچنے کے لئے بے چین و مضطرب دکھائی دے رہا ہے۔ ہم اس قافلے کو یہیں چھوڑتے ہیں اور اپنی توجہ ایک چھوٹے سے کارواں کی جانب مبذول کرتے ہیں جو سرخ پھریرا ہوا میں لہراتا کسی اور ہی راستے سے منزلِ حریت کی طرف رواں دواں ہے۔ آیئے اس ترقی پسند جماعت سے وابستہ شاعروں کا جائزہ بھی لے لیا جائے کہ ان کے فکر و فن سے ہمارے موضوع کو خاصی وسعت ملی ہے۔

بارھواں باب

ترقی پسند تحریک کا دور

بیسویں صدی کی تیسری دہائی اقوامِ مغرب کے لئے بے پایاں کرب والم کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی۔ فاشیت کے ابھرتے ہوئے ابلیس نے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کو تیرہ وتار کردیا تھا۔[1] زندگی یقین واعتماد کی رعنائیوں سے یکسر محروم ہوگئی تھی۔ جرمن استعمار پسندوں کے خونیں پنجے ادیبوں، شاعروں، سائنس دانوں اور دیگر فنکاروں کے حلقۂ حیات کو تنگ کرتے جارہے تھے۔[2] اشتراکی لیڈر بھی ظلم وبربریت کا نشانہ بن رہے تھے۔ امن وآشتی کی آواز بلند کرنے والے ہر سپاہی کو جلاوطن کیا جارہا تھا۔ ظلم وجور کا یہ کربیہ منظر مغربی دنیا میں عام ہوچکا تھا۔ یہی وہ دور تھا جب مزدوروں کی منظم قوت فاشیت کے سامنے سینہ سپر ہوکر کھڑی ہوگئی۔ ظلم وستم کے خونیں پنجے کو توڑنے کے لئے اہلِ ہنر سڑکوں پر نکل آئے۔[3]

ادب زندگی کا ترجمان ہے، حیات کی بدلتی ہوئی قدروں کا امین ہے اور ماحول و معاشرے کی آواز ہے۔ چنانچہ مغربی دنیا کے ادیبوں اور شاعروں نے امن وآشتی، حق و انصاف اور مساوات و انسان دوستی کی روشنی پھیلا کر فاشیت کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا سینہ چاک کردینے کا منصوبہ بنایا۔ یہی وہ رجحان و نظریہ تھا جس نے دنیا بھر کے قلمکاروں کو ہم آہنگ کردیا اور انہوں نے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع کی۔[4] ان کا مقصد ہر طرح کے استحصالی نظام سے انسانیت کو آزاد کرانا تھا، بقول پروفیسر ممتاز حسین: "انسانیت کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں جن قوتوں نے حصہ لیا ہے، انہیں ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔"[5]

۱؎ تفصیل کے لئے دیکھئے 'Oxford Junior Encyclopaedia'، جلد پنجم، ص ۲۲۴، ۲۲۵ و ۳۲۵

۲؎ عظیم وقار: نیا افسانہ، ص ۶۵

۳؎ ایضاً

۴؎ ایضاً

۵؎ حسین، پروفیسر ممتاز: ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق، مطبوعہ نقوش، لاہور، ادب عالیہ نمبر، اپریل ۱۹۶۰ء، ص، ۳۴۱

برعظیم میں یہ تحریک ۱۹۳۶ء[1] میں ان "اشتراکی ادیبوں"[2] کے ہاتھوں وجود میں آئی جو لندن میں بغرض تعلیم مقیم تھے[3] اور جنہوں نے پیرس میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت بھی کی تھی۔ ان ترقی پسند مصنفین کا مطمح نظر یہ تھا کہ ملک کی روایتی، افیون زدہ اور رسم و رواج میں جکڑی ہوئی غلامانہ ذہنیت کو بدلنے اور کروڑوں کی تعداد میں غربت سے سسکتے ہوئے انسانوں کے لئے بہتر معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لئے غیر ملکی سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف کام کرتے رہیں[4]۔ اور اس طرح ملکی فسطائیت کے ہر گوشے پر حملہ کریں[5]۔ "جہاں بھی اس زہر کا ایک قطرہ موجود ہوگا، اس کو ترقی پسند ادیبوں کے قلم کی نوک ضرور کرید دے گی"[6]

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادب کا جو مقصد متعین کیا گیا تھا، اسے انجمن کے کرتا دھرتا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زبانی سنئے:

> "اب ادب کو محض فوٹو گراف سمجھنے کی غلطی نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی ایک ہتھیار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دبے پسے لٹے پٹے لوگوں کو بتایا جائے کہ لوٹ کھسوٹ کیوں ہوتی ہے اور اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے"[7]

ظاہر ہے برعظیم سے غربت، بھوک، لوٹ کھسوٹ اور ہر طرح کے استحصال کو اسی صورت میں ختم کیا جا سکتا تھا جب برطانوی سامراج سے چھٹکارا پا لیا جائے۔ بادی النظر میں آزادی کا حصول اس تحریک کا لازمی عنصر تھا۔ چنانچہ انجمن ترقی پسند

---

۱ جعفری، سردار: ترقی پسند ادب، ص ۲۸۳
۲ ظہیر، سجاد: روشنائی، ص ۱۲۵
۳ جعفری، سردار: ایضاً، ص ۱۸۱
۴ عبدالغفار قاضی: ترقی پسند ادب مطبوعہ افکار، کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۷۰ء، ص ۵۳۹
۵ ایضاً
۶ ایضاً
۷ منقول سنیارتھی، دیوندر ناتھ، اختر حسین رائے پوری، مطبوعہ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر ۲، ص ۱۰۶۵

مصنفین نے غیر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کو ترقی کا پہلا زینہ قرار دیا تھا۔[1] یہی وجہ ہے کہ حصول آزادی کے سلسلے میں ترقی پسند شعرا نے نڈر ہوکر جرأت وعزم کے ساتھ اور روانشگاف انداز میں اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری میں "سیاسی قوت، اعتماد کی روشنی، لہو کی حرارت"[2] اور حکومت برطانیہ سے بغاوت و سرکشی کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر آزادی کے نغمے گانے والے شعرا محض روایاتی انداز کے پیرو نہیں —— ان کا مسلک حیات، ان کا نقطۂ نظر، ان کا دائرۂ عمل، سب کا مرکز ایک تھا، یعنی فرنگی استبداد کا خاتمہ! گویا سیاست ہی ان کی شاعری کا محور تھا اور وہ اس سے انقلاب کی رفتار کو تیز تر کردینا چاہتے تھے۔ جنگ آزادی کی شاعری میں ان ترقی پسند شاعروں کو جن اسباب وعوامل کی بنا پر قدر ومنزلت حاصل ہوئی ہے، اس کا اندازہ سید احتشام حسین کی درج ذیل تحریر سے بخوبی ہوجاتا ہے:-

> "سب کے سب انقلاب کی رفتار سے واقف ہیں۔ انہیں تاریخی طور پر سماج کے تضاد اور ہیجان کا حال معلوم ہے۔ انہوں نے دنیا میں انقلابات کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ انہیں زندگی کے وہ موڑ معلوم ہیں جہاں انسانیت کروٹ بدلتی ہے۔ ان کی تیز نگاہیں ملکوں ملکوں میں آزادی کی جدوجہد، لڑنے اور فتح پانے کے اصولوں کو دیکھ رہی ہیں۔ ان میں سے کئی تو خود ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپاہی ہیں"[3]

آئیے جنگ آزادی کے ان سپاہی نما شاعروں سے ہم متعارف ہوجائیں جو بقول مجنوں گورکھپوری "خالص رزمیہ مزاج کے مالک ہیں اور ان کا لہجہ عسکری انداز لئے ہوتا ہے"[4] جنہوں نے اپنے پرجوش و ولولہ انگیز نغموں سے عوام کو اکسایا ہے

---

1. حسین، پروفیسر ممتاز: متحدہ محاذ، مطبوعہ سویرا، لاہور، شمارہ ۱-۲، ص ۱۴۸
2. اعظمی، انجم: اردو نظم کے پچیس سال، مطبوعہ افکار، کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۱۶
3. حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۲۰۲
4. گورکھپوری، مجنوں: پچیس سال کی چند اہم شخصیتیں، مطبوعہ افکار، ایضاً، ص ۶۹

تاکہ وہ جد و جہد آزادی میں شریک ہو کر نئے نظام کے طلوع ہونے کی سبیل نکالیں۔

اسرار الحق مجاز مطرب بزم دلبراں[1] کی حیثیت سے ابھرے تھے۔ حسن و عشق کے رازہائے سربستہ کا انکشاف شیریں و دل نشیں انداز میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کرنا ان کا وطیرہ رہا ہے[2]۔ وہ بحیثیت مجموعی "اپنی شاعری کی روحانی فضا میں ہی بستے رہے ہیں"[3] انہوں نے اپنی نظم "تعارف" میں خود ہی اس امر کا اعتراف کیا ہے ؎

عشق ہی عشق ہے دنیا میری — فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

لیکن وہ اسی "رومان سے انقلاب کی طرف آئے"[4] تھے اور مذکورہ نظم کا آخری شعر اس حقیقت کا ضامن ہے ؎

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں — ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد کی سیاسی تگ و دو نے مجاز کو خاص طور سے متاثر کیا تھا[5]۔ شہر نگاراں کا شاعر ہونے کے باوجود حصول آزادی کے لئے ان کے دل میں تڑپ تھی۔ برطانیہ کے قائم کردہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کا بے پناہ جذبہ ان کے سینے میں موجزن تھا۔ وہ وقت کی آواز سن رہے تھے اور "سرشار نگاہ نرگس" ہونے کے باوجود لپکتے ہوئے شعلے اور چلتی ہوئی تلوار بن کر میدان کارزار میں کود گئے تھے اور ان کے لبوں پر یہ رجز تھا ؎

مسافر بھاگ وقت بے کسی ہے — ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں ہیں سونے کے توڑے — یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے

۱؎ میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں — شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں
۲؎ سندیلوی، ڈاکٹر شجاعت علی: مجاز، مطبوعہ کلام مجاز، ص ۳
۳؎ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث: مجاز، مطبوعہ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر ۲، ص ۹۱۷
۴؎ حسین، سید احتشام: مجاز، فکر و فن کے چند پہلو، مطبوعہ افکار، کراچی جوبلی نمبر ۱۹۷۰ء، ص ۵۶۴
۵؎ ایضاً، ص ۵۶۳

یہ عالم ہوگیا ہے مفلسی کا — کہ رسم میزبانی اٹھ گئی ہے

نہ دے ظالم فریب چارہ سازی — یہ بستی تجھ سے اب تنگ آچکی ہے

اس مقالے کے دوسرے باب میں ہم نہایت تفصیل سے اس امر کا جائزہ لے چکے ہیں کہ برعظیم میں فرنگیوں کی آمد دراصل سمندری راستے سے ہی ہوئی تھی[1] اور اب ساڑھے تین سو سال بعد مجاز انہیں اسی قدیم راستے سے واپس چلے جانے کا حکم دے رہے تھے۔

مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے — وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

مجاز کی آواز اس زخمی شیر کی مانند تھی جو صدیوں ظلم و استبداد کا نشانہ بنتا رہا تھا، جسے پابند طوق و سلاسل رکھا گیا تھا اور جس کی عظمت و انانیت کو مسلسل کچلا جاتا رہا تھا۔ لیکن اب ـــ بیداری شعور کے بعد اس میں گھن گرج پیدا ہوگئی تھی، دشمنوں کو دعوتِ رزم دینے کا حوصلہ جوان ہوگیا تھا۔ اب وہ توپ و تفنگ سے ہراساں نہیں تھا، بلکہ نہایت اور بے باک ہوکر شکاریوں کو یوں دھمکی دے رہا تھا۔

یہاں ہر شاخ شمشیر برہنہ — گلوں سے خون کی بو آرہی ہے

یہاں کے آسمانِ آتشیں پر — بغاوت کی گھٹا منڈلا رہی ہے

یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہے — یہاں سے ایک آندھی اٹھ رہی ہے

فرنگیوں کے خلاف برعظیم میں چلنے والا یہی طوفان اور اٹھنے والی یہی آندھی تھی جس نے مجاز کو یہ کہنے پر مجبور کردیا۔

بزم ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ

ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ

پھینک دے اے دوست اب پھینک دے اپنا رباب

اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں اب شورِ انقلاب

صدیوں کی سوئی ہوئی قوم میں جب مجاز بیداری کی کوئی علامت نہیں پاتے تو جھنجھلا کر کہہ اٹھتے ہیں۔

---

[1] ص ۱۵۸ دیکھیں

کون بتائے عظمتِ خاکِ وطن کہاں ہے اب
کون بتائے غیرتِ اہلِ وطن کو کیا ہوا
کوہ و دمن وہی دشت وہی چمن وہی
پھر یہ مجاز جذبۂ حبِ وطن کو کیا ہوا

اور کبھی وہ ظلم و جور، لوٹ کھسوٹ اور مفلسی و ناداری کے مناظر دیکھ کر اپنی بے بسی کا اس طرح اظہار کرتے ہیں ؎

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مگر وہ سنبھل جاتے ہیں۔ وطن کے لئے کچھ کر گزرنے کا حوصلہ اپنے مغموم و وحشت زدہ دل میں پیدا کرتے ہیں۔ اور پھر اپنے آہنی عزم کا اظہار کرتے ہوئے منزل مقصود کی جانب رواں دواں رہتے ہیں ؎

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گذشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

تلاطم خیز دریا آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظالم جنگ کے پر ہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

مجاز نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نشو و نما علیگڈھ کے خاص ماحول

میں ہوئی تھی اور وہاں کے نوجوان شاعروں میں ان سے زیادہ کوئی مقبول نہ تھا[1]۔ یہی وہ رشتہ تھا جس نے اپنی اس طبقے کو بیداری کا پیام دیا اور اسے جنگ آزادی میں شریک کرنا چاہا ؎

اے جوانانِ وطن روح جواں ہے تو اٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوفِ بے حرمتی و مکرِ زیاں ہے تو اٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو

اٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر

اُس طرف ہاتھ میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں
اِس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں
ظلم پر ظلم ہیں تعزیروں پہ تعزیریں ہیں
سر پہ تلوار ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

ایک ہو ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی
عرصۂ زیست کا ہنگامۂ اکبر ہے یہی

مجاز جوانانِ وطن کو دشمنوں سے صف آرا ہونے پر آمادہ بھی کرتے ہیں اور اپنی خون پیتے ہوئے اغیار کو خون میں بہا دینے کی جرأت اور حوصلہ مندی بھی عطا کرتے ہیں۔ ان کا رجزیہ انداز جنگِ آزادی کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ظفر علی خاں اور جوش کی طرح مجاز کے یہاں بھی بڑا جوش و خروش، بڑا ولولہ اور بڑی جرأت و بے باکی پائی جاتی ہے۔ دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنے کا فریضہ ایک سپاہی ہی انجام دے سکتا ہے۔ مجاز یہی فریضہ نوجواں طبقے کو سونپ رہے ہیں ؎

اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
شعلہ افشاں و شرربار چلے آتے ہیں

---

[1] صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث: مجاز، مطبوعہ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر ۲، ص ۹۱۵-۹۱۶

خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم جو اٹھ جاؤ تو بیکار چلے آتے ہیں

خون جو یہ نکلا ہے اس خوں میں بہادو ان کو
ان کی کھودی ہوئی خندق میں گرادو ان کو

یہ ہیں فتنۂ بیدار دبادو ان کو
یہ مٹادیں گے تمدن کو مٹادو ان کو
پھونک دو انکو جھلس دو کہ جلادو انکو
شانِ شایانِ وطن ہو یہ بتادو انکو

یاد ہے تم کو کن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو

مجاز کو اہلِ وطن کے عزمِ راسخ پر کامل یقین تھا، ان کے جذبۂ حریت پر بھرپور اعتماد تھا اور ان کی جد وجہد پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان عناصر کی موجودگی میں سرمایہ دارانہ نظام دم توڑ دے گا، محکومی و غلامی کے اسیر طوق و سلاسل توڑ کر زنداں سے باہر نکل آئیں گے اور آزادی کا آفتاب بصد آب و تاب طلوع ہو کر رہے گا۔ دیکھئے مجاز مستقبل کی خبر کچھ اس طرح سنا رہے ہیں ؎

توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
سرخ ہونگے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہونگے آتشیں ملبوس میں منظر تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگِ شفق
اور اس رنگِ شفق میں با ہزاراں آفتاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

اب آئیے علی سردار جعفری کی طرف جو ابتدائے شعور سے ترقی پسند ادب سے وابستہ رہے ہیں[1] وہ انقلاب اور تغیر کے نقیب ہیں[2]، اسی لئے برِ عظیم کی غلامانہ زندگی اور سامراجی نظام کے خاتمے کے لئے "ایک خونیں انقلاب کی تمنا"[3] کرتے ہیں۔ برطانوی استبداد کے خلاف محاذ آرائی کے لئے انہوں نے جو مضبوط مورچہ باندھا ہے، وہ انکی عملی زندگی کا مظہر ہے۔ ان کے یہاں سیاست صرف افکار و خیالات کے دائرے میں محدود نہیں، بلکہ وہ ان کے کردار و اطوار سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی نظم "بغاوت" اس امر کا برملا اظہار کر رہی ہے کہ "جس طرح وہ سوچتے ہیں، اسی طرح زندگی بسر کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں"[4] مندرجۂ ذیل چند اشعار سے ان کی عملی زندگی اور سیاسی کردار کا پتہ چل جائے گا ؎

کھلایا ہے مجھے گودوں میں جرأت نے حمیت نے
سلایا لوریاں دے کر مجھے عصمت نے عزت نے
مری افسردہ نظروں میں نہاں دنیا کی قیمت ہے
مری چینِ جبیں پر نقش تاریخ حقیقت ہے
مرے زخموں میں حدت زندگی کے آفتابوں کی
مری ٹھوکر میں پنہاں داستانیں انقلابوں کی
سکوں کو لا کے ہنگاموں کے پہلو میں سلاتا ہوں
نوائے تلخ سے میں سارے عالم کو جگاتا ہوں
حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے

نوجوانی کے گرم اور پر جوش لہو کے ساتھ اور بغاوت کا مسلک لے کر جب سردار جعفری میدان سیاست میں اترتے ہیں تو اپنے مخصوص نظریۂ حیات کا اعلان بھی

---

[1] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۳۶۹
[2] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۲۰۲
[3] بریلوی، ڈاکٹر عبادت: تنقیدی زاویے، ص ۳۲۴
[4] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: ایضاً، ص ۳۶۹

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا

بغاوت میرا پیغمبر بغاوت ہے خدا میرا

بغاوت رسم چنگیزی سے تہذیب تتاری سے

بغاوت جبر و استبداد سے سرمایہ داری سے

بغاوت دور حاضر کی حکومت سے ریاست سے

بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے

بغاوت و انقلاب کے اسی رجحان نے سردار جعفری میں وہ دم خم، وہ جرأت و بے باکی اور وہ جوش و خروش پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنی طویل اور یادگار نظم "نئی دنیا کو سلام" میں فرنگی حکام کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہیں[1]، انہیں فرعون، قاتل اور پاپی کہہ کر پکارتے ہیں اور انہیں جہازوں کے لنگر اٹھا کر برعظیم سے فوراً چلے جانے کے احکامات صادر کرتے ہیں۔ سردار کے "مسٹ حکم" میں مجاز سے زیادہ سختی، زیادہ درشتی اور زیادہ طنطنہ پایا جاتا ہے۔ باوجودیکہ یہ نظم قافیے کی پابندی سے بے نیاز اور جدید اسلوب و ہیئت پر مشتمل ہے لیکن آہنگ و ترنم، وفور جذبات اور اظہار خیال کی شدت نے اس میں غضب کا جوش و خروش پیدا کر دیا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں جو درج بالا دعوے کی خود ہی دلیل ہیں ؎

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو

عصر حاضر کے فرعون ہو

تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی

ایک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خون ہے

تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے

ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں ہے

---

[1] فن حرب کی یہ پہلی خصوصیت ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اکرم، جنرل آغا ابراہیم: The Sword of Allah نیز The Muslim Conquest of Persia

ایک بھی ذرہ اس ملک میں اب تمہارا نہیں ہے

بھاگو بھاگو

اپنا جسم اپنی جان اپنا من اپنا اخلاق و تہذیب و قانون سب لے کے بھاگو

اس زمیں کے دہکتے ہوئے سینے سے سلطنت کی پرانی بساط اب اٹھالو

زندگی تم سے تنگ آچکی ہے

ساری دنیا اب اکتا چکی ہے

موت کے بادبان کھول دو اور اپنے جہازوں کے لنگر اٹھاؤ

جاؤ جاؤ

ناظرین! آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ آزاد رزمیہ نظم پابند رزمیہ نظموں سے کیف و اثر میں کسی طور بھی کم نہیں۔

حکومت برطانیہ کو نیست و نابود کر دینے کے لئے سردار جعفری تنہا آگے نہیں بڑھتے وہ اپنے ساتھ اہل وطن کو بھی لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں انقلاب کا پیام سنا کر غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کا حوصلہ بخشتے ہیں ؎

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو	اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
اٹھو کھل گیا پرچم انقلاب	دمکتا ہے جس طرح سے آفتاب
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو	زمانے کی رفتار کو موڑ دو

اور جب ملک میں انقلابی فضا پیدا ہو جاتی ہے' ہر فرد حصول آزادی کے لئے سر سے کفن باندھ کر نکل کھڑا ہوتا ہے اور غیر ملکی استعماریت کے خلاف محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے تو سردار جعفری کی تمنائے انقلاب پوری ہونے لگتی ہے۔ وہ تحریک آزادی کے اس کامیاب دور کی ترجمانی یوں کرتے ہیں ؎

دیدنی اہل شہر کا ہے شکوہ	گولیاں رو کتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرہ نگہ میں عزم جہاد	حریت ضوفگن جبینوں پر

جل اٹھے غلاموں کے سینے کے داغ	بجھ گئے ہیں گل ہو رہے ہیں چراغ
گرے قصر شاہی بہ تخت و تاج	نئی کروٹیں لے رہا ہے سماج

بادباں کھل گئے بغاوت کے	بمبئی کے جہازیوں کو سلام

حصولِ آزادی کے لئے مجاہدینِ وطن کا قافلہ جس طرح رواں تھا، صدیوں کی غلامی سے نجات پانے کا جذبہ ان کے دلوں میں جس طرح امنڈ رہا تھا، ان کی تاریک روحوں کے چراغ جس طرح فروزاں ہو چکے تھے۔ یہ سب بجھتے آفتاب و ماہتاب کی آمد آمد کا پیش خیمہ تھا۔ سردار جعفری اسی منظر کی طرف اشارہ کر رہے تھے ؎

افق سے آج نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغِ وقت کی رنگین لو بڑھائے ہوئے
نباوتوں کی سپہ انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں فلک پر نظر جمائے ہوئے
غرورِ فتح کے پرچم ہوا میں لہراتے
ثبات و عزم کے اونچے علم اٹھائے ہوئے
ہتھیلیوں پہ لئے آفتاب اور مہتاب
بغل میں کرۂ ارضِ حسیں دبائے ہوئے

اور کون نہیں جانتا کہ اپنی آفتاب و ماہتاب سے آزادی کی شعاعیں پھوٹنے والی تھیں اور غرورِ فتح کا یہی پرچم آزاد مملکت کا مظہر بننے والا تھا۔[1]

مخدوم محی الدین بھی سردار جعفری کی طرح رزمیہ مزاج اور عسکری لہجے کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع بھی انقلاب ہے اور وہ سید احتشام حسین کے بقول "انقلاب کا راگ گاتے نہیں تھکتے"[2]۔ ایسے وقت اور ماحول میں جب پورے ملک میں جب آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی، جب پوری قوم فرنگی حکام سے معرکہ آرا تھی اور جب سماجی استعماریت نے ظلم و ستم کے پنجے کو اور بھی سخت کر لیا تھا، مخدوم ایک خاموش تماشائی بن کر ارضِ حسیں کو جھلستا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ وطن کے تحفظ و سلامتی کے لئے تلوار اٹھا لینے کے آرزو مند تھے ؎

---

[1] گورکھپوری، مجنوں: پچیس سال کی چند اہم شخصیتیں، مطبوعہ افکار کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۷۰ء، ص ۶۹

[2] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۲۰۲

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی ہوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں
کیا مجاہد نہ ہوں
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر

اور جب مخدوم وطن کی حرمت و عزت کی خاطر تلوار اٹھا لیتے ہیں تو پھر ان کا عمل ایک محافظ کا عمل بن جاتا ہے ان کا کردار ایک جاں فروش کے کردار میں ڈھل جاتا ہے اور ان کا احساس فرض ایک محب وطن کے احساس فرض کی نمائندگی کرنے لگتا ہے۔ اب وہ محض خاموش تماشائی بنے نہیں رہتے بلکہ راست اقدام کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کا عزم بے پناہ ملاحظہ ہو ؎

سر پر نخوتِ ارباب زماں توڑوں گا
شور نالہ سے در ارض و سماں توڑوں گا
ظلم پرور روشِ اہل جہاں توڑوں گا
عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا
توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے
ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم

مخدوم خونیں انقلاب بپا کرنے کے ساتھ ساتھ میدانِ کارزار میں رجز بھی پڑھتے جاتے ہیں جس میں حصولِ آزادی کا جوش و خروش ہے، محکومی و مجبوری کے خلاف نفرت کا اظہار ہے اور آگے بڑھ کر دشمنوں سے برد آزما ہونے کا جذبہ ہے ملاحظہ ہو ان کی ایک رجزیہ نظم کے چند اشعار جس کی بنا پر ان کا مجموعۂ کلام "سرخ سویرا" ضبط ہوا تھا۔[1]

---

[1] صدیقی پروفیسر فصیح الدین: جنگ آزادی اور مسلمان شعرا مطبوعہ علم و آگہی قائد اعظم نمبر، کراچی، ۱۹۷۶-۷۷ء، ص ۲۱

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی | آزادی کے پرچم تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی | محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی | دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی | آزادی کے پرچم تلے

مخدوم کے یہاں صرف جنگ کی گھن گرج اور رن کا شور ہی نہیں ابھرتا ہے، غلامی کے خاتمے کی خبر بھی ملتی ہے اور آزادی کے خورشید درخشاں کے طلوع ہونے کا مژدہ بھی سنائی دیتا ہے۔ وہ بڑے یقین کے ساتھ نئے دور کی آمد کا پتہ دیتے ہیں ؎

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

لو سرخ سویرا آتا ہے | آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانا گاتا ہے | آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے | آزادی کا آزادی کا

اور اب درج ذیل بند ملاحظہ ہو جس میں مخدوم یقین کی جن حدوں کو چھو رہے ہیں اس سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک تجربہ کار مجاہد کی حیثیت سے دشمنوں کی صفوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھ رہے ہیں، ان میں شکست و ریخت کے آثار انہیں نظر آرہے ہیں اور وہ طنز و حقارت کے لہجے میں پسپا ہو کر جانے والے سپاہیوں سے ان کی "نئی منزل" معلوم کر رہے ہیں ــــ وہ سپاہی جو صدیوں اس سرزمین پر حکمراں کر تے رہے۔ مخدوم کا تیور، جو سب میں منفرد ہے، قابلِ غور ہے ؎

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا | ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے | کھل گیا انقلاب پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

مخدوم کی شاعری میں جو للکار ہے، جو گھن گرج ہے، جو عزم اور جذبہ ہے، ان سب عناصر نے اسے بڑی تاب و توانائی عطا کی ہے۔ یہی تاب و توانائی ظلم و جور کے اندھیروں

میں مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتی رہی ہے اور دشمنوں سے معرکہ آرا ہونے اور آزادی کی خونیں جنگ لڑنے کے لئے حرارت بخشتی رہی ہے۔

ساحر لدھیانوی ایک رومان پرست شاعر کی حیثیت سے ابھرے ہیں لیکن ان کی عشقیہ شاعری کا تانا بانا سیاسی ماحول ہی میں بُنا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر، ان کے خیال، ان کے تصور پر غلامانہ زندگی کا کرب، محکوم و مظلوم افراد کی بے بسی اور معاشرے کے بگڑے ہوئے اقتصادی نظام کے اثرات پوری طرح منعکس ہیں۔ وہ ایک حساس شاعر کے رشتے سے ہی ارد گرد کے ماحول سے قریب نہیں ہیں؛ ان کی عملی زندگی کو بھی اس میں خاصا دخل ہے۔ کالج میں طلبا کی تنظیم سے ان کی جو عملی وابستگی تھی[1]، اس نے انہیں نوجوانی ہی میں سیاست سے قریب کر دیا تھا۔ اور یہی وہ قربت ہے جس نے ساحر لدھیانوی کو بیرونی استبداد کے مقابلے پر آمادہ کیا ہے اور وہ عشقیہ نغموں کے ساتھ ساتھ "سرکش ترانے" لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ مجبوری محض اس دور کی مروجہ روایت کی تقلید پر مبنی نہیں، اس میں ساحر کا اپنا سیاسی شعور کارفرما ہے، ان کا اپنا مشاہدہ سرگرم عمل ہے اور ان کا اپنا کرب والم نمایاں ہے ؎

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

ساحر نے اپنے سرکش ترانوں کی تخلیق کا جو جواز پیش کیا ہے، وہ غلامانہ دور کی مکمل تصویر ہے۔ ایسی تصویر جس میں مفلسی و قلاشی، بے کسی و بے بسی، ظلم و تشدد اور غارت گری و تاراجی کے جملہ رنگ نمایاں ہیں۔ آیئے اس جیتی جاگتی تصویر کو ہم بھی دیکھ لیں ؎

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مفلسوں کو، بے کسوں کو، بے سہاروں کو

۱؎ اعظمی، کیفی: ساحر اور اس کی شاعری، مرتبہ پرکاش پنڈت، ص ۱۲
۲؎ پانی پتی، شیخ محمد اسمٰعیل: شعرائے متغزلین، مطبوعہ نقوش، لاہور، غزل نمبر، ص ۷۰۹

مسکتی نازنینوں کو، تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو، امارت کے تکبر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو

تو دل تاب نشاط بزم عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

ساحر کے بیدار شعور نے برعظیم میں غربت و افلاس کی ماری ہوئی غلام قوم کا حرمت حال زبوں ہی نہیں دیکھا تھا، سیاسی ماحول کے تباہ کن اثرات کو بھی محسوس کیا تھا، برطانوی حکومت کے قانون اور ضابطے کے شکنجے کی آہنی گرفت کا مشاہدہ بھی کیا تھا، غلامانہ زندگی کی ذلت و رسوائی کا جائزہ بھی لیا تھا۔ اسی احساس، اسی مشاہدے اور اسی جائزے نے یوں اشعار کا روپ دھارا ہے ؎

یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دور مجبوری
ہمیں سے رنگ گلستاں ہمیں سے رنگ بہار
ہمیں کو رنگ گلستاں پہ اختیار نہیں
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی امنگوں کا خروش
دھنک کے رنگ نہیں ـــ سرمئی فضاؤں میں
افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں
دلوں پہ خوف کے پہرے لبوں پر قفل سکوت
سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

ظلم و تشدد کا ماحول دیکھ کر ساحر بے چین ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس بات پر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ لاکھوں کروڑوں افراد مٹھی بھر فرنگی حکام کے شکنجے میں ڈیڑھ سو سال سے جکڑے ہوئے اور ظلم کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ ان کے دل میں یہ تمنا جاگ اٹھتی ہے کہ کاش یہ لوگ اپنے آقاؤں کے خلاف صف آرا ہوتے اور خود ان ہی سے خراج وصول لیتے ؎

کاش یہ بے حس و بے وقعت و بیدل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے پابند سلاسل کتے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراج توت
کاش یہ اپنے لئے صف آرا ہوتے
اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا ہوتے

ساحر صرف اپنی دلی تمنا کے اظہار پر ہی اکتفا نہیں کرتے، وہ برطانیہ کی دبی ہوئی اپنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مخلوق کو جہد و عمل کا یہ پیغام بھی دیتے ہیں ؎

یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی
آج موقع ہے، ٹوٹ سکتی ہیں
فرصت یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق!

ساحر کے دیکھتے ہی دیکھتے ڈیڑھ سو سال کی پابند سلاسل مخلوق جب غیر ملکی آقاؤں کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ترانوں میں اس جدوجہد کی بھرپور ترجمانی کرنے لگتے ہیں ؎

بغاوتوں کے دہل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جواں مشعلیں جلائے ہوئے

سالہا سال کے بے چین شراروں کا خروش
اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزم آزادیٔ انساں بہ ہزاروں جبروت
اک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے

مشعل بردار جوانوں کے اس قافلے میں ساحر بھی ایک باعمل شاعر کی حیثیت سے شریک ہو جاتے ہیں اور ان کا یہ رجز فضاؤں میں گونجنے لگتا ہے ؎

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دوں گا
جیون کے اندھیارے پتھ پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا
آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

اقوام عالم کے باہمی پیکار سے جو نتیجہ برآمد ہو رہا تھا ساحر اس سے مطمئن تھے۔ انہیں امید تھی کہ اس جنگ میں اہل وطن غلامی کی زنجیریں توڑ دیں گے اور حکمراں طبقے کو اپنی ظالمانہ سیاست پر بالآخر پشیماں ہونا پڑے گا۔

برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر
اپنے ناکام ارادوں کا کفن پہنائیں

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھے گا دل گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا

اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر
اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل
ختم ہو جائے گی انساں کے لہو کی تقطیر

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسہ نہ کرے
کہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں

ساحر لدھیانوی نے غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے اور نئی صبح کے طلوع ہونے کے جو خواب دیکھے تھے، اس کی تعبیر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہی ملنے لگی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں حصولِ آزادی کے لئے سرگرم عمل تو تھیں ہی، ترقی پسند مصنفین کا گروہ بھی ظالم سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ان سبھوں کی سعی و کاوش سے جو خوشگوار نتیجہ سامنے آ رہا تھا، اس کی جھلک ساحر کے حسب ذیل اشعار میں پائی جاتی ہے۔ انہیں پڑھ کر ہم یہ محسوس کریں گے کہ انہوں نے جو لب و لہجہ، جو انداز بیان اور جو فکر استعمال کی ہے — یہ سارے عناصر جوش کی "شکست زنداں" سے بے حد مماثلت رکھتے ہیں ؎

جاگ گے ہیں افلاس کے مارے، اٹھے ہیں بے بس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے
چوک چوک پر گلی گلی میں سرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت امڈے آتے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے
راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیل بے پایاں نہ رکے گا
کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دل جباروں کے
بھاگ رہے ہیں ظل الٰہی، منہ اترے ہیں غداروں کے

ساحر نے اپنے ولولہ انگیز اور پرجوش ترانوں کے ذریعے برعظیم میں نمایاں ہونے والی بیداری اور حصول آزادی کے جذبے کو جس حسن و خوبی سے پیش کیا ہے، اس سے انہیں حریت پسند شاعروں کی صف اولین میں جگہ ملی ہے۔

فیض احمد فیض ترقی پسند نظریے کے نہ صرف حامل رہے ہیں بلکہ ان کی "ذاتی دلچسپی اور عملی مساعی سے پنجاب میں انجمن ترقی پسند مصنفین بہت جلد ایک عوامی ادبی تحریک کی صورت میں پھیل گئی"[1] لیکن اس دبستان کے

---

[1] لکھنوی، صہبا: فیض احمد فیض، مطبوعہ افکار، فیض نمبر، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۶

ایک ممتاز رکن ہونے کے باوجود وہ جب جنگ آزادی میں شریک ہوتے ہیں تو مجاز مخدوم سردار اور ساحر کی طرح ان کے یہاں جھنجھلاہٹ، غصہ، گھن گرج، چیخ پکار اور ہنگامی کے آثار نمایاں نہیں ہوتے، بلکہ وہ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "انتہا پسندی سے گریز کرکے ہر چیز کو اعتدال میں سمو دینے کے عادی"[۱] معلوم ہوتے ہیں۔ فیض نے بھی غلامانہ دور کی تصویر کشی کی ہے، مظلوم و محکوم قوم کی دردناک زندگی کے رخ کو پیش کیا ہے، ظالم و جابر آقاؤں کے طرزِ عمل پر شدید حملے کئے ہیں ــــ لیکن ان کا وصف یہ ہے کہ تلخ و ترش واقعات کی شدت شعر کے لطیف پردوں میں اس طرح اجاگر ہوئی ہے کہ "شعریت و سیاست دونوں ایک دوسرے میں بالکل شیر و شکر ہوگئے ہیں"۔[۲]

مجاز و ساحر کی طرح فیض بھی رومان کے راستے ہی سے انقلاب کی طرف آئے ہیں۔ وہ محبوب کے تجدید محبت کے سوال پر اپنے انقلابی نظریے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ماحول کا کربناک منظر بولتا ہوا دکھائی دیتا ہے ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

ماحول و معاشرے کے دکھ بھرے منظر کی طرف جب فیض کی نظر لوٹتی ہے تو وہ

---

[۱] جالبی، جمیل: فیض ایک تقابلی مطالعہ مطبوعہ افکار کراچی، فیض نمبر ۱۹۶۵ء ص ۲۷۵
[۲] ایضاً، ص ۲۷۸

طوق و سلاسل میں جکڑی ہوئی قوم کو، اس کی غربت و ناداری کو، اس کی حرماں نصیبی و بدبختی کو، اس کی ذلت و رسوائی کو اور اس کے فرنگی آقاؤں کی سیاسی حکمت عملی اور ظلم و جور کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ ان کے مزاج کا دھیما پن، ان کی طبیعت کی شائستگی اور ان کا ذوق کم گوئی[1] انہیں اپنے زمانے کے دوسرے شاعروں کی طرح جوش و خروش کا اظہار کرنے، فلک شگاف نعرے لگانے اور طیش میں آجانے پر نہیں اکساتا، بلکہ وہ نہایت سنجیدگی، ذہنی ٹھہراؤ اور اعتدال پسندی کے ساتھ جو کچھ کہتے ہیں، قاری کے دل پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فیض کی شاعری نے عوامی شعور کو بیدار کرنے میں جو کام کیا ہے، وہ ان کے ہم عصر شعرا کے کارناموں سے کسی طرح کم نہیں۔ آئیے اس شاعر رنگیں نوا[2] کے چند ایسے اشعار پر نظر ڈالی جائے جن میں فرنگیوں کے زیر سایہ پلنے والی غلام قوم کا صحیح نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے

یہ ہر اک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوق گدائی

---

[1] ظہیر سجاد: شخص و عکس، مطبوعہ افکار، کراچی، فیض نمبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۶۴
[2] اسلم ثاقب: شاعر رنگیں نوا، مطبوعہ ایضاً، ص ۲۸۷

زمانہ کی پھٹکار سرمایہ ان کا

جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے

غلاظت میں گھر نالیوں میں بسیرے

فیض کی شاعری کا محور بقول ممتاز حسین "سیاسی دکھ ہے نہ کہ سیاسی استحکام"[۱]
اپنے دبستان کے دیگر شعرا کی طرح اغیار سے براہ راست صف آرا ہونے کا جذبہ بھی
ان کے یہاں ناپید ہے' پھر بھی غلامانہ دور کو بدلنے کا دبا دبا سا احساس ضرور کروٹیں
لیتا ہے۔ وہ اپنی نظم "کتے" میں اس احساس کو یوں اجاگر کرتے ہیں ۔

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے — تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں — یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلائے — کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلائے

اگرچہ فیض اپنی افتادِ طبع کی بنا پر خود تیر و تبر لے کر میدان جنگ میں نہیں آتے
لیکن انہوں نے سجاد ظہیر کے بقول "وطن کی آزادی کے مجاہدوں سے کہا تھا کہ جبر و
تشدد کے اس دور کو صرف شجاعانہ مقاومت سے ہی ختم کیا جا سکتا ہے"[۲] ان کے
کلام میں اس نوع کا پیغام ضرور ملتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظم "بول" قابل ذکر
ہے ۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

بول' زباں اب تک تیری ہے

دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں

تند ہیں شعلے سرخ ہیں آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے

پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

---

[۱] حسین' ممتاز: دل پرخوں کا ہنر تو دیکھو' مطبوعہ افکار' کراچی' فیض نمبر ۱۹۶۵ء' ص ۳۲۰
[۲] ظہیر' سجاد: شخص و عکس' مطبوعہ ایضاً' ص ۱۶۹

بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے

مظلوم و محکوم اہلِ وطن کو جسم و زباں کی موت سے پہلے سرکشی و بغاوت پر آمادہ کرنے والے فیض نے انہیں اس امر کا یقین بھی دلایا ہے کہ ظلم و ستم کا یہ سلسلہ اب ٹوٹنے ہی والا ہے، اجنبی ہاتھوں کا تشدد ختم ہونے کو ہے اور زیادہ و فغاں کے دن تھوڑے ہیں ـــ مغموم و مضمحل دلوں کو سمجھانے کا یہ نفسیاتی طریقہ کلامِ فیض کا خاص وصف ہے جسے جنگِ آزادی کی شاعری میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس نوع کے اشعار درج ذیل ہیں ؎

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

مجاہدوں کو "اک ذرا صبر" کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ فیض نے یقین و اعتماد کے لہجے میں نئی صبح کے طلوع ہونے کا مژدہ بھی سنایا ہے ؎

اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر

ناظرین! جنگ آزادی کے سلسلے میں فیض کی شاعری کے متعلق ہم انہی کے مکتبۂ خیال کے نقاد پروفیسر ممتاز حسین کی حسب ذیل رائے پیش کرنا چاہیں گے، جو صرف فیض ہی کے موضوعِ سخن کو نہیں، بائیں بازو کی تحریک کے مقصد اولین کو بھی دائرۂ نور میں لے آتی ہے:

"فیض نے اس اشتراکی انسان دوستی کے درد کو اپنایا ہے جو وطن کی آزادی کو اس کے حصول کا ایک لازمی ذریعہ تصور کرتی ہے۔"[1]

اور فیض کی شاعری کا محور یہی لازمی ذریعہ ہے۔

معین احسن جذبی ابتدا میں برعظیم پاک و ہند کی روح میں بسی ہوئی یاس پسند فضا کے ترجمان تھے[2] اور خارجی ماحول کی زبوں حالی پر اظہار جذبات کے لئے کبھی اشکوں اور آہوں کا سہارا لیتے اور کبھی غلامی کا پاپ کٹنے کی تمنا کرتے ؎

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارہ کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارہ کرتے ہیں
کیا جانئے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانے کب وہ دن آئے
جب دن کے لئے اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

یہ رکے رکے سے آنسو، یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یوں ہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

لیکن رکے رکے سے آنسو اور گھٹی گھٹی سی آہوں کی ترجمانی کا یہ سلسلہ نادیر قائم

---

[1] حسین، ممتاز: دل پرخوں کا ہنر تو دیکھو، مطبوعہ ادوکار، کراچی، فیض نمبر ۱۹۶۵ء ص ۳۱۶

[2] حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۲۰۱

نہیں رہتا۔ جذبی اس پاپ کے کٹنے کے لئے جنگ کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنی نظم "دعوتِ جنگ" میں مجاہدِ وطن کو خوں فشاں تلوار کھینچ لینے پر آمادہ کرتے ہیں ؎

وہ ہوئی لغزش ہوا میں وہ بگل بجنے لگا
جنگ کے نغموں سے وہ تھرائی دنیا کی فضا
دل دھڑکتا ہے فضا پر آج اسرافیل کا
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

کہیں وہ محکوم و مظلوم اور پابند سلاسل قوم کو جہد و عمل کا درس بھی دیتے ہیں لیکن بہ اندازِ دگر ؎

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

اس حقیقت کے باوجود کہ جذبی "احساسِ ناکامی کے شاعر کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکے"[1]، ان کے کلام میں ظلم و استبداد کے خلاف بغاوت کی دبی دبی سی لہر ضرور پوشیدہ ہے۔

جذبی کے برعکس، جاں نثار اختر نے جنگِ آزادی میں کھل کر حصہ لیا ہے۔ وہ اس ضمن میں جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں، صاف و صریح انداز میں کہتے ہیں اور ابہام سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ وہ جب اہلِ وطن کو غلامی کی تاریکیوں میں بھٹکتا ہوا پاتے ہیں، جب انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھتے ہیں اور جب اظہارِ درد و غم پر قانون کی گرفت محسوس کرتے ہیں تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں اور اہلِ وطن کے شانے جھنجھوڑ کر اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سوال کرتے ہیں ؎

ظلمت میں غلامی کی آخر یوں گھٹ کے رہیں گے ہم کب تک
یہ ظلم کہاں تک جھیلیں گے، یہ جبر سہیں گے ہم کب تک
ہونٹوں پہ لگی ہوں جب مہریں، پھر کچھ نہ کہیں گے ہم کب تک
اے اہلِ وطن، اے اہلِ وطن

۱؎ گورکھپوری، مجنوں: پچیس سال کی چند اہم شخصیتیں، مطبوعہ افکار، کراچی، جوبلی نمبر سنہ ۱۹۷۰ء، ص ۶۹

اور پھر خود ہی اپنی غلامی کی ظلمت سے چھٹکارا حاصل کرنے اور ظلم و جور سے نجات پانے کا راستہ بتاتے ہیں ـــــ اور وہ راستہ ہے باہم مل کر دشمن کے خلاف صف آرا ہونے کا! ـ جاں نثار اختر کی دکھائی ہوئی یہ راہ ملاحظہ ہو ؎

یہ دھوپ چمکتی تیغوں کی اک آن میں ڈھل سکتی ہے ابھی
زنجیر غلامی کی کیا ہے، اک آنچ میں گل سکتی ہے ابھی
ہم مل کے اٹھیں تو یہ دنیا اک پل میں بدل سکتی ہے ابھی

اے اہل وطن، اے اہل وطن

اور جب اہل وطن جاگ اٹھتے ہیں، غلامی کی زنجیر گلا دینے کا جذبہ ان کے دل میں نمایاں ہو جاتا ہے اور وہ فرنگی سامراج سے ٹکرانے کے لئے قدم آگے بڑھا دیتے ہیں تو جاں نثار اختر سرفروشانِ وطن کے اس رواں دواں قافلے کی یوں منظر کشی کرتے ہیں ؎

حکومت کے زرکار ایواں سے ہوتا
غلامی کے تاریک زنداں سے ہوتا
بغاوت کے سنگین میداں سے ہوتا

بڑی شان سے کارواں جا رہا ہے

جاں نثار جو رومانی فضاؤں میں بسیرا لیتے تھے اور حسن محبوب کی قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے[1] ـــ اب آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی شان میں یوں گیت گا رہے ہیں ؎

جو شانے پر بغاوت کا علم لے کر نکلتے ہیں
کسی ظالم حکومت کے دھڑکتے دل پہ چلتے ہیں

میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں

مجاہدینِ آزادی کی مدح سرائی کرنے والے اختر میدان جنگ میں رجز بھی پڑھتے جاتے ہیں اور ظلم و استبداد سے ٹکرانے والوں کے حوصلے بھی بڑھا رہے ہیں۔ اس رومانی پرست شاعر کا یہ انداز قابل دید ہے ؎

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ـ حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۲۰۱
نیز، بریلوی، ڈاکٹر عبادت: تنقیدی زاویے، ص ۳۲۵

ٹھکرا کے گرے جاتے ہیں شاہوں کے علم آج
اکھڑے نظر آتے ہیں حکومت کے قدم آج

نعروں سے بغاوت کے گونجا ہوا میدان
بیدار ہے انسان

جنگ آزادی کے اسی میدان میں ہمرہان قافلہ کو اختر کا یہ اعلامیہ بھی سناتی دیتا ہے جس میں یقین کی پختگی بھی ہے اور امید کی کرن بھی!

ختم ہے اب اندھیری وادیوں کا سلسلہ
ہمرہان قافلہ اے ہمرہان قافلہ

ظلمتیں میدان سے آخر بھاگنے والی ہیں اب
دخترانِ منزل کی راہیں جاگنے والی ہیں اب
یہ زمیں ہل جائے گی یہ آسماں ہل جائے گا
اک نیا پرچم ہوا کے دوش پر لہرائے گا

احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں غیر متوازن اندازِ زندگی سے ہی شدید احساس پیدا ہیں ہوا[1] وہ ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری ہونے کے ناتے[2] تغیر پذیر ماحول سے بے حد قریب رہے ہیں۔ اسی قربت نے اپنے برعظیم کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے پر مجبور کیا۔ وہ اپنے تلخ شاہدات کو درد و اثر سے پر لہجے میں یوں پیش کر رہے ہیں ؎

یہ بے محل سے قانون اجنبی سا نظام
لبوں پہ مہرِ خموشی زباں کو اذنِ کلام
یہ قید و بند یہ تقسیمِ زر یہ دانہ و دام
یہ جور و جبرِ مسلسل یہ اختیار کا نام

---

[1] قاسمی، احمد ندیم: خود نوشت حالات، مطبوعہ پیام نو، مرتبہ راشدی، ومغا، ص ۹۷
[2] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۲۷۱

قاسمی جس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں غلامانہ معاشرے کی محض ترجمانی ہی نہیں کی جاتی اور قید و بند کی صعوبتوں کا فقط اظہار ہی نہیں ہوتا شہنشاہی نظام کو درہم برہم کرنے کا آہنی عزم بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ایسا عزم جس کی بدولت بے رنگ لاشے نشانِ سفر بن جاتے ہیں، رگِ سنگ میں زندگی پھڑپھڑانے لگتی ہے، چٹانیں اڑ اڑ کر آئینہ خانوں سے ٹکرا جاتی ہیں اور بلبلیں شاہی گنبدوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ذرا ملاحظہ کیجئے، ترقی پسند تحریک کے زیر اثر برعظیم میں رونما ہونے والے انقلاب کا ردِ عمل قاسمی کے درج ذیل اشعار میں ؎

شہنشاہوں کی مرمریں بارگاہوں میں فانوس روشن ہوئے جن کے دم سے
ستیزہ کے الجھے ہوئے راستوں سے وہ مہجور بھی آشنا ہو رہا ہے
تمدن کی قربان گاہوں پہ بے رنگ لاشیں نشانِ سفر بن رہی ہیں
حکومت کے پنجے میں محبوس و مجبور نالہ صدائے درا ہو رہا ہے
رگِ سنگ میں زندگی پھڑپھڑائی، چٹانیں اڑیں اور ٹکرا کے لوٹیں
وہ آئینہ خانوں میں اک شور اٹھا "یہ کیوں ہو رہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے"
وہ بلبلیں جو ایوانِ شاہی کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں کو چھپاتی رہی ہیں
اب ان کے پلٹنے، لپٹ کر تڑپنے کا انداز و اثر رونما ہو رہا ہے

سیاسی کروٹیں لیتے ہوئے اس دور میں قاسمی نے اپنے کلام سے اہلِ وطن کے دلوں میں عزم و ہمت کے چراغ روشن کئے ہیں، ان کی شعلہ مزاجی کو تیز تر کیا ہے اور انہیں عقدۂ مشکل کی کشود کے لئے یورش و یلغار پر آمادہ کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے غلام قوم کے یخ بستہ خول میں چھپی ہوئی بیکراں قوت و توانائی کی آگ بھڑکا دی ہے ؎

میں نے جس دور کی امید دلائی ہے تجھے
وہ تری شعلہ مزاجی سے جلا پائے گا
تیرے انفاس کے جھونکوں سے نکھر جائے گا
میرے اشعار کی محتاج نہیں اسکی نمود
تری یلغار ہے اس عقدۂ مشکل کی کشود

اسی انقلاب کے چرچے ہیں گجکلاہوں میں

جو خون بن کے سلگتا ہے تیری باہوں میں

قاسمی کے خیال کے مطابق خون بن کے سلگنے والے انقلاب کی یہی وہ آگ ہے جس میں غیر ملکی حکمرانوں کا لہراتا ہوا پرچم جل کر راکھ ہو جائے گا اور ان کے اقتدار کی نشانی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی ؎

اگر وقت کی شاہراہیں متعین ہیں' یہ شام یہ شب یہ لو یہ سویرا

تو دہکتے ہوئے سرخ پہیوں کے چکر میں جل جائے گا اجنبی بجر یرا

کیفی اعظمی جو رومانی نظم نگاری سے انقلاب کی طرف آئے ہیں[1]' "حالات کے شعور اور ماحول کی ترجمانی میں کسی سے پیچھے نہیں"[2] حصول آزادی کے سلسلے میں ان کا اشتراکی نظریہ ان کے کلام پر پوری طرح اثر انداز ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پورے وثوق کے ساتھ ظلم و جور پر مبنی سامراجی نظام کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں۔ اس اظہار میں محض ان کے جذبات کی ترجمانی ہی نہیں' حقائق کا پرتو بھی ہے۔ جذبات و حقیقت کے اس امتزاج کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

جاگ اٹھی سینوں میں آزادی کی رو

اب یہ دھارا رخ بدل سکتا نہیں

سامراج اب پھول پھل سکتا نہیں

لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ

لگنے ہی والی ہے جیلوں' دفتروں تھانوں میں آگ

بہنے ہی والا ہے ایوانِ شہنشاہی میں خون

پھٹنے ہی والی ہے چھت' گرنے ہی والے ہیں ستون

اس انقلاب ماحول میں کیفی نے اپنے جوشیلے اور روح پرور کلام سے مجاہدوں

---

[1] حسین' سید احتشام: روایت اور بغاوت' ص ۲۰۱

[2] بریلوی' ڈاکٹر عبادت: تنقیدی زاویے' ص ۳۲۵

کے رگ و پے میں ایک آگ سی بھڑکا دی ہے، ان کے دلوں میں حصول آزادی کی تڑپ پیدا کر دی ہے اور اپنی اغیار سے براہِ راست معرکہ آرا ہونے کا جذبۂ محکم عطا کیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ساحل ہند پہ برق اب کڑکتی ہے اٹھو
روح زنداں غلامی میں بھڑکتی ہے اٹھو
بغاوت کا پرچم اڑائے چلو
نظام غلامی مٹاتے چلو
اس انتشار چمن کی سوگند بابِ زنداں ہلا کے اٹھنا
گلے کا طوق آ رہے قدم پر کچھ اس طرح تلملا کے اٹھنا

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں آزادی کی تحریک جس طنطنے کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، اسے دیکھ کر کیفی اعظمی یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھے کہ میدانِ پلاسی سے جس جنگ کا آغاز ہوا تھا ـــــ اب وہ آخری مرتبہ لڑی جانے والی تھی ـــ اور یہ کون نہیں جانتا کہ آخری جنگ فیصلہ کن ہوتی ہے۔ ذرا اس کا نقشہ ناظرین دیکھ لیں ؎

بڑھتا جاتا ہے جوشِ آزادی	نعرہ زن ہے سروشِ آزادی
جھک رہی ہے بلندیوں کی جبیں	جیسے کروٹ بدل رہی ہے زمیں
شعلہ افشاں ہے صبحِ بیداری	آخری جنگ کی ہے تیاری

کیفی اعظمی نے جس آخری جنگ کی نشان دہی کی ہے، اس میں وہ تنہا شامل نہیں، بے شمار اشتراکیت پسند شعرا شریک ہیں۔ وامق جونپوری بھی ہیں "جنہوں نے اپنی شاعری کو وقت کی پکار بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا"[1] علی جواد زیدی بھی ہیں جو اپنے اشعار سے "انقلاب کی رفتار کو تیز تر کر دینا چاہتے

---

[1] حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۲۷۳

ہیں "۱؎ سلام مچھلی شہری بھی ہیں جو وطن کو آتشیں نغمے سنانے اور برگِ گل کو چنگاریوں سے رنگین بنانے کا یوں عزم کئے ہوئے ہیں ؎

ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے برگِ گل رنگیں بنانے دو

اور اختر الایمان بھی ہیں جو آزادی کے متوالوں کو موت کے دروازے سے گزرنے کی اس طرح تلقین کر رہے ہیں ؎

اٹھو نیند کے ماتو جاگو ۔۔۔ رات نے دن کو گھیر لیا ہے
دھرتی ماں کے بیٹو جاگو ۔۔۔ ماں نے تم کو یاد کیا ہے
موت کے دروازے سے گزرو ۔۔۔ آزادی کا گیت سناتے

ترقی پسند تحریک کے یہ تمام شعرا جنگِ آزادی میں سپاہی کی حیثیت سے بہ نفسِ نفیس شریک ہیں اور اپنے اشعار سے کبھی دشمنوں کو للکار رہے ہیں، کبھی مجاہدوں کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں اور کبھی ظالم و جابر فرنگیوں کو سمندر کے راستے واپس چلے جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ ان سبھوں کے جذبات میں انتہا کی شدت، لہجے میں غضب کی سختی اور اظہارِ خیال میں بلا کا جوش و خروش ہے۔ سب کے سب "اپنی جوانی کی طاقت اور خون کو انسانوں کو بیدار کرنے اور صحیح راستہ دکھانے پر صرف"۲؎ کر رہے ہیں تاکہ ملک آزاد ہو، صدیوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی قوم آزاد ہو اور ظلم و جور سے بوجھل ماحول اور معاشرہ آزاد ہو۔

۱؎ حسین، سید احتشام: روایت اور بغاوت، ص ۲۰۲
۲؎ ایضاً

تیرہواں باب

تحریکِ پاکستان کا دور

ہم گیارہویں باب میں اس سیاسی موڑ کا مشاہدہ کر آئے ہیں جہاں تحریک ترک موالات کے خاتمے پر مجاہدین آزادی کا کارواں دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ ایک کانگریس کے پلیٹ فارم سے پورے برعظیم کے سوراج کا واحد طلب گار تھا جبکہ دوسرا مسلم لیگ کے سبز پرچم تلے دس کروڑ مسلمانوں کی آزادی کا بھی مطالبہ کر رہا تھا۔ قائد اعظم نے ہندو کے واحد قومی نظریے کا ابطال کرتے ہوئے دو قومی نظریے کا برملا اعلان کر دیا تھا۔ علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں ایک اسلامی ریاست کا جو سنہرا خواب دیکھا تھا، اسے حقیقت کے رنگین سانچے میں ڈھالنے کے لئے وہ پیکر عزم وعمل بن کر آگے بڑھے۔ انہوں نے برعظیم کے مسلمانوں کو ایک تازہ ولولے اور نئی امنگ سے سرشار کر دیا اور ان کی رگوں میں جوش وخروش اور حوصلہ وآرزو کی لہر دوڑا دی۔

قائد اعظم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے کہ کانگریس جماعت اوچھے ہتھکنڈوں کے ذریعے اسلامی تہذیب وتمدن، معاشرت وحیثیت اور اقدار و روایات کو مٹانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ جان چکے تھے کہ یہ فرقہ پرست جماعت ہندی کے روپ میں سنسکرت زبان کو رائج کر کے[1] اور واردھا اسکیم کے نام سے نئی تعلیمی اسکیمیں جاری کر کے[2] مسلمانوں کو اکھنڈ بھارت کا غلام بنانے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔[3] وہ ہر حال میں مسلمانوں کو اقلیت قرار دے کر اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانے کے درپے ہو چکی تھی۔[4]

۱؎ پیرزادہ، سید شریف الدین: Foundations of Pakistan، جلد دوم، ص ۶۶۷

۲؎ ایضاً، ص ۳۰۵-۳۰۶
نیز Kamal Yar Jung Education Committee Report، ص ۲۷۹

۳؎ پیرزادہ، سید شریف الدین: ایضاً، ص ۲۶۸

۴؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قائد اعظم کا وہ خطبہ صدارت جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۳۷ء اور منعقدہ پٹنہ ۱۹۳۸ء میں دیا تھا۔

یہ تھے وہ ناسازگار حالات جن میں قائدِ اعظم اور دیگر مسلم رہنماؤں نے سر جوڑ کر سوچنا شروع کیا کہ فرقہ پرست اور متعصب کانگریسی جماعت کے سیاسی ہتھکنڈوں[1] سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے اور مسلمانانِ برِعظیم کے لئے سکون و طمانیت کے ساتھ اسلامی ماحول میں زندگی بسر کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اپنی تلخ حالات اور ان سے اخذ شدہ تجربات کا نتیجہ تھا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے منٹو پارک[2] میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس قائدِ اعظم کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ علامہ اقبال کے سنہرے خواب کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ چنانچہ اس اجلاس میں مولوی فضل حق نے وہ قرارداد پیش کی[2] جو "قراردادِ پاکستان" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسلم زعما کے اس یادگار اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ:

> "چونکہ ہندو اکثریت کے ہاتھوں مسلمانوں کی جان، مال، عزت، آبرو، تہذیب و تمدن اور مذہب سب خطرے میں ہیں اور اب کوئی صورت ایسی باقی نہیں رہی کہ دونوں قومیں مل کر اس ملک پر حکومت کر سکیں۔ اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ برِعظیم کے وہ حصے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، باقی ہندوستان سے الگ کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیئے جائیں جہاں وہ اپنی خواہشات اور قومی امنگوں کے مطابق آبرو مندانہ زندگی گزاریں اور اپنی تہذیب و تمدن کو پروان چڑھائیں۔ جہاں وہ صحت مند معاشرے کے رکن بن کر زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔"[3]

---

[1] موجودہ اقبال پارک

[2] ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۲۵۵

[3] منقول پیرزادہ، سید شریف الدین: Foundations of Pakistan جلد دوم، ص ۳۴۱

۱۹۴۰ء کی اس قرارداد نے مسلم لیگ کا سیاسی نصب العین متعین کر دیا۔ اس کے اعلان سے اسلامیانِ ہند کی منزلِ مقصود متشکل ہو گئی۔ ان کی جدّوجہد اور سعی و عمل کا ایک مرکز قرار پا گیا۔ آزادی کا وہ تصور جو ۱۸۵۷ء سے مسلم قوم کے ذہن و دل میں پرورش پا رہا تھا' اب نئی صورت اختیار کر گیا۔ مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم لے کر وہ حصول پاکستان کے لئے سرگرم عمل ہو گئی۔ قائدِ اعظم کی رہبری میں نئی منزل' نئے مقام اور نئے مرکز تک پہنچنے کے لئے مسلمانوں کا نیا سفر شروع ہو گیا۔

اس نئے سفر میں ہمارے شعرا بھی شریک تھے۔ انہوں نے پاکستان کی عظمت و برتری کے گیت گائے' اس کی اہمیت و افادیت پر نظمیں لکھیں اور مسلم قوم میں نئی آزاد مملکت کے حصول کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے ولولہ انگیز ترانے لکھے۔ انہوں نے متعین شدہ منزل کا ہی پرچار نہیں کیا' مسلم لیگ کے مشن کو بھی موضوعِ سخن بنایا اور سالارِ کارواں' محمد علی جناح' کے اوصاف و خصائل کو بھی احاطۂ تحریر میں لایا۔ شعرائے اردو کی یہ نظمیں' یہ گیت' یہ ترانے مجاہدینِ آزادی کے شوق و آرزو کو مہمیز کرتے رہے' اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کا حوصلہ عطا کرتے رہے اور پاکستان کے نظریے کو اجالتے رہے۔ آئیے اس باب میں ہم ایسے شعرا کی پُرخلوص کاوشوں کا جائزہ لیں کہ یہ راہِ آزادی کے آخری سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

تحریکِ پاکستان کے شاعروں میں میاں بشیر احمد کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء سے سیاسی میدان میں قائدِ اعظم کے ساتھ تعاون کا آغاز کیا تھا[1] وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن رہے تھے[2] لاہور کے تاریخی اجلاس میں وہ مجلس استقبالیہ کے سکریٹری بھی تھے[3] اسی اجلاس

---

[1] احمد' میاں بشیر: قوسِ قزح' ص ۱

[2] پیرزادہ سید شریف الدین: Foundations of Pakistan' جلد دوم ص ۶۶۲

[3] احمد' میاں بشیر: ایضاً' ص ۲

میں قرارداد پاکستان پیش ہونے سے قبل انہوں نے قائد اعظم پر اپنی معرکۃ الآرا نظم سنائی[1]
جو آناً فاناً پورے برعظیم میں زبان زد خاص و عام ہوگئی۔ مترنم بحر موزوں الفاظ محمد علی
جناح کی ردیف اور شاعری عقیدت نے اس میں حسن و دلآویزی پیدا کر دی۔ چند اشعار
پیش خدمت ہیں ؎

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح ــــ ملت ہے جسم جاں ہے محمد علی جناح
صد شکر پھر ہے گرم سفر اپنا کارواں ــــ اور میر کارواں ہے محمد علی جناح
بیدار ہو کے ناظم اسلامیانِ ہند ــــ ہے کون؟ بدگماں ہے محمد علی جناح

میاں بشیر احمد نے اپنی ایک دوسری نظم میں جو قائد اعظم کی سالگرہ کے موقع پر
۱۹۴۳ء میں کہی گئی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں بھی اسی سال
سنائی گئی تھی[2] نہ صرف مسلمانانِ برعظیم کے مضبوط و بلند ارادوں کا اظہار کیا تھا
بلکہ قوم کے عظیم رہنما کی طویل زندگی کی دعا بھی کی تھی۔ میاں صاحب کی یہ آواز
۱۹۴۰ء کے بعد ابھرنے والی پوری ملت اسلامیہ کی آواز بازگشت ہے۔ تاریخ
کے اس اہم موڑ پر برعظیم کا ہر مسلمان قائد اعظم کے متعلق اسی انداز میں سوچ رہا
تھا[3] ؎

حوصلے اپنے ہیں مضبوط ارادے ہیں بلند
شامل حال ہوا فضل خدا آج کے دن
قوم کی رہنمائی کرے سو سال جیے
دل مسلم سے نکلتی ہے دعا آج کے دن

اسی تحریک پاکستان کے دوران میاں بشیر احمد کی ایک نظم "پاکستان کا ترانہ"
کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ منظر بشیر کے بقول "اس کا ایک ایک مصرع ہر مسلمان

۱۔ پیرزادہ، سید شریف الدین: Foundations of Pakistan جلد دوم، ص ۳۲۶
۲۔ منقول احمد، میاں بشیر: قوس قزح، ص ۹۶
۳۔ کوپ لینڈ، آر: The Indian Problem، ص ۱۸۰۔ ۱۹۴

کے وردِ زبان رہا۔ لے کے رہیں گے پاکستان کے نعروں سے تو برصغیر کا چپہ چپہ گونج اٹھا۔[۱] یہ نظم صوتی حسن، پرجوش لہجے، عزم و ارادے کے اظہار اور جذبات کی فراوانی کی بدولت تاریخِ پاکستان کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی ہے۔ یہ وہ نعرۂ حق ہے جس کی بازگشت آج تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے[۲] اور جب شاعر نے ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں یہ ولولہ انگیز ترانہ پیش کیا تھا[۳] تو مجاہدین کے لئے یقیناً مہمیز ثابت ہوا ہوگا۔ سرزمین دہلی[۴] سے طلوع ہونے والی اس نظم کا رنگ و آہنگ اور طرز و تیور ملاحظہ ہو۔

حق ہے ہمارا پاکستان — حق پہ ہمارا ہے ایمان
آؤ کردیں آج اعلان — چاہے اپنی جائے جان

لے کے رہیں گے پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان

ہم کو بہت کچھ کرنا ہے — کرنا ہے دکھ بھرنا ہے
طوفانوں سے گزرنا ہے — جینا ہے اور مرنا ہے

پائیں گے یوں پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان

تحریک پاکستان کے دوران میاں بشیر احمد نے گرچہ دو چار ہی نظمیں لکھی تھیں، لیکن یہ چند ایک "شاعر کے جذبۂ ملی کی ترجمان اور اپنی اپنی جگہ قابل توجہ ہیں"۔[۵]

مولانا ظفر علی خاں تحریک آزادی کے سرگرم کارکن تھے اور حریت پسند شاعری کو فروغ دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ وہ ابتدا میں کانگریس سے وابستہ تھے،

۱۔ بشیر منظر: حرف آخر، مطبوعہ قوس قزح، ص ۱۱۱
۲۔ ایضاً
۳۔ منقول قوس قزح، ص ۹۴
۴۔ یہ نظم دہلی کے مذکورہ اجلاس میں ضرور پیش کی گئی تھی، لیکن شاعر کا تعلق لاہور سے تھا۔
۵۔ خان حامد علی: حرف آغاز، مطبوعہ قوس قزح، ص ۱۲

لیکن یہ دیکھ کر کہ یہ مسلمانوں کو دبانا چاہتی ہے، اس سے الگ ہو گئے[1] اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۲۳ رمارچ ۱۹۴۰ء کو جب لاہور کے جلسے میں قرار داد پاکستان پیش کی گئی تو اس کی حمایت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"آج کے دن مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ایک آزاد وطن میں بول رہا ہوں"۔[2]

اس آزاد وطن کے قیام کے لئے وہ مسلسل جدّوجہد کرتے رہے۔ اس موقع پر کانگرس اور اس کے بہی خواہوں نے قیام پاکستان کی جو مخالفت کی، اس کے تدارک کے لئے مولانا برابر سینہ سپر رہے۔ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہر اوچھے ہتھکنڈے سے محفوظ رکھنے کے آرزو مند رہے۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے مسلم لیگ کے قائد محمد علی جناح سے یوں خطاب کیا تھا ۔

ملت کا تقاضا ہے کہ اے قائد اعظم

اسلامیوں کی شان میں کچھ چاند لگا اور

ہے سست عناں قافلہ اور دور ہے منزل

اس قافلے کی گرمیِ رفتار بڑھا اور

مغرب کے حریفوں کو جو دیتے ہے تجھے زک

مشرق کی سیاست کا کوئی دام بچھا اور

باتوں سے نہ مانیں گے لاتوں کے ہیں یہ بھوت

ان سے جو نمٹنا ہے تو حربہ کوئی لا اور

بلیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں، خصوصاً قرار داد لاہور کے بعد دشمن عناصر جس طرح سرگرم عمل ہو گئے تھے اور حصول پاکستان کے مقصد کو ناکام بنا دینے کی جیسی جیسی ترکیبیں سوچ رہے تھے، ان حالات میں قائد اعظم کی مدبرانہ قیادت، سیاسی سوجھ بوجھ اور ژرف نگاہی نے مسلم قوم کو سہارا دیا، اسے یاس و حرماں کی تیرگی

---

[1] جیسا کہ مولانا نے خود اپنی تقریر کے دوران اعتراف کیا تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پیرزادہ سید شریف الدین: Foundations of Pakistan، جلد دوم، ص ۳۴۳

[2] ایضاً،

سے ذکالا اور روشن مستقبل کی طرف اس کی رہنمائی کی ۔ اس وقت پورے برعظیم میں قائدِ اعظم کی تنہا ایک ذات تھی جو ان گنت دشمنوں پر حاوی تھی ۔ مولانا ظفر علی خاں کو ان کی اس قائدانہ صلاحیت کا اعتراف تھا اور وہ اس رتبے کو قائد کے لئے باعثِ عزو افتخار قرار دیتے ہیں ؎

زیبا ہے اسے ملّتِ بیضا کی قیادت
اسلام اسے دے اس کے سوا رتبہ کیا اور

مولانا ظفر علی خاں کی طرح حسرت موہانی بھی مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے ۔ حصولِ پاکستان کے سلسلے میں وہ اس درجہ خیال تھے کہ اس ضمن میں کسی قسم کی سودے بازی بھی انہیں گوارا نہ تھی ۔ قرار دادِ پاکستان کی منظوری کے دو ہی سال بعد انہوں نے الہ آباد میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے انتیسویں اجلاس میں بڑے دھڑلے کے ساتھ یہ کہا تھا کہ "لیگ کے قائم شدہ عقیدے کے بموجب برعظیم کے مسلمانوں کا مقصدِ اولیٰ ہی یہ ہے کہ وہ مکمّل آزاد ریاست کی بنیاد ڈالیں"۔[۱] اور جب جولائی ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کونسل کا تاریخی اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا تو مولانا حسرت نے حسبِ ذیل تجویز پیش کی تھی :

مسلم لیگ کو چاہیے کہ وہ آزاد و خود مختار پاکستان کے
مطالبے کی طرف رجوع کرے اور اس کے حصول کے لئے
مناسب کارروائیاں عمل میں لائے"۔[۲]

یہ کارروائیاں جب عملی شکل میں ڈھلنے لگیں اور مسلمانانِ ہند کا قافلہ منزلِ مقصود کی جانب عزم و ہمّت اور جوش و خروش کے ساتھ روانہ ہوا تو حسرت موہانی کو یہ یقین ہو چلا کہ انتظار کی ساعتیں تمام ہوں گی ' وصلِ یار کا لمحہ نصیب ہوگا' آزادی کی آمد آمد سے دن راحت فضا ہو جائے گا اور راتِ عیش آفریں ہوگی ۔ ان امید افزا سیاسی خیالات کو وہ جس طرح غزل کے اشعار میں

---

[۱] پیرزادہ سید شریف الدین : Foundations of Pakistan جلد دوم ص ۳۹۱
[۲] ایضاً ' ص ۵۵۱ - ۵۵۲

پیش کر گئے ہیں، وہ ان ہی کا شاعرانہ کمال ہے ؎

پھر ساعتیں تمام ہوئیں انتظار کی

تقریب پھر قریب ہوئی وصل یار کی

اشارت دل ربا ہوگی، کنایت دل نشیں ہوگی

تعلق حسن سے جس شے کا ہوگا نازنیں ہوگی

میسر جس کو ہوگا فخر تیرے خیر مقدم کا

وہ دن راحت فزا ہوگا، وہ شب عیش آفریں ہوگی

یہاں اس امر کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا حسرت موہانی کو سنہ ۱۹۴۶ء میں ایک خواب کے ذریعے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی بشارت مل گئی تھی اور انہوں نے اس ضمن میں دیوان حافظ سے رجوع کیا تو وہاں بھی ایک غزل کے ذریعے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی[1]۔ چنانچہ مولانا حسرت نے حافظ کی مذکورہ غزل پر تضمین کرتے ہوئے "سندو مہرونشاں" کی خوشخبری اس طرح دے دی تھی ؎

جب مجھے خواب میں خود آ کے وہ شاہ خوباں

جب کہ حافظ بھی مصدق ہو بفال دیواں

تجھ کو حسرت یہ مبارک سندو مہرونشاں

پردہ بردار کہ تا سجدہ کنند جملہ جہاں

طاق ابروئے تو محراب جہاں خواہد بود

معرض وجود میں آنے والی آزاد مملکت اسلامیہ سے حسرت موہانی کو جو والہانہ لگاؤ اور دلی عقیدت تھی[2]، اس کا اظہار انہوں نے درج ذیل شعر میں بخوبی کر دیا ہے ؎

نشانِ آستانِ حسن ہوگا جس طرف حسرت

اسی جانب کمال شوق کی مائل جبیں ہوگی

---

[1] منقول مقدمہ کلیات حسرت، ص ۳۳-۳۴

[2] واضح رہے کہ یہ عقیدت پاکستان بن جانے کے بعد بھی قائم رہی۔ وہ بھارت ہی میں رہ گئے لیکن ان کے شوق کی جبیں اسی نشان آستان حسن کی طرف مائل رہی۔

اب ہم جوش ملیح آبادی کی طرف آتے ہیں جو تحریک پاکستان کے دور سے بھی تھوڑا بہت تعلق ضرور رکھتے ہیں۔ وہ مسلم لیگ کے اس مطالبے کے حامی و موئید تھے کہ مسلمانوں کے جداگانہ نظریۂ حیات کے پیش نظر ایک خود مختار ریاست قائم کی جائے۔ انہوں نے اس خیال کو اپنی ایک نظم "وقت کی آواز" میں مادر وطن کی زبانی پیش کیا ہے۔ اس میں کانگریس کو بڑی بہن اور لیگ کو چھوٹی بہن قرار دیا گیا ہے۔

چھوٹی بیٹی کے مطالبات کی حمایت کرتے ہوئے ماں بڑی بیٹی یعنی کانگریس کو یوں سمجھاتی ہے ؂

دنیا میں سب کو فکر بقائے زباں کی ہے
دل میں لگن تحفظ نام و نشاں کی ہے
دھن سب کو ایک حلقۂ امن و اماں کی ہے
حاجت ہر ایک فرد و بشر کو مکاں کی ہے
ہاں لیگ کو بھی حق ہے کہ وہ اپنا گھر بنائے
بچوں کو اپنی اپنی زباں اپنے فن سکھائے

کانگریس تصور پاکستان کی نہایت شد و مد سے مخالفت کر رہی تھی۔ ہندو لیڈر جداگانہ ملک کے مطالبے کو ضد اور ہٹ دھرمی قرار دے رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ برعظیم میں ایک اسلامی ریاست کی تشکیل عمل میں آئے۔ اس مخالفت میں وہ اس طرح اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے کہ لیگ کو فرنگیوں کا ہم راز بنا کر پیش کر رہے تھے[1]۔ جوش ملیح آبادی ماں کی زبانی ان تمام الزامات کی تردید کرتے ہوئے کانگریس کو اس طرح نصیحت کر رہے ہیں ؂

"چھوٹی کی ہٹ غلط ہے" یہ باتیں ہیں واہیات
"دشمن کی ہے وہ دوست" یہ ہے دھاندلی کی بات

---

[1] واضح رہے کہ کانگریس کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی نے بھی پاکستان کی تشکیل کے منصوبے کو انگریزوں کی مصلحت قرار دیا تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: جوشی، پورن چند: Freedom Programme of Indian Communist، ص ۲۷

بنتی ہے جیسے بکھرے ہیں کیوں اس قدر بچیت
جو اپنی چیز مانگے وہ ٹھہرا نراپٹیت

اس کے بعد جوش یہ باور کراتے ہیں کہ رسم و رواج، دین و روایات، طرز عمل، فکر و نظر غرض ہر چیز میں دونوں بہنوں میں شدید اختلاف ہے۔ اس بنا پر وہ یکجا ہو کر ایک ریاست میں نہیں رہ سکتیں۔ بڑی بہن یعنی کانگریس ہزار حیل و حجت کرے، چھوٹی بہن یعنی مسلم لیگ کا مطالبہ اپنی جگہ درست اور صائب ہے۔ ملاحظہ کیجئے دو قومی نظریے کو جوش ملیح آبادی کتنے واضح اور واشگاف انداز میں پیش کر رہے ہیں ؎

خود دیکھ اپنے اس کے ترانوں میں اختلاف
وہموں میں اختلاف گمانوں میں اختلاف
قصوں میں اختلاف فسانوں میں اختلاف
لہجوں میں اختلاف زبانوں میں اختلاف
وضع و طریق، حرف و حکایت، شگون و فال
انداز نطق، طرز عمل، جادۂ خیال
رسم و رواج، دین و روایات قیل و قال
اٹھ بیٹھ، بات چیت، لب و لہجہ، چال ڈھال
تم میں ہر ایک چیز جدا، ہر چلن جدا
دونوں کے پھول پات جدا ہیں چمن جدا

مذکورہ نظم کے آخر میں جوش نے مسلم لیگ کی پرزور حمایت کی ہے اور اسے اس کا حق دلانے کے لئے مادرِ وطن کی زبانی بڑی بہن کانگریس کو یہ پیغام دیا ہے ؎

کچل صبح و شام چھوٹی کے چکھنے سے فائدہ
چھوٹی بہن کو گھونٹ کے رکھنے سے فائدہ
چھوٹی بہن مراد نہ جب تک کہ پائے گی
بیٹا یہ روز روز کی کل کل نہ جائے گی

جوشؔ ملیح آبادی نے "وقت کی آواز" لکھ کر برعظیم کے مسلمانوں کو ان کا حق دلانے کے لئے جو کوشش کی ہے، وہ ادبی، سیاسی اور تاریخی، تینوں لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر آچکا ہے، اسرار الحق مجازؔ ترقی پسند گروپ سے تعلق رکھتے تھے جو خاص نظریے کے تحت حصول آزادی کا خواہاں تھا اور مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے اتحاد کو لازمی قرار دیتا تھا۔[۱] یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان کی تحریک چلی تو اس گروہ نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔[۲] اس نظریے کے کسی بھی شاعر نے اس تحریک کی حمایت میں آواز نہیں اٹھائی۔ لیکن مجازؔ نے اس انداز میں تاثیر کی کہ "ترانۂ پاکستان"[۳] جیسا شاہکار قلمبند کیا۔ یہ شعری تخلیق اسلوب و ہیئت، لب و لہجہ اور جوش و جذبے کی بدولت ایک تاریخی چیز بن گئی ہے اور اس اہمیت کی حامل ہے کہ بلا کم و کاست یہاں پیش کر دی جائے؎

آزادی کی دھن میں کس نے آج ہمیں للکارا
خیبر کے گردوں پر چمکا ایک ہلال، اک تارا
سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا
سرمائے کا سوکھا جنگل، اس میں سرخ شرارا

پاکستان ہمارا   پاکستان ہمارا   پاکستان ہمارا

سو انجیلوں پر ہے بھاری اک قرآن ہمارا
روک سکا ہے کوئی دشمن کب طوفان ہمارا
ہر ترک اپنا، ہر حر اپنا، ہر افغان ہمارا
ہر شخص اک انسان یہاں ہے، ہر انسان ہمارا
ہم سب پاکستان کے غازی، پاکستان ہمارا

پاکستان ہمارا   پاکستان ہمارا   پاکستان ہمارا

---

[۱] جوشی، پورن چند: کانگریس اور کمیونسٹ، ص ۱۲-۱۳

[۲] ایضاً: *Freedom Programme of Indian Communist*، ص ۲۷

[۳] ایک بیان کے مطابق یہ نظم مجازؔ اور مخدوم محی الدین کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہے۔ منقول حقی، شان الحق: نشید حریت، ص ۲۸۶

تحریک پاکستان کے اس دور میں مسلم لیگ ہی وہ واحد جماعت تھی جو مسلمانوں کے بہتر مستقبل کے لئے جد وجہد کر رہی تھی اور کانگریس کے ہر حربے اور ہر داؤں پیچ سے اپنی محفوظ رکھنے کی تدبیریں اختیار کر رہی تھی۔ ان تمام باتوں کا تقاضا یہی تھا کہ اس قوم کا ہر فرد سبز پرچم تلے جمع ہو اور مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سرگرم عمل ہو جائے۔ چنانچہ شفق عماد پوری نے اس حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے یہ صدا بلند کی۔

اسلام کا جھنڈا لہرا کر — ایمان کا جذبہ پیدا کر
بتخانے کی راہ نہ دیکھا کر — کعبے کی طرف منہ اپنا کر
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

باطل پہ اڑے ہیں کانگرسی — کرتے ہیں حق کی داد رسی
کچھ اور ہے انکے جی میں بسی — یاں چھوڑ کے انکی ہم نفسی
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

ہے جال بچھانا کام ان کا — دانا ہے تو دیکھ لے دام ان کا
کہنے کو سوراجی نام ان کا — ہے ہندو راج انجام ان کا
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

ہے نور ادھر سایہ ہے ادھر — ہے پھول ادھر کانٹا ہے ادھر
منزل ہے ادھر صحرا ہے ادھر — رستہ ہے ادھر دھوکا ہے ادھر
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

دس بند پر مشتمل اس طویل ترانے کو زیر نظر دور میں وہی مقبولیت حاصل ہوئی تھی جو تحریک خلافت کے زمانے میں ـــ بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو ـــ کو حاصل تھی۔[1]

رمزی الہ آبادی بھی اسی دور میں بڑے عزم کے ساتھ اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ آزاد و خود مختار ریاست کے مطالبے میں ذرا بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اب مسلم قوم

---

[1] احمد میاں ظفیر: گاہے گاہے بازخواں، مطبوعہ روزنامہ "جنگ"، کراچی، مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۶۹ء "ہم سب پاکستانی ہیں" کا آخری صفحہ

کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ وہ ہر صورت میں پاکستان حاصل کر کے رہیں گے ۔

یقین کیجئے کہ اس سے ہم نہ ہرگز بیش و کم لیں گے

اب حق خود ارادیت کو ہر قیمت پہ ہم لیں گے

نہ ہم ان سے درم لیں گے نہ ہم ان سے رقم لیں گے

خدا چاہے تو اک دن لے کے پاکستان دم لیں گے

رمزی مسلمانانِ ہند کو حصول پاکستان کے لئے جد و جہد کرنے اور منزل مقصود تک پہنچنے کا یوں درس دے رہے ہیں ۔

قومی جھنڈا ہاتھوں میں لے کر آئے ہیں یوں آج برادر

بن جاؤ سب لیگ کے ممبر کام کرو رمزی کو لے کر

اٹھو پاکستان بنالو

جاگو جاگو سونے والو

مسلماں ہو منظم ، جذبۂ ایمان پیدا کر

خدا کے پاک بندے اپنا پاکستان پیدا کر

شاعروں کے اس قافلے میں رئیس امروہوی بھی ہیں جنہوں نے اپنی طویل نظم "تصور پاکستان" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تاریخی اور جغرافیائی دونوں لحاظ سے پاکستان کی تعمیر ضروری ہے ۔ انہوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ گرچہ دشمنوں پر یہ تقسیم شاق ہے ، لیکن نئی اسلامی مملکت کا قیام ٹالے نہیں ٹل سکتا ۔ ان خیالات پر مبنی یہ بند ملاحظہ ہو ۔

جب کہ ہے تاریخ اور جغرافیے کا اتفاق

ناگزیر اس برکوچک کے لئے ہے افتراق

ہم نے یہ مانا کہ یہ تقسیم ہے لوگوں پہ شاق

اس حقیقت کا اڑایا جا نہیں سکتا مذاق

ریت کی دیوار سے طوفان ٹل سکتا نہیں

موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

قیام پاکستان کی مخالفت اس منطقی استدلال کے پیش نظر بھی کی جا رہی تھی کہ
اقتصادی طور پر یہ ملک بحران کا شکار رہو گا۔ لوگ بھوکے مر جائیں گے اور یہ مملکت
آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی۔ اس قسم کے اعتراضات کرنے والوں کو رئیس نے دندان
شکن جواب دے کر خاموش کر دیا ہے ؎

ان سیاسی پنڈتوں سے ہے یہ اپنا التماس
کیا ہوا اگر مادی دولت نہ ہوگی اپنے پاس
اور ہی جذبے پہ ہے اپنے تصور کی اساس
کیا فقط معیار آزادی ہے خوراک و لباس

آگہی کے نرخ پر دیوانہ پن کو بیچ دیں
چند سکوں کے عوض قومی وطن کو بیچ دیں

آپ اس اندیشۂ باطل میں کیوں ہیں مبتلا
اقتصادی رخ سے پاکستان ہوگا بے نوا
کون واقف ہے کہ پاکستان کے ارض و سما
عہد مستقبل میں ہو جائیں گے کیا سے کیا

احتیاطاً ڈالیے تاریخ دنیا پر نظر
کس کو فردا کی خبر ہے کس کی فردا پر نظر

باایں ہمہ رئیس امروہوی کو یہ بھی احساس ہے کہ کہیں بدخواہوں کے ان اعتراضات
اور رخنہ اندازیوں سے اہل کارواں بددل اور ہراساں نہ ہو جائیں۔ لہٰذا ان کے
حوصلوں کو بلند رکھنے اور ان میں سعی و عمل کی رفتار تیز تر کرنے کے لئے وہ یوں
نغمہ سرا ہیں ؎

سرِ راہ ہمت کو ہاریں نہ راہی
بنیں منزلِ زندگی میں سپاہی
وہ جھلکی وہ منزل کی جھلکی سیاہی

نہ بھٹکیں بیاباں میں کھو جانے والے
نئے قافلے ہیں ابھی آنے والے

نہ مایوس ہوں رہرووں کی نگاہیں
چمکتی ہیں وہ کامیابی کی راہیں
بڑھائیں قدم پیش قدمی جو چاہیں

کہ رکتے ہیں دور تک جانے والے
نئے قافلے ہیں ابھی آنے والے

نئے قافلے کی آمد آمد کی خبر سنانے والے رئیس کو یقین کامل تھا کہ قائد اعظم کی رہبری میں مجاہدوں کا یہ قافلہ منزل پر ہی پہنچ کر دم لے گا اور شبانہ روز کی جدو جہد کے طفیل ہندوستان منقسم ہو جائے گا۔ پھر پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھر آئے گا۔ ذرا ملاحظہ کیجئے' تحریک پاکستان کے اس دور میں بلند ہونے والی آوازِ رئیس ؎

اپنی اس تحریک کو کوئی لاکھ کرے بدنام
ہم کو کسی سے کام ہیں اپنے کام سے کام
قائد اعظم اپنا رہبر ہادی ہے اسلام
ہونٹوں پر تکبیر کا نعرہ سینے میں قرآن

بٹ کے رہے گا ہندوستان لے کے رہیں گے پاکستان

یہاں اس تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جب پاکستان کی تحریک چل پڑی تو پشاور سے لے کر چاٹگام تک اور وادی ٔ بجالہ سے لے کر راس کماری تک ——— پورے برعظیم میں یہ مصرع

بٹ کے رہے گا ہندوستان لے کے رہیں گے پاکستان

ایک نعرے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ شہر شہر اور قریہ قریہ یہی آواز گونج رہی تھی۔ گلی گلی میں یہی عزم دہرایا جا رہا تھا۔ اس وقت شعرائے اردو قوم کی لے سے لے ملا کر پاکستان کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔

کیف بنارسی نے چھوٹی اور مترنم بحر میں ایسا ہی پرجوش اور ولولہ انگیز نغمہ

لکھا تھا ؎

منزل کو سر کرنا ہے — مشکل سے کیا ڈرنا ہے
آزادی کے شعلے کو — دل میں روشن کرنا ہے
پاکستان کی الفت میں — اپنا جینا مرنا ہے

لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان

اس دور کی شاعری کا یہ نمایاں وصف تھا کہ غیر منقسم ہندوستان کے کسی بھی خطے میں تحریک پاکستان کے سلسلے میں کوئی نظم لکھی جاتی' وہ آناً فاناً سارے ملک میں قبول عام کا درجہ حاصل کر لیتی۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی۔ مسلمان نہایت شوق و ولولے کے ساتھ اس نوع کی نظمیں پڑھتے اور ان کے رگ و پے میں لہو دوڑنے لگتا۔ جس طرح میاں بشیر احمد کا مصرع "ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح" اور شفیق عماد پوری کا "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" زبان زد خاص و عام ہوا' اسی طرح کیف بنارسی کا درج ذیل شعر ہر کوچہ و بازار میں گونج رہا تھا اور مجاہدین آزادی کے دلوں میں بے پناہ جوش و خروش پیدا کر رہا تھا ؎

ملت کے جانباز جوانو کا اب یہ قومی نعرہ ہے
دور ہٹو اے دنیا والو پاکستان ہمارا ہے

پاکستان حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں میں جذبۂ شوق کی فراوانی ہو' عزم بے پناہ دل میں موجزن ہو اور وہ قومی نظریہ پیش نظر ہو جس کے تحت جداگانہ ریاست کا تصور عملی سانچے میں ڈھل سکے۔ اردو کے بے شمار شاعروں نے ان خیالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے نظمیں لکھی تھیں۔ اور اس طرح انہوں نے تحریک پاکستان کے سلسلے میں وہی خدمات انجام دی تھیں جو سیاسی زعما لیگ کے پلیٹ فارم سے سرانجام دے رہے تھے۔

مولوی محمد امین ایک غیر معروف شاعر تھے' لیکن انہوں نے جس پرخلوص

جذبے کے تحت درج ذیل اشعار لکھے تھے، وہ یقیناً مسلمانوں کے لئے شمعِ راہ ثابت ہوئے ہوں گے ؎

دین و قرآں چاہیے آزاد مسلم کے لئے
تا بہ آزادی بنا لے ان کو وہ اپنا شعار
وار دھا اسکیم ایسی چال ہے اک پُر فریب
جس سے ہوگی نسلِ مسلم کفر کا آساں شکار
مسلم خوابیدہ اب تو جاگ اور کروٹ بدل
اندرونی اور بیرونی مخالف بے شمار
تیری تہذیب و تمدن، تیرا ایماں تیرا دیں
سب مٹانے کے لئے رکھتے ہیں عزم استوار
متحد ہو متفق ہو نیک ہو اور ایک ہو
اور ہو جاؤ منظم جیسے اک سنگیں حصار
کامل آزادی ہے نصب العین جبکہ لیگ کا
تو مسلماں کیوں نہ ہوں اس جنگ میں سب جاں نثار

احمد سوداگر نے بھی اپنے ایک ولولہ انگیز ترانے کے ذریعہ اسلامیانِ ہند کو آتش و آہن سے لڑنے، بتوں کو توڑنے اور پاکستان کو حاصل کرنے کا حوصلہ و عزم بخشا تھا۔ ملاحظہ ہوں یہ بند ؎

شب ظلمت میں گزاری ہے	اٹھو وقت بیداری ہے
جنگِ شجاعت جاری ہے	آتش و آہن سے لڑ جا

پاکستان کا مطلب کیا
لا اِلٰہ الا اللہ

چھوڑ تعلق داری چھوڑ	اٹھ محمود بتوں کو توڑ
جاگ اللہ سے رشتہ جوڑ	غیر اللہ کا نام مٹا

پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

تحریک پاکستان کے دوران پوری ملت اسلامیہ میں جو جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا، منزل کے حصول کے لئے جیسی تڑپ نمایاں ہو گئی تھی اور فتح و نصرت کا سودا جس طرح سروں میں سما گیا تھا، ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا قبل از وقت نہ تھا کہ کامیابی یقیناً قدم چومے گی، اسلام کی تاریخ از سر نو دہرائی جائے گی اور مسلم ریاست معرض وجود میں آجائے گی۔ ایسے امید افزا خیالات متعدد شاعروں کا موضوع بنے ہیں۔ مثلاً کاتب الہ آبادی نے یہ ترانہ لکھا تھا ؂

تخت بھی اپنا تاج بھی اپنا
ملک بھی اپنا راج بھی اپنا
ہوگا اک سرتاج بھی اپنا

اپنا پاکستان بنے گا

خوشحالی و شادی ہوگی
مذہب میں آزادی ہوگی
اسلامی آبادی ہوگی

اپنا پاکستان بنے گا

عمر انصاری نے بھی اپنی خیالات کو نہایت عزم کے ساتھ یوں دہرایا تھا ؂

درس لیں گے کربلا سے حوصلہ فاران سے
عزم خیبر سے تو استقلال ترکستان سے
اس طرح دہرائیں گے اسلام کی تاریخ کو
ہم کریں گے فتح کا آغاز پاکستان سے

اسلامیان ہند جس فتح و نصرت کا آغاز پاکستان سے کرنے والے تھے، اس کا تمام تر اعزاز سالارِ کارواں ہی کو حاصل تھا جس نے تحریک خلافت کے بعد قوم کے درہم و برہم شیرازے کو یکجا کیا، خاک میں ملے ہوئے جوہر ملت کو ابھارا، مایوسی و اضمحلال کے تیرہ و تار ماحول میں امید و آرزو کے کنول روشن کئے اور نئی منزل تک پہنچنے کے لئے تاب و توانائی عطا کی۔ ملت اسلامیہ اپنے عظیم

محسن کے ان احسانات کو فراموش نہیں کر سکتی تھی جن کے طفیل تاریک راہیں منور ہو گئی تھیں اور دم توڑتی ہوئی ہمت ازسرِ نو جوان ہو گئی تھی ـــ اختر کاکوی نے اپنی نظم "قائدِ اعظم"[1] میں مسلمانانِ ہند و پاک کے اپنی جذبات کی بھرپور ترجمانی کی تھی ـ

اے خدا ہم ترے بندے کے تدبر پہ نثار
جس نے لہرا دیا پھر ہند میں پرچم اپنا
جس نے منجدھار سے کشتی کو نکالا واللہ
ناخدا کیوں نہ اسے سمجھیں بھلا ہم اپنا
قوم کو جس نے پڑھایا سبقِ پاکستان
جان اپنی ہے یہی اور یہی دم اپنا
نکلا میدانِ وفا میں جو ہمارا غازی
کانگریسی دیو نہ دکھلا سکا دم خم اپنا
جس نے دکھلا دیا پھر وحدتِ ملی کا اثر
ہو نہیں سکتا کسی سے بھی علم خم اپنا

یہ قائدِ اعظم کے تدبر و فراست کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلم مجاہدین کانگریسی دیو کے دم خم کو توڑتے ہوئے، وحدتِ ملی کے نعرے بلند کرتے ہوئے اور سبز ہلالی پرچم آن بان سے فضا میں لہراتے ہوئے منزلِ مراد کی جانب رواں دواں تھے ـــ غلامی و استبداد کی تاریکی چھٹ رہی تھی ـ دورِ افق پر آزادی کا اجالا پھیل رہا تھا ـ نئی زندگی کی نئی آرزوئیں کروٹ بدل رہی تھیں ـ طویل جد و جہد کا

---

[1] تحریکِ پاکستان کے دور میں قائدِ اعظم پر بے شمار نظمیں لکھی گئی تھیں ـ اس مقالے میں ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے ـ ناظرین کو ایسی تمام منظومات یکجا طور پر "وہ رہبر ہمارا وہ قائد ہمارا" میں مل جائیں گی ـ

ماحصل سامنے کچھ اس طرح جلوہ کناں تھا کہ فضل احمد کریم فضلی پکار اٹھے ؎

شکر صد شکر غریبوں کا نصیبہ جاگا

دلِ تہذیب ہراساں نظر آتا ہے مجھے

پھر مسلماں تجھے مژدہ ہو جہاں باقی کا

پھر ترے ہاتھ میں قرآں نظر آتا ہے مجھے

ہو مبارک کہ زمانہ کی ہوائیں بدلیں

دوشِ فردا پہ گلستاں نظر آتا ہے مجھے

ناظرین! آیئے اگلے باب میں ہم دوشِ فردا پر نمایاں ہونے والے اس گلستاں کا منظر بھی دیکھ لیں جو آفتابِ حریت کی پرنور شعاعوں میں لعل و گوہر کی طرح جگمگا رہا ہے اور جس کے استقبال کی تیاریاں عارف عبدالمتین کچھ اس انداز میں کر رہے ہیں ؎

— سحر کی حسینہ چلی آ رہی ہے

گلو مسکراؤ — چٹکتی ہوئی کونپلو گنگناؤ

چھلکتے ہوئے آبشارو ذرا اپنے نغموں کی آتش کو تیکھے دکھاؤ

سکوں یافتہ جھیلو پھیلا دو اپنے کنول سطحِ شفاف پر ایک پل میں

اٹھو موجو ساحل کی تشنہ لبی اپنے بوسوں کی تازہ دہی سے بجھا دو

وہ دیکھو — وہ دیکھو سحر کی حسینہ چلی آ رہی ہے ![1]

---

[1] اس نظم کا عنوان مونٹ بیٹن پلان کے اعلان کے حوالے سے ۳ جون ۱۹۴۷ء تجویز کیا گیا تھا۔ منقول عارف عبدالمتین: دیدۂ و دل، ص ۱۱۲

چودہواں باب

صبحِ آزادی کے نغمے

سراج الدولہ کی سرکردگی میں مجاہدینِ آزادی کا جو قافلہ ۱۷۵۶ء میں روانہ ہوا تھا، وہ سعی و عمل کی مختلف منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کبھی اس کی رہبری حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے اولوالعزم سپہ سالار کرتے رہے، کبھی سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید جیسے علمائے دین اس کے رہنما بنے۔ کبھی عنانِ قیادت جنرل بخت خاں جیسے صاحبِ عزم و ہمت کے ہاتھوں میں رہی، کبھی مولانا احمد اللہ شاہ سالارِ کارواں بن کر اسے حریفوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتے رہے ——— حتیٰ کہ ہدایت و رہنمائی کا یہ عَلَمِ جنگِ آزادی کے میدان میں مختلف ہاتھوں سے گزرتا ہوا قائدِ اعظم محمد علی جناح کے دستِ مبارک تک آ پہنچا۔

اس کاروانِ جری کی محنتیں اور مشقتیں رائگاں نہیں گئیں۔ اس کے حوصلہ و استقلال کا ثمر بالآخر اسے مل ہی گیا۔ خدائے عزوجل نے اسے فتح و نصرت کی دولتِ بے بہا عطا کر دی۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ایک حسین و جمیل خطّے کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اب برِعظیم کے مظلوم و محکوم مسلمان ایک آزاد سرزمین میں عزت و افتخار اور سرفرازی و سربلندی کے ساتھ زندگی گزارنے کے حقدار بن گئے ——— وہ سرزمین جس کی مٹی، جس کی فضا، جس کی ہوا، جس کے سبزہ و گل، جس کی تمام سحر، جس کے مہر و قمر اور جس کے انجم و آفاق ان کی طمانیتِ قلب کا مرکز و مسکن بھی بنے اور ان کے وجود و استحکام کا موجب و ضامن بھی ٹھہرے۔

شعرائے اردو جنہوں نے افرادِ قوم کے دوش بدوش آزادی کی طویل جنگ لڑی تھی، اس پر مسرت موقع پر اپنی بیکراں خوشی اور شادمانی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان سبھوں نے صبحِ آزادی کے طرب خیز نغمے لکھے، نئی مملکت کے قیام کا قصیدہ کہا اور عظیم تر پاکستان کو اپنی فکر اور فن کا موضوع بنایا۔

اس نوع کی تمام نظموں میں جذبے کی صداقت، فکر کی گہرائی، مسرت و انبساط کی ترجمانی اور قلب و نظر کا سکون ہویدا ہے۔ زیرِ نظر مقالے کے اس آخری باب میں ہم ان طربیہ نظموں کا جائزہ لے رہے ہیں کہ یہ شاعروں کی ہی نہیں، پوری ملتِ اسلامیہ کی شادکامی و شادمانی کی ترجمان ہیں۔

پاکستان پر پہلی نظم رئیس امروہوی کی ہے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لکھی گئی تھی۔[1] رئیس مملکتِ خداداد کے وجود میں آنے کی خوشخبری اس طرح سنا رہے ہیں ؎

پاکستانی پرچم اپنا چرخ پہ جلوہ آرا ہے
ملّت کی عظمت کا نمونہ اس کا چاند ستارا ہے
سبز ہلالی اس کا پھریرا کیسا پیارا پیارا ہے
دنیا والے اٹھ کر دیکھیں کیا دلکش نظارا ہے
پاکستان ہمارا ہے[2]

تلواروں کی چھاؤں میں ہم نے پاکستان بنایا ہے
لاکھوں شہیدوں نے سر دے کر یہ پرچم لہرایا ہے
سالگرہ ہے آزادی کی۔ جشن کا موقع آیا ہے
اوجِ فلک پر آج درخشاں بخت کا اپنا تارا ہے
پاکستان ہمارا ہے

احمد ندیم قاسمی نے اس پر مسرت موقع پر ماضی اور حال دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ؎

کل تو ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا تھا
آج ہر منزلِ دشوار ہے پیغامِ رحیل
کل ہر اک کار تھا گستاخی و دہر آشوبی
آج ہر لغزشِ پا عظمتِ آدم کی دلیل
کل جہاں قتل کے فرمان لکھے جاتے تھے
آج وہ اوج ہے جمہور کی نظروں میں ذلیل
کل جو بھڑکائی تھی نمرود ملوکیت نے
آج وہ نارِ جہنم ہے گلستانِ خلیل
کل فرنگی کا رخِ سرخ تھا معیارِ جمال
آج زنگی بھی ہے اللہ کی تخلیقِ جمیل

---

[1] امروہوی، رئیس: قومی نظمیں، ص ۱۵

آج اس اوج پہ انساں ہے جہاں تک نہ اٹھے

بالِ جبریل کا کیا ذکر! — خیالِ جبریل

جعفر طاہر نے کینٹو کے فارم میں "داستانِ حریت" کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ہم آج جس آزادی پہ نازاں ہیں، وہ دراصل ان شہیدوں کا اعجاز ہے جنہوں نے حریت کی طویل راہوں میں جسم و جاں نثار کئے ؎

شہیدوں کا خون رنگ لا کر رہا ہے، شہیدوں کا خون رنگ لاتا رہے گا

ستاروں کو ہر صاحبِ ہوش تاریخ کا ایک بابِ درخشاں کہے گا

یہ آزادیاں جن پہ ہم آج نازاں ہیں اپنے شہیدوں کا اعجاز ہے یہ

دلوں میں ہیں بیداریاں جس سے پیدا انہی پاک روحوں کی آواز ہے یہ

شہیدانِ وطن کی مشترکہ جدوجہد، صبر و تحمل اور ایثار و عمل کا یہ خوشگوار نتیجہ پوری ملتِ اسلامیہ کے لئے فرحت و انبساط کا موجب ہوا۔ ان کے رگ و پے میں سرشاری و سرمستی کی لہریں موجزن ہو گئیں۔ ان کے دل کے نہاں خانے میں تمناؤں کے کنول جگمگا اٹھے۔ عوام کے انہی جذبات کو کوشؔ ضحمی نے ساقی نامے کے طرز پر لکھی ہوئی اپنی نظم "پندرہ اگست"[1] میں نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا ہے ؎

مرے دل ربا، دل نشیں ساقیا

مئے ارغوانی کی بوتل اٹھا

اٹھا اور فضا میں لنڈھا دے اسے

جدھر جی میں آئے بہا دے اسے

کہ عالم ہے خود آج جامِ شراب

مرا ہر نفس بن گیا ہے شباب

رگ و پے میں غلطاں ہیں شمس و قمر

تجلی فزا ہے مری ہر نظر

---

[1] پاکستان کا قیام ۱۴ر اگست کو عمل میں آیا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محمود الرحمن: انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی پاکستان دشمنی، مطبوعہ "جنگ" کراچی، ۸ر اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۱

مرا ہر قدم ہے چمن آفریں
گل و لالہ و نسترن آفریں
مرے نقشِ پا پر ثریا نثار
بلائیں مری لے رہی ہے بہار
وطن آج میرا ہے سرشار و مست
کہ ہے پندرہ اور ماہ اگست

حصولِ پاکستان سے صحیح معنوں میں مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نئی سرزمین پر نئی زندگی نئے جذبے نئے شوق اور نئے ولولے کے جلو میں اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ شمسؔ جعفری نے مذکورہ نظم میں تاریخ کے اس نئے ورق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے

ندی اور نالوں میں برپا ہے شور
نئی زندگی ہے نیا اس کا زور
زمیں بھی نئی آسماں بھی نیا
نئی منزلیں کارواں بھی نیا
نئی موج حرص نیا گلستاں
نئے ہم ہماری نئی داستاں

نئی زندگی کے دلکشا آغاز سے درحقیقت اقبال کے خواب کی تعبیر مل گئی۔ اب ساغر و مینا بھی نئے تھے' انداز بندگی بھی نئے' سجدے بھی نئے تھے' نماز بھی نئی۔ اس نئے پن کی کیفیت فنا حیدرآبادی کے کلام میں یوں جھلک رہی ہے

موجِ نشاط آئی کلی دل کی کھل گئی
تعبیر خوابِ حضرتِ اقبال مل گئی
حاصل ہے اہلِ بزم کو اب تازگی نئی
ساغر نیا' شراب نئی' سرخوشی نئی
سجدے نئے' نماز نئی' بندگی نئی
اور بندگی کے ساتھ ہی اک زندگی نئی

اسلامی اقدار و روایات پر قائم ہونے والی اس نئی مملکت کا تعارف یوسف ظفر اپنی نظم "پاکستان" میں اس طرح کراتے ہیں ؎

خدا کے نام پہ رکھی گئی بنا جس کی
ہوئی ہے رحمتِ ایزد سے ابتدا جس کی

یہ سرزمینِ مقدس، یہ ارضِ پاکیزہ
وفا ہے بستۂ دامانِ مصطفیٰ جس کی

یہ قوم جس کی حدِ آرزو رضائے خدا
محمدؐ عربی جانِ مدعا جس کی

یہ خاکِ پاک کہ ہے قلبِ سینۂ مشرق
یہ آفتاب کہ تاروں میں ہے ضیا جس کی

انہی عناصرِ دل کا ہے نام پاکستان
بہ فیضِ عشق ہے ملکِ دوام پاکستان

خدا کے نام پر جس ملک کی بنا رکھی گئی، وہاں اب سجدوں کے نشان جلوہ گر ہو رہے ہیں اور کتاب و سنت مرکزِ نگاہ بن رہی ہے۔ اسلامی نصب العین کی یہ کارفرمائی ماہر القادری کی نظم "صبحِ نو" میں اس طرح اجاگر ہو رہی ہے ؎

جاگ اٹھا ہے عزمِ ابراہیم
اب نہ ابھرے گی صنعتِ آذر

جلوہ گر ہیں نشان سجدوں کے
اہلِ اخلاص کی جبینوں پر

اپنے اللہ پر بھروسہ ہے
اب کسی کا نہ خوف ہے نہ خطر

کوئی عشوہ نہ دے سکے گا فریب
اب نظر ہے کتاب و سنت پر

ہر نفس میں ہے نغمۂ تکبیر
دل کی دھڑکن ہے یا اذانِ سحر

یہ آزاد وطن فطرت کے حسین و جمیل مناظر کا مرقع بن کر ابھرا ہے۔ اس کے لہلہاتے کھیت، اس کے چمن زار، اس کے دریا، اس کی جھیلیں ـــــ غرض ہر شئے رشک ارم بنی ہوئی ہے۔ ان ہی دلکش، سہانے نظاروں کی تفصیل لیاقت صہبائی کی نظم کا موضوع بنی ہے۔ آیئے اس کے دو ایک بند سے ہم بھی لطف اندوز ہوں ؎

یہ کھیتوں کے دلکش سہانے نظارے
چمن زار کشمیر کے حسن پارے
وہ الفت بھرے گیت دریا کنارے
ہر اک چیز میں زندگی کے اشارے

ارم کا نظارہ ہمارا وطن ہے

یہ جھیلیں یہ دریا، حسیں آبشاریں
یہ بہتے ہوئے پانیوں کی بہاریں
مناظر ہیں یا مہ وشوں کی قطاریں
شہنشاہوں کی بے بہا یادگاریں

زمیں کا ستارہ ہمارا وطن ہے

ستارے خجل اس کے حسن زمیں سے
حسیں تر یہ شاعر کے خواب حسیں سے
سحر پھوٹ پڑتی ہے اس کی جبیں سے
یہ خطہ نہیں کم بہشت بریں سے

بڑا ہی دلارا ہمارا وطن ہے

ایسے حسین و جمیل اور آزاد و خود مختار خطے کا حصول مژدۂ جاں فزا سے کم نہ تھا۔ ملت اسلامیہ یقیناً اس نعمتِ عظمیٰ کے لئے مبارک باد کی مستحق تھی۔ سالک نے اپنی نظم "بہار آزادی" کے اختتام پر یہ فرض پورا کر دیا ؏

مبارک اہل وطن کو قیامِ پاکستان

نئی رت، نئے دن، نئے ماحول، نئی زندگی اور نئی مملکت پر اظہارِ مسرت کا جو سلسلہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے شروع ہوا تھا، وہ ماہ و سال کے بیسیوں پردے سرکنے کے بعد آج بھی شعرائے اردو کے فکر و فن کا موضوع بنا ہوا ہے۔ آج بھی ہر فنکار اس مقدس امانت، دین و دنیا کی اس عظیم دولت اور آزادی و خود مختاری کے اس احساسِ طرب خیز پر اپنے جذبات کی ترجمانی اسی خلوص، اسی صداقت، اسی جذبے اور اسی سرشاری کے ساتھ کر رہا ہے۔ وطن کی عظمت کے گیت کل بھی فضاؤں میں گونج رہے تھے، آج بھی کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ اور جب تک دنیا قائم ہے، مملکتِ پاکستان کی آزادی و خود مختاری کے ترانے کام و دہن کو لذت و سرور عطا کرتے رہیں گے۔

ناظرین! آئیے ہم اپنے اس طویل سفر کو ابوالاثر حفیظ جالندھری کے لکھے ہوئے اُس "قومی ترانے" کو دہرا کر اختتام تک پہنچائیں جو طویل جد و جہد آزادی کا ترجمان، حال کی عظمت و سربلندی کا نشان اور حسین و جمیل مستقبل کی جان ہے۔

پاک سرزمین شاد باد — کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان — ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام — قوتِ اخوتِ عوام
قوم ملک سلطنت — پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد

پرچمِ ستارہ و ہلال — رہبرِ ترقی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال — جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

کتابیات

اردو اور انگریزی کتب

آزاد' محمد حسین : آبِ حیات' لاہور' ۱۹۵۴ء
ابن بطوطہ : سفرنامہ' جلد دوم' ترجمہ محمد حسین' کراچی' ۱۹۶۱ء
احمد' خواجہ جمیل : Hundred Great Muslims' کراچی' ۱۹۷۱ء
احمد' کلیم الدین : اردو شاعری پر ایک نظر' پٹنہ' اشاعت اول
احمد' میاں بشیر : قوس قزح' لاہور' ۱۹۷۲ء
اردو انسائیکلوپیڈیا' فیروز سنز' لاہور' ۱۹۶۸ء
اسپیئر' پرسیوال : India, Pakistan and the West' لندن' ۱۹۶۷ء
______ The Oxford History of Modern India' آکسفورڈ' ۱۹۶۵ء
______ Twilight of the Mughals' کیمبرج' ۱۹۵۱ء
اسٹیل : India through the Ages' لندن' تاریخ ندارد
اقبال' افضل : Life and Times of Mohammad Ali' لاہور' ۱۹۷۴ء
اقبال' محمد : بانگِ درا' لاہور' ۱۹۶۸ء
اکرام' ایس' ایم : Muslim Civilization in India' لندن' ۱۹۶۴ء
______ یادگارِ شبلی' لاہور' ۱۹۷۱ء
اکرم' جنرل اے آئی : Sword of Allah' کراچی' ۱۹۷۰ء
______ The Muslim Conquest of Persia' لاہور' طبع اول
امروہوی' رئیس : قومی نظمیں' قلمی نسخہ
انجمن ترقی اردو : غالب نام آورم' کراچی' ۱۹۶۹ء
انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا' شکاگو' ۱۹۶۸ء
ایڈورڈز' ایس' ایم : The Bombay City Police' بمبئی' ۱۹۲۳ء
ایڈورڈز' ایس ایم اور گیریٹ' ایچ' ایل' او : Mughal Rule in India' دہلی' ۱۹۵۶ء

ایڈورڈز، مائیکل: The Necessary Hell، لندن، ۱۹۵۸ء

بابر، ظہیر الدین محمد: تزک، ترجمہ بعنوان بابرنامہ از میرزا نصیر الدین حیدر، کراچی، ۱۹۶۲ء

باری: کمپنی کی حکومت، لاہور، ۱۹۶۹ء

بال، چارلس: The History of the Indian Mutiny، لندن، تاریخ ندارد

بان، ڈاکٹر گستاؤلی: تمدن ہند، مترجمہ سید علی بلگرامی، کراچی، ۱۹۶۲ء

بدایونی، سلیمان: بدایوں ۱۸۵۷ء میں، کراچی، ۱۹۶۱ء

برکت علی، چودھری اور ادیب، میرزا: بہترین ادب ۱۹۴۹ء، لاہور، تاریخ ندارد

______: بہترین ادب ۱۹۵۱ء، لاہور، ۱۹۵۲ء

برگیس، جیمس: The Chronology of Modern India، لاہور، ۱۹۷۵ء

برنی، ضیاء الدین احمد: عظمت رفتہ، کراچی، ۱۹۶۱ء

برنیر، فرینکوئس: Travels in the Mughal Empire، آکسفورڈ، ۱۹۳۴ء

بریلوی، سید الطاف علی: حیات حافظ رحمت خاں، کراچی، ۱۹۶۳ء

______: علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، کراچی، ۱۹۷۰ء

بریلوی، ڈاکٹر عبادت: تنقیدی زاویے، لاہور، ۱۹۵۱ء

______: روایت کی اہمیت، کراچی، ۱۹۵۲ء

بولیتھو، ہیکٹر: Jinnah: Creator of Pakistan، نیویارک، ۱۹۵۵ء

بیسینٹ، اینی: India: A Nation، لندن، پہلا ایڈیشن

بیگ، مرزا فرحت اللہ: نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، کراچی، ۱۹۶۰ء

پاکستان ہسٹری بورڈ: A Short History of Hind-Pakistan، کراچی، ۱۹۶۳ء

پنڈت، پرکاش: ساحر اور اس کی شاعری، دہلی، ۱۹۶۲ء

پیرزادہ، سید شریف الدین: Foundations of Pakistan

جلد اول، کراچی، ۱۹۶۹ء

جلد دوم، کراچی، ۱۹۷۰ء

______: پاکستان منزل بہ منزل، کراچی، ۱۹۶۶ء

توفیق، یعقوب: مقالات یوم اقبال، کراچی، ۱۹۶۸ء

تھڑانی، آر ای: The Historical State Trial of the Ali Brothers and Five Others، کراچی، ۱۹۲۱ء

ٹامپسن، ایڈورڈ اور گیریٹ، جی ٹی: Rise and Fulfilment of British Rule in India، لندن، ۱۹۳۴ء

ٹروٹر، ایل جے: India Under Victoria، لندن، تاریخ ندارد

ٹنکر، ہیوگ: South Asia, A Short History، لندن، ۱۹۶۶ء

جالبی، ڈاکٹر جمیل: تاریخ ادب اردو، جلد اول، لاہور، ۱۹۷۵ء

جذبی، معین احسن: حالی کا سیاسی شعور، لاہور، ۱۹۶۳ء

جعفری، رئیس احمد: تاریخ مسلم لیگ یا حیات قائد اعظم، بمبئی، اشاعت اول

ــــــــ: سیرت محمد علی، لاہور، ۱۹۵۰ء

ــــــــ: واجد علی شاہ اور ان کا عہد، دہلی، ۱۹۵۸ء

جعفری، سردار: ترقی پسند ادب، علیگڑھ، ۱۹۵۱ء

جناح، قائد اعظم محمد علی: Speeches: As Governor-General of Pakistan، کراچی، تاریخ ندارد

جوشی، پورن چند: Freedom Programme of Indian Communist، بمبئی، ۱۹۴۵ء

ــــــــ: کانگریس اور کمیونسٹ، بمبئی، ۱۹۴۶ء

چشتی، پروفیسر یوسف سلیم: شرح دیوانِ غالب، لاہور، ۱۹۵۹ء

حالی، الطاف حسین: حیات جاوید، لاہور، ۱۹۵۷ء

ــــــــ: مسدس حالی، لاہور، تاریخ ندارد

ــــــــ: مقدمۂ شعر و شاعری، لاہور، ۱۹۵۳ء

ــــــــ: یادگار غالب، لاہور، تاریخ ندارد

حسن، میر: تذکرہ شعرائے اردو، دہلی، ۱۹۴۰ء

حسین، ڈاکٹر سید اعجاز: مختصر تاریخ ادب اردو، کراچی، ۱۹۵۶ء

حسین، سید احتشام: تنقیدی جائزے، الہ آباد، ۱۹۵۱ء

ــــــــ: روایت اور بغاوت، حیدرآباد (دکن)، ۱۹۴۵ء

حسین، ممتاز: غالب ایک مطالعہ، کراچی، ۱۹۶۹ء

حقی، شان الحق: نشید حریت، کراچی، سنہ ۱۹۶۴ء

_____ نکتۂ راز، کراچی، ۱۹۷۳ء

خان، محمد اجمل: قومی ترانے اور نظمیں، لاہور، سنہ ۱۹۴۵ء

خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ: حالی کا ذہنی ارتقا، لاہور، سنہ ۱۹۶۶ء

خیرآبادی، فضل حق: الثورۃ الہندیہ، بجنور، سنہ ۱۹۴۶ء

دریابادی، عبدالماجد: محمد علی: ذاتی ڈائری، حصہ اول، اعظم گڑھ، سنہ ۱۹۵۴ء

_____ مقالات ماجد، لاہور، طبع دوم

ڈار، بشیر احمد: انوار اقبال، کراچی، سنہ ۱۹۶۷ء

ذکاءاللہ، مولوی: تاریخ عروج عہد انگلشیہ ہند، دہلی، سنہ ۱۹۰۴ء

_____ تاریخ ہندوستان، جلد ہشتم، دہلی، تاریخ ندارد

ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین: اردو شاعری کا تہذیبی و سیاسی پس منظر، لاہور، سنہ ۱۹۶۹ء

رابرٹس، پی ایف: *History of British India*، لندن، سنہ ۱۹۵۸ء

راشدی، وفا: پیام نو، کلکتہ، سنہ ۱۹۴۹ء

رام، مالک: ذکر غالب، دہلی، سنہ ۱۹۵۰ء

رچرڈ، آر: *India*، لندن، سنہ ۱۸۳۹ء

رضوی، خورشید مصطفیٰ: جنگ آزادی ۱۸۵۷، دہلی، سنہ ۱۹۵۹ء

ریاض، سید حسن: پاکستان ناگزیر تھا، کراچی، سنہ ۱۹۶۷ء

زبیری، محمد یامین: سیاست ملیہ، آگرہ، تاریخ ندارد

زمن، مختار: *Role of Students in Pakistan Movement*، کراچی، سنہ ۱۹۷۸ء

زیدی، ناصر اور محمود الرحمٰن: وہ رہبر ہمارا وہ قائد ہمارا، کراچی، سنہ ۱۹۶۷ء

سالٹ، لورا ای اور سنگر رابرٹ (جنرل ایڈیٹرز) *Oxford Junior Encyclopaedia*، جلد پنجم، لندن، سنہ ۱۹۵۳ء

سالک، عبدالمجید: ذکر اقبال، لاہور، سنہ ۱۹۵۵ء

سالک، مرزا قربان علی بیگ: تقریظ، مخان دہلی، دہلی، سنہ ۱۲۸۰ھ

ساورکر، وی ڈی: *The Indian War of Independence*، لندن، سنہ ۱۹۰۹ء

سرورؔ آل احمد : نئے اور پرانے چراغ، کراچی، ۱۹۵۱ء

سرورؔ آل احمد اور احمد عزیز: شعرائے عصر کے کلام کا انتخاب جدید، کراچی، ۱۹۵۰ء

سروری عبدالقادر : جدید اردو شاعری، لاہور، ۱۹۴۶ء

سعید خالد بن : Pakistan, the Formative Phases، آکسفورڈ، ۱۹۶۹ء

سکسینہ، رام بابو: تاریخ ادب اردو، مترجم مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، دوسری اشاعت

سلیمن، سر ڈبلیو ایچ : Rambles and Recollections، لندن، ۱۸۴۴ء

سیتارامیا، پٹابھائی : The History of the Indian National Congress، بمبئی، ۱۹۴۶ء

سٹین، مالکم سی سی: India Office، لندن، ۱۹۲۶ء

سید، ایم ایچ : Mohammad Ali Jinnah، لاہور، ۱۹۵۳ء

سیفی، محمد اسلم: حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی، دہلی، ۱۹۳۹ء

شفیق، لچھمی نرائن: چمنستان شعرا، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء

شہابی، مفتی انتظام اللہ: ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، دہلی، ۱۹۴۶ء

——— غدر کے چند علما، دہلی، تاریخ ندارد

——— مشاہیر جنگ آزادی، کراچی، ۱۳۷۶ھ

شیرانی، حافظ محمود خاں: پنجاب میں اردو، لاہور، طبع سوم

شیروانی، لطیف احمد : حرف اقبال، لاہور، ۱۹۵۵ء

صابری، امداد: ۱۸۵۷ کے مجاہد شعرا، دہلی، ۱۹۵۹ء

صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث: اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، کراچی، ۱۹۶۶ء

——— جرأت اور ان کا عہد، لاہور، ۱۹۵۳ء

——— لکھنؤ کا دبستان شاعری، لاہور، ۱۹۶۷ء

——— نظیر اکبرآبادی، ان کا عہد اور شاعری، کراچی، ۱۹۵۷ء

صدیقی، عتیق: ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، علیگڑھ، ۱۹۵۷ء

طباطبائی، غلام حسین: سیر المتاخرین، جلد دوم، لکھنؤ، ۱۸۹۲ء

طوسی، ایم ایس : The Muslim League and Pakistan Movement، کراچی، ۱۹۷۸ء

ظہیر سجاد : روشنائی' لاہور' تاریخ ندارد
عارف' عبدالمتین : دیدہ و دل' لاہور' ۱۹۵۷ء
عبدالحق' مولوی : انتخاب کلام میر' کراچی' ۱۹۵۰ء
—— چند ہم عصر' کراچی' ۱۹۵۹ء
عبدالحکیم' خلیفہ : فکر اقبال' حیدر آباد (دکن)' ۱۹۴۴ء
عبدالحئی' مولانا حکیم سید : گل رعنا' اعظم گڑھ' ۱۳۷۰ھ
عبدالرؤف' خواجہ : تذکرہ آب بقا' لکھنؤ' ۱۹۱۸ء
عبدالعزیز' شاہ : فتاوائے عزیزی' جلد اول' دہلی' ۱۳۲۲ھ
عبداللہ' ڈاکٹر سید محمد : بحث و نظر' لاہور' ۱۹۵۲ء
عبدالودود' قاضی : سفر آشوب' پٹنہ' ۱۹۶۱ء
عزیز الحق' کمال یار جنگ : Kamal Yar Jung Education Committee Report' دہلی' ۱۹۴۳ء
عزیز' اے : Discovery of Pakistan' لاہور' ۱۹۵۷ء
عطاء اللہ' شیخ : اقبال نامہ' حصہ دوم' لاہور' ۱۹۵۱ء
عظیم' وقار : نیا افسانہ' لاہور' ۱۹۵۷ء
عقیل' ڈاکٹر معین الدین : تحریک آزادی میں اردو کا حصہ' کراچی' ۱۹۷۶ء
علی' کے : A New History of Indo Pakistan' لاہور' ۱۹۷۵ء
علی' مولانا محمد : My Life _ A Fragment' لاہور' ۱۹۴۲ء
—— مقالات' حصہ اول' حیدر آباد (دکن)' ۱۹۴۳ء
غالب : اردوئے معلّیٰ' لاہور' ۱۹۲۲ء
—— عود ہندی' الٰہ آباد' طبع اوّل
فتحپوری' نیاز : انتقادیات' حصہ اول' لاہور' تاریخ ندارد
فرگوسن' جیمس : A History of the Indian and Eastern Architecture' نیویارک' ۱۸۹۹ء
فریزر' آر' ڈبلو : British India' لندن' ۱۹۰۸ء
فریزر' لوویٹ : India Under Curzon and After' لندن' ۱۹۱۱ء

فوسٹر، ولیم: The Embassy of Sir Thomas Roe to India، لندن، ۱۹۲۶ء

قادری، حامد حسن: داستان تاریخ اردو، آگرہ، ۱۹۴۱ء

قادری، حکیم سید شمس اللہ: اردوئے قدیم، لکھنؤ، ۱۹۳۰ء

قاسم، حکیم قدرت اللہ: مجموعہ نغز، لاہور، ۱۹۳۲ء

قریشی، اشتیاق حسین: برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ترجمہ ہلال احمد زبیری، کراچی، ۱۹۶۷ء

——— (جنرل ایڈیٹر) A Short History of Pakistan، چار جلدیں، کراچی، ۱۹۶۷ء

——— The Administration of the Mughal Empire، کراچی، ۱۹۶۶ء

——— The Struggle for Pakistan، کراچی، ۱۹۶۱ء

——— Ulema in Politics، کراچی، ۱۹۷۲ء

قریشی، عبدالرزاق: نوائے آزادی، بمبئی، ۱۹۵۷ء

کاشمیری، شورش: گفتنی ناگفتنی، لاہور، طبع اول

کرمانی، میر حسین علی خان: نشان حیدری، ترجمہ محمود فاروقی، لاہور، تاریخ ندارد

کوپ لینڈ، آر: The Indian Problem، نیویارک، ۱۹۴۴ء

کئی، سر جون ولیم اور میلی سن: History of the Sepoy War in India، لندن، ۱۸۹۹ء

گل، سردار مسیح: تنقیدی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء

لیز، ڈبلو این: Indian Musalmans، لندن، ۱۸۷۱ء

مارشمین، جون کلارک: Abridgement of the History of India، سیرام پور، ۱۸۷۳ء

مائلز، کرنل ڈبلو: History of Tipu Sultan، لاہور، ۱۹۷۴ء

مجاز، اسرار الحق: کلام مجاز، راولپنڈی، تاریخ ندارد

محمود الرحمن : آزادی کے مجاہد، حصہ اول، کراچی، ۱۹۷۳ء
______ : آزادی کے مجاہد، حصہ دوم، کراچی، ۱۹۷۵ء
______ : اردو میں بچوں کا ادب، کراچی، ۱۹۷۱ء
ملک، عبداللہ : بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، لاہور، ۱۹۶۷ء
مودودی، سید ابوالاعلیٰ : تعلیمات، لاہور، طبع اول
مورلینڈ، ڈبلو ایچ : India at the death of Akbar، لندن، ۱۹۲۰ء
موہانی، حسرت : کلیات حسرت، لاہور، ۱۹۵۹ء
مہر، غلام رسول : ۱۸۵۷ کے مجاہد، لاہور، تاریخ ندارد
______ : جماعت مجاہدین، لاہور، تاریخ ندارد
______ : (مرتب) خطوط غالب، لاہور، ۱۹۴۹ء
______ : سرگزشت مجاہدین، چوتھی جلد، لاہور، ۱۹۵۶ء
میر، میر تقی : کلیات میر مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، کراچی، ۱۹۵۸ء
______ : نکات الشعرا، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
میکالے، لارڈ : Critical and Historical Essays، لندن، ۱۸۹۲ء
میلی سن، کرنل جی بی : The Decisive Battles of India، لندن، ۱۸۹۷ء
مینی، آر جے : Clive of India، لندن، ۱۹۲۴ء
میور، سر ولیم : Indian Mutiny، جلد اول، لندن، طبع اول
نجم الغنی، حکیم : تاریخ اودھ، لکھنؤ، ۱۹۱۹ء
ندوی، سید سلیمان : ارمغان سلیمان، کراچی، تاریخ ندارد
______ حیات شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء
______ نقوش سلیمانی، کراچی، ۱۹۵۱ء
______ یاد رفتگاں، کراچی، ۱۹۵۵ء
ندوی، مولانا ابوالحسن علی : سیرت سید احمد شہید، لکھنؤ، ۱۹۴۱ء
ندوی، مولانا عبدالسلام : مقالات عبدالسلام، اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء
نساخ، عبدالغفور : سخن شعرا، لکھنؤ، ۱۸۷۲ء

نظامی، خلیق احمد: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، علیگڑھ ۱۹۵۰ء

نظامی، خواجہ حسن: غدر کی صبح و شام، دہلی، تاریخ ندارد

نعمانی، شبلی: کلیات شبلی (اردو)، اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

ـــــ : مکاتیب شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۱۷ء

نقوی، مولوی سید محمد مبین: (مرتب) تاریخ ریختی مع دیوان جان، لکھنؤ، تاریخ ندارد

نوشہروی، ابو یحییٰ امام خان: تراجم علمائے حدیث ہند، دہلی، ۱۹۳۸ء

نہرو، جواہر لال: An Autobiography، لندن، ۱۹۵۲ء

نیر، پروفیسر علی حیدر: فضل حق آزاد بہ حیثیت نظم نگار، پٹنہ، ۱۹۶۴ء

واٹسن، فرانسس: A Concise History of India، لندن، ۱۹۷۴ء

والبینک، ٹی، والٹر: A Short History of India and Pakistan، نیویارک، ۱۹۳۶ء

ولی اللہ، شاہ: التفہیمات الالٰہیہ، جلد اول، ڈابھیل، ۱۹۳۶ء

ووڈرف، فلپس: The Man Who Ruled India، لندن، ۱۹۵۳ء

ویٹ، اے جی: History of English Literature، آکسفورڈ، ۱۹۱۸ء

ویج، ڈبلیو این: History of the World (ناقص الطرفین مملوکہ راقم)

ہاشمی، انوار: تاریخ پاک و ہند، کراچی، طبع چہارم ۱۹۷۴ء

ہٹی، فلپ، کے: History of the Arabs، لندن، ۱۹۵۱ء

ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو: The Indian Musalmans، کلکتہ، ۱۹۴۵ء

ہومز، ٹی آر ای: History of the Indian Mutiny، لندن، طبع اول

اخبارات و جرائد

اخبار جہاں، کراچی

ادب لطیف، لاہور

اردو، کراچی (عام شمارے)
——— (غالب نمبر)
افکار، کراچی (جوبلی نمبر)
——— (فیض نمبر)
برگ گل، کراچی
بصائر، کراچی (ٹیپو سلطان نمبر)
جام نو، کراچی (احسان دانش نمبر)
جنرل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی
جنگ، کراچی
ساقی، دہلی
سویرا، لاہور
صادق الاخبار، دہلی
صریر خامہ، سندھ یونیورسٹی حیدر آباد (قومی شاعری نمبر)
صنم، پٹنہ (بہار نمبر)
علم و آگہی، کراچی (قائد اعظم نمبر)
قومی زبان، کراچی
معارف، اعظم گڑھ
نقوش، لاہور (عام شمارے)
——— (غزل نمبر)
——— (شخصیات نمبر ۲)
——— (طنز و مزاح نمبر)
——— (مکاتیب نمبر)
——— (ادب عالیہ نمبر)

نگار، لکھنؤ (اصناف سخن نمبر)

★

تعلیم نخوہ